

خواتین اور دوشیزاؤں کیلیے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
دسمبر 2020
PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM



آپ سے کیا پردہ



خاتون کی ڈائری



مجھ سے ملیے



انٹرویو



ناول



مکمل ناول



ناولٹ



افسانے



رنگا رنگ پھول

میری بیاض سے

پکوان

نظمیں غزلیں

نفسیات

بیوٹی بکس

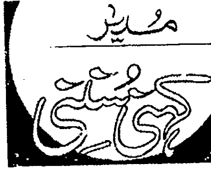
خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872 0317 2266944

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مُدیر



دسمبر کا خواتین ڈائجسٹ لیے حاضر ہیں۔

دسمبر رواں سال کا آخری مہینہ ہے۔ لگتا ہے ابھی سال شروع ہوا تھا اور اختتام بھی آپہنچا۔ تیزی سے گزرتے ان ماہ و سال کا ایک ہی پیغام ہے کہ کائنات میں کسی بھی شے کو ثبات نہیں۔ جو کل تھا آج نہیں ہے اور جو آج ہے، وہ کل نہیں ہوگا۔

وقت آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ ہر گزرتا وقت تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے۔ تاریخ جس سے کوئی سبق نہیں لیتا اور تاریخ جو کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ چاہے سچ پر کتنے پردے ڈالے جائیں۔ سوچ پر پہرے لگا دیے جائیں۔ زبانوں پر تالے ڈال دیے جائیں۔ سچ کبھی چھپ نہیں پاتا۔ وہ تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے۔ اور کبھی نہ کبھی سامنے آکر رہتا ہے۔

پچھلے کچھ عرصے میں بہت کچھ بدلا ہے۔ بلکہ سب ہی کچھ بدل گیا ہے۔ ابھی دھند اتنی شدید اور ہوائیں اتنی تیز ہیں کہ کچھ بھی واضح نہیں ہو پا رہا ہے۔ وقت کے ساتھ سارے منظر واضح ہوں گے اور تب ہم فیصلہ کر سکیں گے۔ ہم کہاں کھڑے ہیں۔

راحت جبیں کا نیا ناول۔ زندگی ہم تجھے گزاریں گے،

اس ماہ سے راحت جبیں کا نیا ناول شروع کیا جا رہا ہے۔ راحت جبیں قارئین کی پسندیدہ مصنفہ ہیں۔ ان کا پچھلا ناول قارئین نے بے حد پسند کیا۔ اب نیا ناول آپ کے سامنے ہے۔ راحت کا کہنا ہے کہ یہ ناول ان کی تمام تحریروں سے ہٹ کر ہے۔ اسے پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور نوازیں۔ ہم آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے۔

سال نو نمبر۔ سروے،

جنوری کا شمارہ سال نو نمبر ہوگا۔ اس میں قارئین کی شمولیت کے لیے نئے سال کے حوالے سے سروے بھی شامل ہوگا۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1۔ کہتے ہیں 2020ء مشکل ترین سال تھا۔ آپ کا یہ سال کیسا گزرا؟

2۔ لاک ڈاؤن میں وقت کیسا گزرا۔ اس دوران کوئی مثبت یا اچھا کام کیا؟

3۔ نیا سال شروع ہو رہا ہے۔ نئے سال میں آپ کیا کرنا چاہتی ہیں؟ آپ کے ذہن میں کوئی پلان ہیں تو لکھیے۔

ان سوالات کے جوابات اس طرح لکھیں کہ ہمیں 20 دسمبر تک موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

- نعیمہ ناز کا مکمل ناول ۔ آدم و حوا کا ساتھ،
- فائزہ ثمرین کا مکمل ناول ۔ رقص شرر،
- حنا بشریٰ اور مونا شاہ قریشی کے ناولٹ،
- عنبرین ابدال، زینب نور، عندلیب زہرا اور قرۃ العین خرم ہاشمی کے افسانے،
- نمرہ احمد، راحت جبیں اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- آپ کی پسندیدہ مصنفہ فائزہ جبیں سے ملاقات،
- معروف اداکار حامد نوید سے باتیں،
- کرن کرن روشنی ۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- آپ کا باورچی خانہ، ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔
قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

تین گرہیں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''شیطان تم میں سے ہر ایک کی گدی پر، جب وہ سوتا ہے، تین گرہیں لگا دیتا ہے۔ ہر گرہ پر وہ منتر پڑھتا (افسوں پھونکتا) ہے: تیرے لیے رات بہت لمبی ہے، پس خوب سو۔ اگر وہ بیدار ہو کر اللہ کا ذکر کرتا ہے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے۔ پھر اگر وہ وضو بھی کرے تو ایک گرہ اور کھل جاتی ہے۔ پھر اگر اس نے نماز بھی پڑھی تو تمام گرہیں کھل جاتی ہیں اور وہ صبح اس حال میں کرتا ہے کہ وہ ہشاش بشاش اور پاکیزہ نفس ہوتا ہے ورنہ اس کی صبح اس حال میں ہوتی ہے کہ وہ خبیث النفس اور سست ہوتا ہے۔'' (بخاری و مسلم)
فوائد و مسائل:
1۔ یہ گرہ لگانا بھی حقیقتاً ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے جادوگر اپنا عمل سحر کرتا ہے۔ شیطان اپنے اس عمل سے رات کو اللہ کی عبادت کے لیے اٹھنے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔
2۔ بہر حال شیطان انسان کو اللہ کی عبادت سے روکنے کے لیے اپنا جتن کرتا ہے، جو شخص رات کو اٹھ کر اللہ کی عبادت کرتا ہے تو وہ شیطان کی چال کو ناکام دیتا ہے، بصورت دیگر شیطان انسان کو اپنے دام میں پھنسا لیتا ہے۔

سلامتی کے ساتھ

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''اے لوگو! سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ اور رات کو نماز پڑھو جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں، (اس طرح) تم جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔'' (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)
فوائد و مسائل:
1۔ اس میں ان لوگوں کے لیے بشارت ہے جو ذوق و شوق سے مذکورہ کام کرتے ہیں۔

2۔ جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہونے کا مطلب ہے کہ جہنم کی سزا بھگتے بغیر ہی ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے جنت میں داخل فرما دے گا۔ واللہ اعلم۔

فضیلت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمایا۔

''رمضان کے بعد سب سے زیادہ فضیلت والے روزے، اللہ کے مہینے محرم کے روزے ہیں۔ اور فرض نماز کے بعد سب سے زیادہ فضیلت والی نماز، رات کی نماز ہے۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ محرم کے مہینے کی اضافت اللہ کی طرف کی گئی ہے جس سے اس ماہ محرم کا شرف و امتیاز واضح ہے۔ اس میں نفلی روزوں میں سب سے افضل روزوں اور نفلی نمازوں میں سب سے افضل نماز کا بیان ہے۔

رات کی نماز

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''رات کی نماز دو دو رکعت ہے، چنانچہ جب تجھے صبح صادق کا اندیشہ ہو تو ایک رکعت کے ساتھ وتر (طاق) بنا لے (ایک رکعت وتر پڑھ لے۔'' (بخاری و مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کو دو دو رکعت ادا فرماتے اور ایک رکعت وتر پڑھتے۔ (بخاری و مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مہینے میں تو اس طرح روزہ رکھنا چھوڑ دیتے کہ ہم گمان کرتے کہ اس مہینے میں آپ روزہ رکھیں گے ہی نہیں، اور کبھی ایسے روزہ رکھتے کہ ہم گمان کرتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس مہینے میں کوئی روزہ چھوڑیں گے ہی نہیں۔ اور (اسی طرح آپ کا حال یہ تھا کہ) اگر تم چاہتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کے وقت نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں تو تم (پڑھتے ہوئے) دیکھ لیتے۔ اور اگر تم چاہتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سویا ہوا دیکھیں تو (سویا ہوا) دیکھ لیتے۔'' (بخاری)

فائدہ:

1۔ مطلب یہ ہے کہ نفلی روزے ہوں یا رات کی نفلی نماز (قیام اللیل) ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایک مستقل معمول نہیں تھا۔ کسی مہینے ایسا ہوتا کہ آپ روزہ نہ رکھتے حتیٰ کہ مہینہ ختم ہونے کے قریب ہو جاتا، تو آخر میں آپ روزے رکھنا شروع کر دیتے۔ اور کبھی مسلسل روزہ رکھتے، حتیٰ کہ گمان ہوتا کہ پورا مہینہ ہی آپ روزے رکھیں گے مگر آپ روزہ ترک فرما دیتے۔

2۔ اسی طرح تہجد کی نماز میں آپ کا معمول تھا، کبھی آپ اسے رات کے پہلے حصے میں، کبھی دوسرے حصے میں اور کبھی آخری، تیسرے حصے میں پڑھتے۔ اس طرح آپ کو رات کے ہر حصے میں نماز پڑھتے ہوئے بھی اور سوتے ہوئے بھی پایا گیا۔

گیارہ رکعات

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گیارہ رکعت پڑھا کرتے تھے۔ اس سے حضرت عائشہ کی مراد رات کی نماز ہے۔ اپنا سر اٹھانے سے پہلے اتنا (لمبا) سجدہ کرتے کہ جتنی دیر میں تم میں سے ایک آدمی پچاس آیتیں پڑھ لے۔ اور فجر کی نماز سے پہلے دو رکعت پڑھتے، پھر اپنی دائیں کروٹ لیٹ جاتے، یہاں تک کہ آپ کے پاس نماز کی منادی کرنے والا آتا۔ (بخاری)

فائدہ:

1۔ اس میں فجر کی دو سنتیں پڑھنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں کروٹ پر لیٹنے کے علاوہ نماز تہجد میں لمبے سجدے کرنے کا بیان ہے کیونکہ اس حالت میں انسان اللہ کے بہت قریب ہوتا ہے۔ نیز اس حالت میں غایت خشوع کا بھی اظہار ہے جو اللہ کو بہت پسند ہے۔ علاوہ ازیں سجدے میں دعا کی

قبولیت کا امکان بھی زیادہ ہے۔

تہجد

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں (تہجد) گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔ (پہلے) چار رکعت پڑھتے، پس نہ پوچھو کہ وہ کتنی حسین اور کتنی لمبی ہوتی تھیں۔ پھر چار رکعت پڑھتے۔ پس ان کے حسن اور لمبائی کے بارے میں مت پوچھو۔ پھر تین رکعت (وتر) پڑھتے۔
میں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! کیا وتر پڑھنے سے پہلے آپ سوتے ہیں؟''
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے عائشہ! تحقیق میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن میرا دل نہیں سوتا۔'' (بخاری و مسلم)
فوائد و مسائل:
1۔ دل نہیں سوتا کا مطلب ہے کہ دل بیدار رہتا تھا، اس لیے آپ کا وضو بھی نہیں ٹوٹتا تھا۔ اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہے۔
2۔ اس حدیث میں نماز کو اس کے آداب و شرائط کے مطابق خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرنے کی تاکید ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ یہی ہے۔ سنت کے مطابق اطمینان و سکون کے ساتھ نماز پڑھنا ہی نماز کا حسن ہے۔
3۔ جس شخص کو اپنی بابت آخر شب میں اٹھنے کا یقین ہو تو اسے چاہیے کہ نماز وتر عشاء کے ساتھ نہ پڑھے بلکہ تہجد کے آخر میں پڑھے۔ بصورت دیگر عشاء کی نماز کے ساتھ ہی پڑھ لے۔
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کے پہلے حصے میں سو جاتے تھے اور رات کے آخری حصے میں اٹھتے اور نماز پڑھتے۔ (بخاری و مسلم)
فائدہ: اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثریتی معمول کا بیان ہے اور یہی آخر شب تہجد کا سب سے بہتر وقت ہے۔ تاہم آپ نے رات کے ابتدائی اور درمیانی حصے میں بھی قیام کیا ہے۔
حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں۔
''میں نے ایک رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم برابر کھڑے رہے یہاں تک کہ میں نے ایک برے کام کا ارادہ کیا۔''
ان سے پوچھا گیا:
''آپ نے کس چیز کا ارادہ کیا تھا؟''
انہوں نے جواب دیا: ''میں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ میں بیٹھ جاؤں اور آپ کو چھوڑ دوں۔'' (بخاری و مسلم)
فوائد و مسائل:
1۔ اس سے معلوم ہوا کہ رات کا قیام خوب لمبا ہو، یعنی قرأت، رکوع، قومہ، سجدہ ہر رکن طویل اور نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ ہو۔
2۔ نفلی نماز باجماعت جائز ہے۔
3۔ زیادہ طوالت کی صورت میں بعض علماء کے نزدیک مقتدی کا امام کی اقتدا سے الگ ہونا جائز ہے۔ لیکن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے برے کام سے تعبیر کیا ہے، اس لیے اس کا جواز محل نظر ہے، تاہم احادیث میں آئمہ حضرات مقتدیوں کا خیال رکھنے کی تاکید کی گئی ہے جن سے اس کا جواز نکل سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

طویل قیام

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔
''میں نے ایک رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ بقرہ پڑھنی شروع کردی۔ میں نے (دل میں) کہا:
سو آیتوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع فرمائیں گے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت جاری رکھی۔ میں نے خیال کیا کہ آپ یہ سورت پوری رکعت، یعنی نماز کی دو رکعتوں میں ختم فرمائیں گے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت جاری رکھی۔ پھر میں نے خیال کیا کہ آپ اس کے ساتھ

(سورۃ ختم کرکے) رکوع کریں گے۔ لیکن آپ نے سورۃ نساء پڑھنی شروع کردی اور وہ ساری پڑھ لی۔
پھر آپ نے سورۃ آل عمران کی تلاوت شروع فرمادی اور وہ بھی ساری پڑھ گئے۔ آپ ٹھہر ٹھہر کر تلاوت فرماتے۔ جب آپ ایسی آیت کے پاس سے گزرتے جس میں تسبیح کا ذکر ہوتا تو آپ (اللہ کی) تسبیح کرتے۔ اور جب کسی سوال والی آیت کے پاس سے گزرتے تو اللہ سے سوال کرتے۔ اور جب کسی پناہ مانگنے والی آیت سے گزرتے تو پناہ طلب کرتے۔
پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کیا اور پڑھتے رہے۔ سبحان ربی العظیم۔ آپ کا رکوع بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کے برابر تھا۔ پھر آپ نے (رکوع سے سر اٹھایا اور) فرمایا: سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیر تک کھڑے رہے، تقریباً اتنا جتنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع فرمایا تھا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور (اس میں) فرمایا: سبحان ربی الاعلیٰ۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سجدہ بھی آپ کے قیام کے برابر تھا۔ (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس سے لمبے قیام کی خوبی، نفل نماز میں جماعت کا تلاوت میں سورتوں کی تقدیم و تاخیر کا جواز ثابت ہوتا ہے جس کے بعض لوگ قائل نہیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا:
"کون سی نماز افضل ہے؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لمبے قیام والی نماز۔" (مسلم)

فائدہ:

1۔ معلوم ہوا کہ نماز کے تمام ارکان (رکوع، سجدہ وغیرہ) لمبا ہوگا، قرآن اتنا ہی زیادہ پڑھا جائے گا، اور قرآن چونکہ افضل ذکر ہے، اس لیے طویل قیام بھی افضل ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ کو سب سے زیادہ محبوب نماز حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز ہے۔ اور اللہ کو سب سے زیادہ محبوب روزہ حضرت داؤد کا روزہ ہے۔ وہ آدھی رات سوتے تھے، اس کے تیسرے حصے میں عبادت کے لیے اٹھ جاتے اور اس کے چھٹے حصے میں (پھر) سو جاتے۔ اور ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن چھوڑ دیتے (روزہ نہ رکھتے۔)"

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس میں چونکہ اپنے آپ پر سختی کرنے سے روکا گیا ہے، حتیٰ کہ عبادت میں بھی افراط و تعمق سے منع کیا گیا ہے اس لیے ساری ساری رات جاگ کر عبادت کرنا یا ہمیشہ روزہ رکھنا بھی اسلام میں ممنوع اور ناپسندیدہ ہے۔

2۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ بھی اعتدال کا بہترین نمونہ ہے۔ بنا بریں اس حدیث میں حضرت داؤد علیہ السلام کے روزے اور نماز کو عنداللہ سب سے زیادہ محبوب قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس میں بھی وہ میانہ روی ہے جس کے اپنانے کی اسلام نے تاکید کی ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔
"رات میں ایک گھڑی (لمحہ) ہے۔ جس مسلمان آدمی کو وہ میسر آجائے۔ وہ اس میں دنیا اور آخرت کے معاملے میں کسی بھلائی کا سوال کرے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور عطا فرمادیتا ہے۔ اور یہ گھڑی ہر رات کو ہوتی ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ یہ گھڑی بھی جمعے کی گھڑی کی طرح اگرچہ غیر متعین ہے۔ تاہم یہ بھی بالعموم رات کی آخری گھڑیوں میں ہوتی ہے کیونکہ عبادت کا افضل وقت وہی ہے۔ اس کے ابہام میں بھی لیلۃ القدر کی طرح حکمت یہی ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ وقت اللہ کی عبادت، اس کے ذکر اور اس سے دعا مناجات میں گزارے۔

قضا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درد یا کسی اور وجہ سے رات کی نماز چھوٹ جاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دن کو بارہ رکعتیں ادا فرماتے۔ (مسلم)

فوائد و مسائل: اس سے مراد نفل نماز ہے نہ کہ فرض۔ اس سے معلوم ہوا کہ سنتوں کی قضا درست ہے بشرطیکہ انسان اپنا معمول نہ بنائے۔

قضا

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص اپنے مقررہ وظیفے یا اسی قسم کی کسی چیز سے سویا رہ جائے، پس وہ اسے فجر اور ظہر کی نماز کے درمیان پڑھ لے تو اس کے لیے لکھا جاتا ہے گویا کہ اس نے وہ رات ہی کو پڑھا ہے۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ یہاں اس سے وہ وظیفہ مراد ہے جو انسان اپنے طور پر مقرر کر لیتا ہے، مثلاً: میں رات کو تہجد کی آٹھ رکعت پڑھا کروں گا، ہر روز ایک پارہ قرآن مجید کا پڑھوں گا یا اتنی اتنی بار اللہ کا فلاں ذکر کروں گا۔ وعلی ہذا القیاس۔

2۔ پھر وہ اپنے عزم کے مطابق امکانی حد تک عمل کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن اگر کسی وقت اس پر نیند کا غلبہ ہو جائے اور وہ اپنا وظیفہ پورا نہ کر سکے تو بعد میں وظیفہ پورا کر لے۔ اللہ کے ہاں اسے اس طرح لکھا جائے گا کہ گویا اس نے اپنے وقت ہی پر اسے پورا کیا۔

3۔ اس سے نفلی اعمال خیر کی قضا کا استحباب معلوم ہوتا ہے۔

عبادت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو رات کو اٹھ کر اللہ کی عبادت کرے اور نماز پڑھے اور اپنی بیوی کو بھی بیدار کرے۔ اگر وہ انکار کرے تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اللہ تعالیٰ اس عورت پر رحم فرمائے جو رات کو اٹھ کر عبادت کرے اور نماز پڑھے اور اپنے خاوند کو بھی جگائے۔ اگر وہ انکار کرے تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔'' (اسے ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فائدہ: اس میں نیک میاں بیوی کا کردار بیان کیا گیا ہے۔ وہ نیکی اور اطاعت کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

گھر والے

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب آدمی رات کو اپنے گھر والوں کو بیدار کرے اور دونوں نماز پڑھیں، یا (راوی کو شک ہے) بیک وقت دو رکعتیں پڑھیں تو ان دونوں کو ذاکرین اور ذاکرات (بہت زیادہ ذکر کرنے والوں) میں لکھ دیا جاتا ہے۔'' (اسے ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: جمیعاً سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ دونوں میاں بیوی جماعت سے نفلی نماز پڑھیں۔ لیکن جمیعا کا مطلب یہ نہیں ہے، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ دونوں نے بیک وقت نفلی نماز پڑھیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جماعت کے ساتھ ہی پڑھیں۔

'' والذاکرین اللہ کثیر اولذاکرات۔ (الاحزاب 35-35) سورہ احزاب کی آیت ہے جس میں نیک مردوں اور نیک عورتوں کی صفات کا اور ان کی فضیلت اور اجر و ثواب کا ذکر ہے۔

اونگھ آنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تم سے کسی شخص کو نماز میں اونگھ آئے تو اسے چاہیے کہ وہ سو جائے، یہاں تک کہ اس سے اس کی نیند چلی جائے۔ کیونکہ جب تم میں سے کوئی اونگھتا ہوا نماز پڑھتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ استغفار کرنے کے بجائے وہ اپنے آپ کو گالی دینے لگے۔'' (بخاری و مسلم)

تین چربہ کہانیاں

ننھے منے بڈھوں کے لیے

انشا جی

اچھا تو میرے پیارے بزرگو! راج دلارے بزرگو! اب حقے کا ایک کش لو اور سو جاؤ۔ تم کام کر کے تھک گئے ہو گے۔ ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ کل کا کام آج پر نہ ڈالو، یعنی جو کام کل ہو سکتا ہے، اسے آج مت کرو، آرام بھی بڑی ضروری چیز ہے۔ بلکہ زریں اصول تو یہ ہے کہ "پہلے آرام، پھر بھی آرام"۔

"کہانی سنیں گے۔"

"ارے بڑھو! نٹ کھٹ بڈھو! ہم کہانیاں کہاں سے لائیں۔ نئی کہانیاں تو آج کل فلم والوں کو بھی نہیں ملتیں۔ بے چارے کابل جاتے ہیں اور وہاں سے ہینگ، سلاجیت، ٹرانزسٹر، ریڈیو اور چربہ کہانیاں لاتے ہیں۔ اچھا تم بھی کچھ نصیحت آمیز کہانیاں ہم سے سنو۔ لیکن شور مت کرنا، چین سے سننا۔"

1۔ ایک گرو کے دو چیلے

ایک تھا گرو، بڑا نیک، دھرماتما، دو اس کے چیلے تھے۔ وفادار، جاں نثار، گرو کے خون کی جگہ اپنا پسینہ بہانے کے لیے تیار۔ ایک کا شبھ نام پور بول تھا۔ دوسرے کا پچھمی چند۔ گورو جی جب لوگوں کو اُدیش دیتے اور ان کی مرادیں پوری کرنے کے بعد آرام کرنے کو لیٹتے تو چیلا پور بول ان کی داہنی ٹانگ دباتا اور پچھمی چند بائیں ٹانگ کی ٹہل سیوا کرتا۔ دونوں اپنے اپنے حصے کی ٹانگ کی مٹھی چاپی کرتے۔ تیل چپڑ کر اسے چمکاتے۔ جھنڈیا اور گھنگرو باندھ کر اسے سجاتے۔ اس پر مکھی بھی نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ ایک روز کرنا پرماتما کا ایسا ہوا کہ گرو جی ایک کروٹ لیٹ گئے اور ان کی داہنی ٹانگ بائیں ٹانگ کے اوپر جا پڑی۔ چیلے پور بول کو بہت غصہ آیا۔ اس نے فوراً ایک ڈنڈا اٹھایا اور بائیں ٹانگ کے رسید کیا۔ گرو جی نے بلبلا کر داہنی ٹانگ اوپر کر لی۔ اب پچھمی چند کی غیرت نے جوش مارا۔ اس نے اپنی لٹھیا اٹھائی اور بائیں ٹانگ کی خوب ہی مرمت کی۔ گرو جی بہت چلائے۔

"ظالموں...... کیوں مارے ڈالتے ہو، ہائے۔"

لیکن چیلے علاقائی خود مختاری کے قائل تھے کب مانتے تھے۔ دونوں نے اخباری بیان جاری کیے اور زیادتی میں پہل کرنے کا الزام ایک دوسرے کو دیا۔ گرو جی کی ٹانگیں سوج کر کپا ہو گئیں۔ مدتوں ہلدی چونا لگانا پڑا۔

"بس......؟"

"نہیں...... بس کیوں...... کہانی آگے بھی چلتی ہے۔ لالہ پچھمی چند کے کئی بیٹے تھے۔ بڑے ہونہار اور ہوشیار، پشاوری مل، لاہور رام، سندھو پرکاش وغیرہ، جب لالہ پچھمی چند کا دیہانت ہوا تو یہ ٹانگ انہوں نے ورثے میں پائی۔ وہ گرو جی کی ٹانگ تو دباتے تھے، لیکن کوئی ران کا حصہ زیادہ دباتا تھا۔ کوئی پنڈلی، پر زیادہ محنت کرتا تھا۔ کوئی گھٹنے پر زیادہ توجہ دیتا تھا۔ آخر ایک زبردست جھگڑا ہوا اور طے ہوا کہ ہم اپنا اپنا حصہ الگ کر لیں گے۔ لالہ پور بول نے کہا۔ ہاں ہاں ٹھیک کر رہے ہو۔ میں بھی اپنے حصے کی ٹانگ کاٹ کرلے جا رہا ہوں۔ اب ان برخورداروں نے گنڈاسہ منگایا۔ ایک نے ران سنبھالی بوری میں ڈالی۔ دوسرے نے پنڈلی لے لی۔ تیسرے نے گھٹنا اٹھایا اور گھر کی راہ لی۔ اس کے بعد سے سب ہی ہنسی خوشی زندگی سر کرنے لگے۔

"گرو جی کا کیا ہوا؟"

"معلوم نہیں کیا ہوا۔ کہانی میں اس کا ذکر نہیں۔ حد سے حد مر گئے ہوں گے۔ اچھا اب ایک اور کہانی سنو۔"

2۔ مچھیرا اور انعام

"اچھا تو سنو! ایک مچھیرے کے ہاتھ ایک عمدہ سی مچھلی آئی تو وہ انعام و اکرام کی خواہش میں اسے لیے بادشاہ کے محل پر پہنچا اور اندر جانے کی کوشش کی۔

دربان نے روکا۔ "ہے کہاں جاتا ہے۔ پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے۔" مچھیرے نے مدعا بیان کیا۔ دربان نے کہا۔ "دیکھ بابا! جو انعام ملے اس میں سے چھپن فیصدی میں لوں گا۔"

مچھیرا آدھے پر راضی ہوگیا۔ لیکن دربان اپنے چھپن فیصدی پر اڑا رہا۔ بلکہ بولا۔

"اگر بادشاہ نے اس مچھلی کو برآمد کر کے فارن ایکسچینج کمایا تو اس میں سے بھی چھپن فیصد لا کر مجھے دینا۔"

خیر اس بے چارے کو ہامی بھرنی پڑی۔

بادشاہ مچھلی دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بولا۔ "مانگ کیا انعام مانگتا ہے؟"

"مچھیرے نے کہا۔ "حضور، اللہ کا دیا اور تو سب کچھ ہے۔ بس سو جوتے میرے سر پر کس کے لگا دیے جائیں۔

بادشاہ بہت حیران ہوا۔ سمجھانے کی کوشش کی، لیکن بوڑھا مچھیرا اڑا رہا۔ آخر بادشاہ نے ایک چوبدار سے کہا۔ "اس کے سر پر ہلکے ہلکے سو چھتر لگا دو۔ دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔ بے چارے کا۔

جب گنتی 44 پر پہنچی تو مچھیرے نے کہا۔ "حضور بس، میرا اس میں اتنا ہی حصہ ہے۔ باقی 56 جوتوں کا حق دار باہر ڈیوڑھی پر کھڑا ہے۔"

بادشاہ نے پورا حال سنا۔ انصاف پسند تھا۔ اس نے کہا۔

"ہاں بھئی، بات تو ٹھیک ہے۔ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ ہر چیز میں اس کو حصہ واجب ملنا چاہیے۔ خواہ بے بھاؤ کے جوتے ہی کیوں نہ ہوں۔ اب تو ہم اپنے ملک میں بھی یہ کرنے والے ہیں کہ اگر ایک حصے میں 44 آدمی پانی نہ ملنے سے پیاسے مر جائیں تو دوسرے میں 56 کو پکڑ کر تالاب میں ڈبو دیا جائے۔ بے انصافی کب تک چلے گی۔"

اچھا بس اب ہم تھک گئے۔

"ایک اور......ایک اور......"

3۔ دیوگری سے واپسی

اچھا اب ہم تمہیں ایک تاریخی حکایت سناتے ہیں۔ ملک ہندوستان میں ایک بادشاہ تھا محمد تغلق۔ بڑا عقل والا۔ علم و فضل والا۔ ایک روز اس کو خیال آیا کہ دہلی میں اور تو ساری خوبیاں ہیں۔ لیکن یہ ہندوستان کے وسط میں نہیں۔ اس نے فوراً نقشہ منگایا۔ پرکار رکھ کر دیکھا۔ معلوم ہوا کہ دکن کے اوپر دیوگری کا مقام زیادہ مرکزی ہے۔ فوراً حکم دیا۔

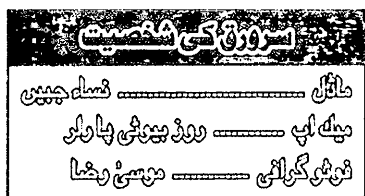
کہ مابدولت کا دارالخلافہ وہاں بنایا جائے اور دہلی کی آبادی نہ صرف اہل کار بلکہ اہل حرفہ بھی کوچ کر کے وہاں چلے جائیں۔ یہ ہمارا حکم ہے۔ کوئی سرتابی نہ کرے۔

رعایا خچروں اور چھکڑوں پر بیوی، بچے، مال، اسباب لاد روانہ ہوئے۔ کئی مہینے کی راہ تھی۔ کہیں ڈاکوؤں نے حملہ کیا، کہیں جنگلی جانور آن پڑے۔ بہت سے مر کھپ گئے۔ جو پہنچے انہوں نے وہاں سر چھپایا۔ کاروبار جمایا۔ مقام پر فضا تھا، پسند آیا۔ لیکن نازک مزاج شاہاں، ایک روز جانے کیوں ان کا جی دیوگری سے اچاٹ ہوا اور انہوں نے فرمان جاری کیا کہ چلو دلی واپس۔ یہاں ہمارا جی نہیں لگتا۔ جو لوگ بچ گئے تھے، ان میں سے آدھے پھر ڈاکوؤں، جنگلی جانوروں اور راہ کی سختیوں کا شکار ہوئے۔ بس تھوڑے سے برے حالوں واپس پہنچے۔ اب اس سے بھی کئی اخلاقی نتیجے نکلتے ہیں۔ بھلا بتاؤ کیا؟

خرر......رر......خرر......رر۔

ارے کیا سو گئے۔ اچھا السلام علیکم! خدا حافظ، شب بخیر۔

☆





"کیا حال ہیں فاخرہ؟"
"جی الحمدللہ۔"
"کچھ بتاؤ اپنے اور اپنی فیملی بیک گراؤنڈ کے حوالے سے؟"
"میرے ابو جی کا نام "چوہدری شوکت علی" ہے اور بنیادی طور پر ان کا تعلق چیچہ وطنی شہر سے ہے۔ ساہیوال آئے تھے اپنی جاب کی وجہ سے تو امی بھی ساتھ آئیں اور ابو جی نے بہت نیک نامی کمائی پورے شہر میں۔ ان کی سادگی کے اور صوفی ہونے کے چرچے تھے اور بہت ہی مہمان نواز ہیں۔ ایک بیٹھک لگا کرتی تھی جس میں اپنے تو آتے ہی تھے جو اجنبی تھے وہ بھی الحمدللہ اپنے حصے کا دانہ پانی کھا کر جایا کرتے تھے۔ حقے کی محفل باقاعدگی کے ساتھ لگتی تھی۔ چھ بیٹیاں ہونے کے باجود انہوں نے کبھی احساس نہیں ہونے دیا کہ میری چھ بیٹیاں ہیں اور کبھی

آپ کی پسندیدہ مصنفہ

فاخرہ جبیں سے ملاقات

شاہین رشید

احساس کو الفاظ کی مالا میں پرو کر قصے بننا پھر انہیں کہانی کی شکل دینا۔ آسان نہیں ایک حساس لکھاری جب اپنے آس پاس موجود لوگوں کی زندگیوں میں ہونے والے واقعات کو اپنے الفاظ کا پیراہن پہناتا ہے تو اس تحریر کے آئینے میں ہمارے معاشرے کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ جبیں سسٹرز کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ فاخرہ جبیں ایک ایسا نام جس نے ہمیشہ اپنی کہانیوں سے پڑھنے والوں پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ خوشبو، ہوا، بادل، بارش، پھولوں کے درمیان مہکتی فاخرہ جبیں اپنے بارے میں کیا کہتی ہیں۔ جانتے ہیں ان کی زبانی

ہمیں کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی۔
امی گھریلو خاتون تھیں اور وہ ایسی گھریلو خاتون تھیں کہ ان پر الگ سے ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ابا سارا دن نوکری پر رہتے اور امی حضور اور ان کا کنبہ جیسا کہ میں نے بتایا کہ چھ بیٹیوں اور ایک بیٹے پر مشتمل تھا اور ان کے علاوہ دو، چار بھینسیں، ایک آدھ درجن مرغیاں، لاوارث بلیاں، آنگن میں اترتی چڑیاں، کوے اور بے دریغ آتے جاتے مہمانوں کے ساتھ ساتھ ایک عدد مستقل ملازم بھی شامل تھا۔ آج سوچتی ہوں تو حیرانی ہوتی ہے کہ امی اتنے سبھاؤ سے اتنے ڈھیروں کام کیسے نمٹا لیتی تھیں۔

میرے ننھیال کا تعلق ضلع ہوشیار پور انڈیا سے تھا اور وہاں ان کی زمین جائیداد تھی۔ امی کی شادی ہوئی تو چیچہ وطنی آ گئیں اور ابو کے ساتھ ساہیوال میں ہی اپنا وقت گزارا اور میری اور ہم سب بہن بھائی کی پیدائش ساہیوال کی ہی ہے۔ ساہیوال نہ صرف بہت خوب صورت ہے بلکہ میری جائے پیدائش بھی ہے اس لیے مجھے بہت عزیز ہے۔ شادی سے پہلے میں دعا کرتی تھی کہ مجھے یہ شہر چھوڑنا ہی نہ پڑے۔

ہم چھ بہنوں کا ایک بھائی ہے۔ تین بہنیں مجھ سے بڑی ہیں۔ بڑی باجی زاہدہ کی شادی فیصل آباد میں ہوئی اور ان کے چار بچے ہیں اور میری باجی ہرفن مولا قسم کی چیز ہیں۔ سردیوں میں ہر طرح کی پنجیری، السی، ساگ اور ہر طرح کے اچار اور میٹھے کھانے بنا کر بھیجنا ان کی ذمہ داری ہے۔ ان کے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت ہے اور ہماری ایک فون کال پر وہ ہماری ہر فرمائش پوری کر دیتی ہیں۔

امی کے ساتھ ساتھ اگر ہمیں دوسری ماں نے پالا تو وہ ہماری زاہدہ باجی ہیں۔ شوقین مزاج بھی بہت تھیں۔ سلائی کڑھائی میں ماسٹر، ہمیں بھی اپنے ہاتھوں سے سلائی کر کے کپڑے پہناتی تھیں۔ اس زمانے میں ہمارے شہر میں فیشن اور میک اپ کا اتنا علم بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہمارے بال اسٹریٹ اور کلر کر دیا کرتی تھیں۔ ابو کے ایک دوست تھے دبئی میں۔ ان سے انہوں نے میک اپ کی ہر چیز منگوا کر رکھی ہوئی تھی جو ہم پر اپلائی کرتی تھیں اور ہم بچپن میں بڑے پیارے بن جاتے تھے۔

دوسرے نمبر پر باجی شاہدہ ہیں۔ ان کی شادی چیچہ وطنی میں میری خالہ کے گھر ہوئی۔ ان کے بھی چار بچے ہیں۔ ان کی شادی جلدی ہو گئی مگر انہیں شعر و شاعری اور ادب سے بے حد لگاؤ تھا۔ بی اے کرنے سے پہلے ہی چونکہ شادی ہو گئی تو وہ اپنے شوق کو پروان نہیں چڑھا سکیں۔

تیسرے نمبر پر میری مرحومہ بہن عذرا شوکت



تھیں، ان کے بارے میں کیا لکھوں؟ میرے گھرانے کا ہر فرد ایسا ہے کہ اگر انہیں کسی بڑے شہر میں کچھ کرنے کا موقعہ ملتا تو ہر فرد ایک جگمگاتا ستارہ ہوتا اپنے شعبے میں، عذرا شوکت میں تخلیقی صلاحیتیں بہت زیادہ تھیں۔ ہمیں لکھنے پڑھنے کا شوق اپنی اسی بہن کی وجہ سے ہوا۔ ان کا نام عذرا پروین تھا مگر وہ ہمیشہ والد کا نام ساتھ لگایا کرتی تھیں، عذرا شوکت کے نام سے لکھتی تھیں اور شعاع ڈائجسٹ میں بھی ان کا ایک آدھ ناول شائع ہو چکا ہے۔ ان کے جو مخصوص کردار ہوتے تھے وہ ''نبیل اور شہلا'' کے نام سے تھے اور وہ ناول لکھ لکھ کر اپنے چلبلے اور شرارتی کرداروں کے ساتھ اپنی تخلیقات ہمیں سنایا کرتی تھیں جنہیں سن سن کر ہمیں بھی لکھنے سے دلچسپی ہوتی گئی۔ عمران سیریز پڑھ کر چھپا دیا کرتی تھیں کہ میری چھوٹی بہنیں نہ پڑھیں۔

میری نسبت ''راحت'' کافی تیز اور ہوشیار تھی اور میں کافی سیدھی سادی۔ تو راحت مجھے نگرانی پر کھڑا

کر کے خود عمران سیریز پڑھتی تھی کیونکہ اس کی پڑھنے کی رفتار تیز تھی مجھ سے بڑی بھی تو کلاس آگے تھی۔ راحت کہانیاں پڑھ کر درخیت کے کسی کونے میں بیٹھ کر ساری کہانی سنا دیا کرتی تھی۔

عذرا شوکت کے ساتھ میرا تعلق ایسا تھا کہ جیسے انسان کسی کو اپنا مرشد مان لیتا ہے۔ میں نے ہر کام ان کی انگلی پکڑ کر کرنا سیکھا بس ان کی زندگی نے وفا نہیں کی۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ ان کو دیکھ کر دل کو سنبھالا دے دیتے ہیں۔ اللہ دونوں بچوں کو ساری خوشیاں دے، آمین۔

چوتھے نمبر پر بھائی ہیں جاوید شوکت۔ انہوں نے بھی ہر میدان میں پنجہ آزمائی کی۔ مارشل آرٹ میں اچھے حدف حاصل کیے۔ باکسنگ میں، کرکٹ میں ابتدائی سطح پر نام کمایا۔ بھائی صحافی بھی ہیں اور اپنا بزنس بھی کرتے ہیں، ان کے دو بچے ہیں۔ اماں ابا کے اور بھائی کے ساتھ ہمارا میکہ آباد ہے۔

''اب باری ہے معروف مصنفہ راحت جبیں صاحبہ کی...... ہم بن کہے ایک دوسرے کا دکھ سکھ خوشی جان لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ کر سب کچھ بھانپ لیا کرتے تھے۔''

''آپ دونوں کے تعلقات کیسے تھے۔ کبھی لڑائی جھگڑا ہوا۔ بچپن کی کون سی یادیں ابھی بھی تروتازہ ہیں۔''

''بچپن ایک ایسا وقت تھا جس میں رشتوں میں، ماہ و سال میں۔ رزق میں برکت ہی برکت ہوا کرتی تھی۔ تب کیلنڈر بدلتا تھا تو اس کے صفحے پیلے اور بوسیدہ ہو جایا کرتے تھے۔ تب سڑک پر ٹریفک کا ہجوم کم اور شیشم کے درختوں پر چڑیوں کا شور زیادہ ہوتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب کاگا بولتا تھا، تو شام تک لازماً مہمان کی آمد ہو جایا کرتی تھی۔ ان ہی خوب صورت ایام کی گود میں ہمارا بچپن گزرا۔

ہم کھلونوں سے کبھی نہیں کھیلتے تھے نہ ہی مجھے شوق تھا، گھر میں بھائی بہنوں سے ہی اتنی دوستی تھی کہ کبھی بے جان چیزوں سے دل بہلانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی، پڑوس کی لڑکیاں بھی جمع ہو جاتیں اور ٹی وی کی سہولت سے سب مستفید ہوتیں۔ ابا مونگ پھلی اور ریوڑیاں لے کر آتے اور امی سب میں ان کو تقسیم کر دیا کرتی تھیں۔ ہم سب مل کر کھاتے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے تھے۔ اسکول میں ہمیں اچھا خاصا پروٹوکول ملتا تھا کیونکہ اسکول میں ہم واحد بچیاں تھیں، جو بہت روانی اور پراعتماد انداز میں اردو بول سکتی تھیں۔ ایک دن ڈی ای او صاحب نے اسکول کا وزٹ کیا۔ اسمبلی میں کھڑی تمام لڑکیوں میں سے وہ میرے پاس آئے اور اسکول کے بارے میں مختلف سوال کیے۔ میں نے بھی من و عن سب کچھ بتا دیا کہ دو کمروں کے اسکول میں بارش ہوتی ہے تو سارا اسکول ان ہی دو کمروں میں سما جاتا ہے۔

اب پتا نہیں لہجہ اچھا تھا یا اردو متاثر کن تھی، انٹرویو لمبا ہوتا چلا گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈی ای او صاحب نے انٹرویو دینے والی طالبہ کی بے حد تعریف کی۔ پھر وہ صاحب تو چلے گئے اور اساتذہ اگلے پورے ہفتے مجھ سے فرداً فرداً انٹرویو کی داستان سنتے رہے۔ اسکول میں پڑھائی کا کوئی رواج نہیں تھا۔ میرا دل ہوتا تو پڑھتی ورنہ گھاس پر چلتے ٹڈوں اور جنتر کے درختوں پر بیٹھی چیلوں سے دل لگا لیا کرتی تھی۔

امی کو پڑھنے کا بہت شوق تھا مگر مزے کی بات ہے کہ انہوں نے کبھی اسکول کی شکل نہیں دیکھی تھی جبکہ ماموں یونیورسٹی کے گولڈ میڈلسٹ تھے۔ امی کو بچپن میں ایک ابتدائی قاعدہ پڑھایا گیا تھا پھر اس کے بعد شوق تھا یا جنون ہمارے گھر میں اخبار صرف امی کی وجہ سے آیا کرتا تھا اور پھر مجھے بھی شوق ہوا اور بچوں کا صفحہ بڑے شوق سے پڑھنے لگی...... جہاں تک بہن بھائیوں میں لڑائی جھگڑے کی بات ہے تو مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی ہمارے درمیان کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہو۔ نہ کپڑوں پر، نہ جوتوں پر، نہ ہی کسی اور چیز پر۔ بلکہ ایک دوسرے سے بڑھ کر ایک دوسرے کا خیال رکھا

اور سب حیران ہوتے تھے کہ بھلا اتنا بھی اتفاق ہوتا ہے کسی میں جتنا ان میں ہے۔

اختلاف ہوتے تھے مگر بات کر کے دور کر لیتے تھے۔ ہماری پسند نا پسند مختلف تھی۔ ہمارے مزاج مختلف تھے مگر دوستی بہت رہی۔ ہم دونوں بہنیں یعنی راحت اور میں نعت مل کر پڑھا کرتے تھے تو سب کہتے تھے کہ پتا نہیں چلتا کہ ایک لڑکی پڑھ رہی ہے یا دو لڑکیاں مل کر پڑھ رہی ہیں۔ اسکول کالج کے زمانے میں ایکٹنگ بھی بہت کی ہے۔

پھر راحت کی شادی ہوگئی اور الحمدللہ میرے بہنوئی اسلم صاحب کی وجہ سے آج بھی ہمارا تعلق اتنا ہی اسٹرونگ ہے۔ آج بھی گھنٹوں گھنٹوں باتیں کرتے ہیں اور مہینوں مہینوں ایک دوسرے سے ملاقات نہ بھی ہو تو کسی سے شکوہ نہیں کیا بلکہ ایک دوسرے کے دل بن کر دھڑکتے ہیں۔

ایسا نہیں کہ صرف راحت کے ساتھ ایسا تعلق ہے بلکہ سب بہنوں اور بھائی کا ایسا ہی تعلق ہے اور ہم سب ایک لڑی کی طرح ہیں اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ یہ محبت ہم نے اپنی امی کی طرف سے پائی ہے۔ اس لڑی میں ایک موتی کا ذکر رہ گیا سمیرا شوکت ہے۔ ہم سب کی لاڈلی، سب سے چھوٹی۔ لاہور میں رہتی ہے اپنے میاں کے ساتھ لکھنے کا کوئی شوق نہیں البتہ جاب کرتی ہے۔"

"فاخرہ! آپ کی باتوں میں بہت مزا آرہا ہے۔ آپ کے لکھنے کی جانب بھی آئیں گے مگر پہلے آپ یہ بتائیں کہ اپنے اور راحت کے نام کے ساتھ "جبیں" کیوں لگائی ہیں؟ اور پھر بتایئے اپنی شادی کے بارے میں؟

"جبیں" کی کہانی کچھ یوں ہے کہ ہمیں بہت شوق تھا کہ اپنے نام کے ساتھ ابا کا نام لگائیں اور جب کہانیاں لکھنے کا آغاز کیا تو والد کے نام کے ساتھ ہمارا نام شائع ہوتا تھا "راحت شوکت اور "فاخرہ شوکت" پھر ایک دن راحت نے کہا کہ میں چاہتی



ہوں کہ میں اپنے نام سے لکھوں۔

پہلا ناول "راحت جبیں" کے نام سے لکھا تو پھر میں نے نام کے ساتھ جبیں لگانا شروع کر دیا۔ اسکول کالج میں بھی ہم اسی نام کے ساتھ پہچانے جاتے تھے۔ مگر اسکول کالج والوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ راحت شوکت اور فاخرہ شوکت درحقیقت راحت جبیں اور فاخرہ جبیں ہیں تو پھر ہم دونوں نے "جبیں" کے ساتھ لکھنے کا سوچا۔

ہماری ایک ٹیچر تھیں تو انہوں نے بھی کہا کہ شادی کے بعد عموماً لڑکیاں اپنا نام بدل لیتی ہیں تو بہتر ہے آپ ان کے ناموں کے ساتھ "جبیں" لکھوا لیں۔ یہ بات انہوں نے ہمارے ایڈمیشن کے وقت کہی تھی۔ باجی زاہدہ ہمارا داخلہ کروانے گئی تھیں۔ انہوں نے ہی راحت جبیں اور فاخرہ جبیں لکھوا دیا اور یوں "جبیں" ہماری کامیابی کی سند بن گیا۔ اور شادی کے بعد نام اس لیے تبدیل نہیں کیا کہ نہ تو میاں نے ایسی کوئی فرمائش کی اور نہ ہی مجھے کوئی ایسی ضرورت پیش آئی۔

بات کرتی ہوں اپنی شادی کی...... میری شادی

جن حضرت سے ہوئی ہے، ان کا نام ''محمد زاہد اسلم'' ہے۔ ان کا تعلق بھی چیچہ وطنی سے ہے اور یہ میری پھوپھو کے بیٹے ہیں۔ ہماری شادی 6 جنوری 2007ء میں ہوئی۔ میاں صاحب ایم اے انگریزی ادب ہیں اور ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ سے منسلک ہیں۔ ہمارے ماشاء اللہ چار بچے ہیں۔ تین بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ میری بیٹی کا نام ''مشال فاطمہ'' ہے اور کلاس سکس کی طالبہ ہے۔ پھر عبیر فاطمہ ہے پھر بیٹا حماد مصطفیٰ ہے اور سب سے چھوٹی بیٹی عنایا فاطمہ ہے۔ چاروں کے الگ الگ مزاج ہیں۔ الگ الگ شخصیت ہے۔

میری ہی ساری عادات و صفات لی ہیں بچوں نے۔ زمانہ طالب علمی میں، میں نے کوئی کام چھوڑا ہی نہیں تھا۔ تقریری مقابلوں میں حصہ لینا، لکھنا، اداکاری کرنا اور نعت خوانی اور گلوکاری سب ہی کام کرلیا کرتی تھی اور میری یہ تمام خوبیاں میرے چاروں بچوں میں اللہ تعالیٰ نے بانٹ دی ہیں۔

آپ بھی کیا سوچیں گی کہ اپنی تعریف خود کررہی ہیں تو میں اپنے بارے میں یہ بھی کہنا چاہوں گی کہ میں امور خانہ داری میں کوکنگ بھی اچھی کرلیتی ہوں اور سسرال میں ہمیشہ سب کی پسندیدہ شخصیت رہی ہوں اور ابھی بھی ہوں۔ سسرال میں سب میری تحریروں کو پسند کرتے ہیں۔ خاص طور پر میری چھوٹی دیورانی میرے ناول اور ناولٹ بہت شوق سے پڑھتی ہے اور سب کو بتاتی ہے، ہماری بھابھی لکھتی ہیں۔''

''چلیں جی۔ اب آتے ہیں آپ کی لکھائی کی طرف۔ تو پہلے یہ بتایئے کہ لکھنے کا شوق کیسے ہوا اور پہلی کہانی کیا لکھی؟''

''جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میری امی کو اخبارات و رسائل پڑھنے کا بہت شوق تھا اور ان ہی کے شوق کی وجہ سے مجھے بھی پڑھنے کا شوق ہوا اور پھر یہی شوق کہانیاں گھڑنے کی بنیاد بنا۔ پہلی کہانی پانچویں جماعت میں تھی تو لکھی اور وہ شائع بھی ہوگئی۔ اور یوں عذرا شوکت اور راحت جبیں کے ساتھ ساتھ میں بھی ان کی لائن میں لگ گئی۔ بچوں کے لیے بے تحاشا لکھا، اخبارات میں بھی اور رسائل میں بھی اور الحمدللہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میری کوئی تحریر شائع نہ ہوئی ہو۔

جب باشعور ہوئی بڑوں کی کہانیوں کی طرف آئی تب بھی کوئی تحریر ایسی نہیں تھی کہ شائع نہ ہوئی ہو...... ڈائجسٹ میں میری پہلی تحریر ''کرن'' میں شائع ہوئی ''کرن'' میں تحریر بھجوانے کا شوق اس لیے ہوا کہ راحت کی بدولت خواتین اور شعاع کی اعزازی کاپیاں گھر بیٹھے وصول ہورہی تھیں۔

کرن کی اعزازی کاپی وصول کرنے کی خاطر میں نے اپنی پہلی تحریر ''کرن'' میں بھجوائی۔ تحریر نہ صرف شائع ہوئی بلکہ پسندیدگی کی سند بھی ملی۔ تحریر کا نام ''تراشا ہوا سفر'' اور اس کے سب ہی کردار بہت دل سے تراشے تھے میں نے۔ اس کے بعد تقریباً چھ سات ماہ مسلسل کرن میں لکھا اور آہستہ آہستہ میں نے خواتین ڈائجسٹ اور شعاع میں بھی لکھنا شروع کردیا تھا۔ اس وقت میں ''فرسٹ ایر'' اور راحت سیکنڈ ایر کی طالبہ تھی۔ لہٰذا لکھنے کا جو اعزازیہ ملتا تھا اسے کالج کی کینٹین میں عیاشی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ضروریات کے لیے بھی استعمال کرلیتے تھے۔''

''فرسٹ ایر میں ڈائجسٹ لکھنا شروع کیا۔ انتہائی جذباتی عمر ہوتی ہے، رومانس کو کس انداز میں لکھا؟ کھلے انداز میں یا ڈھکے چھپے انداز میں؟''

''بے شک کم عمری میں ناول اور ناولٹ لکھنے کی ابتدا کی۔ لیکن میرے قارئین گواہ ہیں کہ میں نے ہمیشہ ذمہ داری سے لکھا۔ میرے کسی ناول میں آپ کو گھٹیا رومانس نہیں ملے گا۔ میری تحریروں میں رومانس یا تو کیفیات میں ڈھلتا ہے یا پھر کسی کی پروا کرنے میں یا کسی جذبے اور شخصیت کو معتبر بنانے کی صورت میں نظر آتا ہے۔ میری اپنی کچھ ویلیوز ہیں۔ مقرر کردہ حدود ہیں جو لکھنا چاہتی تھی پھر لکھ دیتی تھی۔ کسی ڈر، خوف کے جذبے سے اپنے آپ کو محدود نہیں کیا۔ اسی طرح لکھائی کو کمائی کا ذریعہ نہیں بنا سکتی۔ کیونکہ لکھنے

کے معاملے میں بہت موڈی ہوں۔ بے شما
رافسانے، ناول ادھورے پڑے ہیں۔
کبھی بچوں کی مصروفیت آڑے آ گئی تو کبھی خود
تھکن کا شکار ہو گئی۔ اس لیے لمبے ناول لکھنا
تقریباً چھوڑ ہی دیا ہے۔ ہاں اب افسانہ بہت شوق
سے لکھتی ہوں۔ جبکہ اس سے پہلے افسانہ پڑھنا بھی
مجھے پسند نہیں تھا۔ اب قصوں کی شکل میں افسانے
ذہن میں آتے ہیں۔ اور جھٹ پٹ آتے ہیں اور تب
آتے ہیں جب ذہنی طور پر پرسکون ہوتی ہوں۔ لکھنے
بیٹھوں تو خیالات کی ایسی یلغار ہوتی ہے کہ پھر لکھنا
بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔ اگر سوچتی ہوں کہ کوئی ایسا
نوٹ پیڈ ایجاد ہو جائے کہ میں سوچوں اور اس پر رقم
ہو جائے پھر میرے قارئین ہر مہینے میری تحریر پڑھ
سکتے، جب ناول لکھتی ہوں تو کہانی سے زیادہ کردار
مجھے متاثر کرتے ہیں۔ بڑے میاں، جنتی خالہ،
رفاقت حسین چوہدری، کاکا جان جیسے کردار لوگوں کو
ابھی بھی یاد ہوں گے۔“

”آپ کی کہانیاں ذہن کی پیداوار ہوتی ہیں یا
مشاہدات کی۔ کبھی کوئی ایوارڈ ملا؟“

”میری اولین تحریریں گھڑی ہوئی کہانیاں
تھیں۔ ان میں سے کچھ مجھے پسند بھی ہیں اور کچھ
ناپسند بھی ہیں۔ ان کو پڑھوں تو بچکانہ انداز کی
کہانیاں محسوس ہوتی ہیں، رفتہ رفتہ حقیقی کرداروں نے
مجھے اپنی کھینچنا شروع کر دیا۔ اور ان کرداروں کو پھر
میں نے کہانی کا قصہ بنایا۔ ”ہم جو کہلائے طلوع
آفتاب“ کی درنجف، برف زاروں کی تتلی۔“ کی
ماہین وجدان، رفاقت حسین چوہدری، ”یہ جو زندگی کی
کتاب ہے“ کی عفیفہ ”قصہ ایک دوپہر کا“ کی منشاء
”قصہ ایک سویر کا“ میں بوڑھی اماں اور مجھلی کا
کردار......

جس کردار کو چھیڑیں وہ ایک الگ حقیقی کہانی
کے ساتھ۔ حاضر ہوگا چونکہ یہ حقیقی زندگی سے اخذ کیے
گئے ہیں تو ان کو لکھتے اور پڑھتے ہوئے آج بھی مختلف
کیفیات وارد ہوتی ہیں...... ”یہ جو زندگی کی کتاب
ہے“ کی عفیفہ نے جب اپنی کہانی پڑھی تو میرے
سامنے بیٹھی تھیں اور روئے چلی جاتی تھیں۔ ان کے
آنسو اس روانی سے بہتے تھے کہ میں آج بھی انہیں
بھول نہیں پائی۔

وہ روتی تھیں اور کہتی تھیں۔

”تم نے میرے دل کی سب کیفیات کو کیسے
جانا؟...... تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتا چلا ہے؟“

اس سے بڑھ کر میرے لیے کوئی کیا ایوارڈ
ہوسکتا ہے...... زمانہ طالب علمی میں چند مقابلے جیتے
کچھ تحریری اور کچھ تقریری، یونیسیف کی طرف سے
ایک مقابلہ ہوا تھا اس میں فرسٹ پرائز ملا تھا۔

”ٹی وی سے دوری کی کیا وجہ ہے؟“

”ٹی وی سے دوری بچوں کی وجہ سے رہی جیسا
کہ بتایا کہ میں لکھنے کے معاملے میں بہت موڈی
ہوں۔ میرے بہت سے پیاروں نے اس سلسلے میں
مجھ سے رابطے کیے ہیں۔ لیکن میں ڈرتی ہوں کہ
مستقل مزاجی سے نہیں لکھ پاؤں گی۔ اسی ڈر سے آج
تک سلسلے وار ناول بھی نہیں لکھا۔ بات صرف سستی
تک محدود نہیں ہے۔ کچھ مصروفیات بھی رہتی ہیں۔
الحمدللہ میں درس و تدریس کے شعبے سے بھی وابستہ
ہوں۔ سچ پوچھیں تو اپنے ادارے سے، اپنے طلبہ
سے عشق و عقیدت کے جذبات رکھتی ہوں۔ بہت
سے مشورے ملے کہ جاب چھوڑ دو۔ ڈرامہ لکھو، نام
اور پیسہ دونوں کما لو گی...... لیکن مولا کا کرم ہے
سترہویں گریڈ کی اس جاب میں بھی مجھے نام، عزت
اور روپیہ پیسہ سب مل رہا ہے۔ اور اللہ کا کرم کہ دل کی تسلی
اور سکون سے مالا مال ہوں۔“

”میرے خیال میں پھر آپ ڈرامہ تو کبھی نہیں
لکھ پائیں گی؟“

”ایسا نہیں ہے لیکن ڈرامہ میرے مزاج سے
مختلف صنف ہے آپ کو اپنی مرضی سے ہٹ کر
ناظرین کی پسندیدگی کا خیال رکھتے ہوئے لکھنا پڑتا
ہے جو مجھے بہت مشکل لگتا ہے ایک آدھ بار کوشش کی
ہے مگر مجھے مزا نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والے

وقت میں مجھے دلچسپی پیدا ہو جائے اور میں بھی ایک اچھا ڈرامہ لکھنے میں کامیاب ہو جاؤں۔"

"رائٹرز کی پہچان ذرا مشکل سے ہی ہوتی ہے۔ جب تک کہ خود سے یا کوئی دوسرا تعارف نہ کرائے۔ آپ کے ساتھ کیا صورت حال ہے؟"

"اس سلسلے میں ایک بہت ہی مزے کا واقعہ آپ کو سناؤں، الیکشن کے دوران ووٹ ڈالنے گئی تو چند لڑکیاں کھڑی تھیں۔ جو سب کو گائیڈ کر رہی تھیں کہ کہاں ووٹ ڈالنا ہے۔ وہ ہر ایک کا شناختی کارڈ دیکھتیں اور رہنمائی کرتیں۔ میں نے جب اپنا شناختی کارڈ دکھایا تو ان کی زوردار چیخوں نے دل ہلا کر رکھ دیا۔ پتا چلا کہ ڈیوٹی اسی مقصد کے لیے یہاں لگوائی تھی کہ راحت اور فاخرہ جبیں سے ملاقات ہو سکے...... وہ ملاقات انتہائی دلچسپ رہی...... بصورت دیگر کسی بھی جگہ جاؤں میں اپنا تعارف بہ حیثیت رائٹر اور استاد نہیں کرواتی کیونکہ دونوں صورتوں میں لوگوں کے رویوں میں تبدیلی آجاتی ہے۔ جبکہ میں انہیں خالصتاً ان ہی کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"اتنا کچھ ملنے کے بعد کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟ خاص طور پر محبت کے حوالے سے؟"

"دوست احباب، بچوں، شاگرد کولیگز اور حتیٰ کہ انجان لوگوں نے بھی اتنی محبتیں دی ہیں کہ بعض اوقات میں زار و قطار رو دیتی ہوں۔ یہ غیر معمولی محبتیں مجھے ڈرا دیتی ہیں کہ مجھ حقیر گناہ گار کو اتنی چاہت کیسے نصیب ہو رہی ہے میرے اعمال میں تو ایسا کچھ نہیں ہے۔ میرے پروردگار کی نظر کرم ہے مجھ پر یا میرے ماں باپ کی دعائیں ہیں جو اعلیٰ درجات میں قبولیت کا شرف حاصل کر رہی ہیں۔"

"اپنی زندگی میں گویا بہت خوش ہیں آپ؟"

"الحمدللہ، میری زندگی بہت پر امن، سکون اور پیار محبت میں گزر رہی ہے۔ اور یہ میرے پروردگار کی مجھ پر خاص الخاص عنایت ہے۔ میرے بھائی بہنیں، میرے ماں باپ نے ہمیشہ عزت، خلوص اور بے پایاں محبت سے نوازا، زاہد سلیم جو میرے پھوپھی زاد ہیں۔ اس معاملے میں انہوں نے کبھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور مجھے نہیں یاد کہ انہوں نے کبھی مجھے "تم" کہہ کر مخاطب کیا ہو۔ میرے بچے مجھے ایک پل کے لیے اپنے سے جدا یا اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔"

"ہاں...... مجھے یاد آیا کہ آپ نے کچھ گیپ دیا تھا اپنی لکھائی میں...... کیوں...... اور یہ بھی بتائیں کہ لکھنے کا بہترین وقت کون سا ہے آپ کا؟"

"بچوں کی وجہ سے گیپ آیا، جب شادی ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے بیٹی سے نوازا تو اس کے بعد تو مجھے یہی احساس ہوا کہ میری پہلی ترجیح میرے بچے ہیں۔ اور بچوں سے مجھے ویسے ہی بہت پیار ہے۔ بلکہ عشق ہے نہ صرف اپنے بچوں سے بلکہ مجھے اپنے اسٹوڈنٹس بھی بہت پیارے ہیں۔ تو بس بچوں کی پیدائش کے بعد میں مکمل طور پر ان میں مگن ہو گئی۔ ہر وقت ان کے آس پاس گھومتی رہتی تھی۔ ان سے کھیلنا، ان سے باتیں کرنا، ان کا خیال رکھنا...... تو بس اسی وجہ سے میں نے لکھنے کو خیرباد کہہ دیا تھا......

جب قلم مجھے مجبور کرتا تھا کہ مجھے لو اور کچھ لفظ ادا کر دو تو پھر رات دو بجے میرے لکھنے کا بھی وقت ہوتا تھا۔ اور ابھی ایسا ہی ہے میں سارا دن نہیں لکھ سکتی کہ ٹائم ہی نہیں ملتا۔ رات کو بچوں کو سلانے کے بعد میں بھی تھوڑا آرام کرتی ہوں اور پھر رات دو بجے اٹھ جاتی ہوں۔ تب کچھ عبادت کر لیتی ہوں اور کچھ لکھ لیتی ہوں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے فاخرہ جبیں سے اجازت چاہی، اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔





1 ''اصلی نام؟''

''حامد نوید اور یہ نام میرے دادا نے رکھا تھا۔''

2 ''پیار کا نام؟''

''کوئی نہیں ہر کوئی نام ہی لیتا ہے۔''

3 ''تاریخ پیدائش؟''

''25 نومبر 1985ء۔''

4 ''قد/ستارہ؟''

''5 فٹ 8 انچ/قوس۔''

5 ''مادری زبان؟''

''پنجابی۔''

6 ''فیملی ممبرز/آپ کا نمبر؟''

''والدین اور ہم چار بہن بھائی ۔ میرا نمبر دوسرا ہے۔''

باتیں حامد نوید سے

شاہین رشید

7 ''شادی/بچے؟''

''الحمدللہ/دو بچے ہیں بیٹا اور بیٹی۔''

8 ''تعلیم؟''

''گریجویٹ ٹریننگ ایز انکم ٹیکس ایڈوائزر، پرفارمنگ آرٹس۔''

9 ''شوبز میں آمد/گھر والوں کا ردعمل؟''

''میرا جنون مجھے اس فیلڈ میں لے کر آیا اور میں نے اپنی جگہ بنانے کے لیے بہت محنت کی ہے بہت زیادہ، بسوں میں دھکے کھائے لوگوں کے آفس میں جا کر گھنٹوں گھنٹوں انتظار کیا کہ آڈیشن لے لیں۔ فارغ بیٹھے ہوتے تھے مگر توجہ نہیں دیتے تھے، کال نہیں اٹھاتے تھے۔ صبح نکلتا تھا رات کو آتا تھا، فری میں بھی کام کیا، زیرو بجٹ میں بھی کام کیا۔ اسی آس پر کہ ایک دن تو اپنا آئے گا۔ کیریئر بنے گا اپنے اللہ پر یقین تھا اور شکر ہے کہ پھر اپنے دن شروع ہوئے اور آج میں پہچانا جانے لگا ہوں اور ان شاء اللہ اور بھی اچھا وقت آئے گا۔ گھر والوں نے کافی سپورٹ کیا۔''

10 ''بچپن کی ایک بری عادت جو مشکل سے گئی؟''

''ساری ہی بری ہیں جاتی ہی نہیں۔''

11 ''پہلی کمائی کتنی تھی اور کس کے ہاتھ میں رکھی تھی؟''

''بہت چھوٹی عمر میں کام شروع کر دیا تھا ساتھ ساتھ پڑھائی بھی کی، ابو جہاں کام کرتے تھے اسی فیکٹری میں کرتا تھا چھٹیوں میں، اس طرح شوبز میں بھی کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا تو امی کو دے دیتا تھا کچھ خود رکھ لیتا تھا۔''

12 ''بچپن کا پہلا پیار؟''

''قہقہہ...... جب میں کلاس تھری میں تھا تو اپنی ہی ایک کلاس فیلو مجھے پسند آ گئی تھی۔ تو سارے دوست کہتے تھے کہ یہ میری ہے، یہ میری ہے۔ اس طرح ہمارے پڑوس میں ایک شادی تھی اس میں ایک آنٹی آئی تھیں ان



کے دو بچے بھی تھے وہ مجھے پسند آ گئی تھیں اور واقعی وہ میرا ''کرش'' تھیں اور مجھے آج تک یاد ہیں۔''

13 ''آپ کا سورج کب نکلتا ہے؟''

''کام ہو تو جلد اٹھ جاتا ہوں۔ ورنہ سات ساڑھے سات بجے بچے کو اسکول چھوڑنے کے بعد دوبارہ سو جاتا ہوں۔''

14 ''صبح کیا نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی؟''

''کوئی ایسی عادت ہے نہیں۔''

15 ''کیا برداشت نہیں، غصہ یا بھوک؟''

''غصہ بالکل بھی برداشت نہیں ہوتا، بھوک تو بہت آسانی سے برداشت کر لیتا ہوں۔''

16 ''پاکستان کے لیے کیا سوچتا ہوں؟''

''کہ خدا کرے حالات بہتر ہو جائیں کیونکہ اب یہ ملک اس قابل نہیں رہا کہ یہاں میرے بچے رہ سکیں۔ محفوظ نہیں ہے یہ بچوں کے لیے۔''

17 ''سیاست میں کون پسند ہے؟''

''کوئی بھی نہیں ...... لیکن نواز شریف کے لیے میرے دل میں نرم گوشہ ہے۔''

18 ''کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟''

''کسی بھی ملک کی نہیں...... لیکن میں ساری دنیا گھومنا چاہتا ہوں اپنے بچوں کے ساتھ۔''

19 ''کیا آپ کورونا کا شکار ہوئے۔ لاک ڈاؤن میں دن کیسے گزرے تھے؟''

''جی بالکل میں کورونا کا شکار ہوا تھا اور میری پوری فیملی کورونا کا شکار ہو گئی تھی اور میں گھر پر ہی رہا تھا۔ لاک ڈاؤن کے دنوں میں کھایا پیا اور عبادت کی، نمازیں پڑھیں اور دعائیں مانگیں کہ اس مہلک بیماری سے نجات دے۔''

20 ''شوبز میں کیا اچھا ہے کیا برا ہے؟''

''جس کی سوچ اچھی ہے اس کے لیے سب کچھ اچھا ہے اور جس کی سوچ بری ہے اس کے لیے سب کچھ برا ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔''

21 ''اسپورٹس سے لگاؤ؟ کون سا کھیل پسند ہے؟''

''کچھ خاص لگاؤ نہیں ہے۔ ہاں میں تھوڑا شاعرانہ طبیعت کا مالک ہوں۔ ہاں کالج لائف میں ''اسنوکر'' کھیلتا تھا۔''

22 ''زندگی سے کیا سیکھا؟''

''یہ کہ کتابی باتیں صرف کتابی ہوتی ہیں حقیقت کچھ اور ہوتی ہے، جس طرح آپ نے سوچا ہوتا ہے پلان کیا ہوتا ہے درحقیقت زندگی اس طرح نہیں ہوتی، یہ اپنے طریقے سے آپ کو لے کر چلتی ہے۔''

23 ''ایک نصیحت جو لڑکیوں کو کرنا چاہتے ہیں؟''

''شوبز کے حوالے سے ہی کہوں گا کہ جتنا کام عزت سے ملے اتنا ہی کیجیے۔ زیادہ کام کے لیے عزت کو مت گنوائیں۔''

24 ''گزشتہ دو سالوں میں کون سا ڈرامہ سیریل پسند آیا؟''

''میرے پاس تم ہو'' اور ''دل لگی''۔''

25 ''پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تو؟''
''تو کچھ نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ میں بہت پریکٹس کرتا رہتا تھا۔ اب بھی بس دل تیز تیز دھڑکتا ہے۔''
26 ''تنہائی کا احساس کب ہوتا ہے؟''
''جب بچے اور فیملی پاس نہیں ہوتے۔''
27 ''دل کی دھڑکن کب تیز ہوتی ہے؟''
''جب کچھ اچھا کرنا چاہ رہا ہوتا ہوں اسی طرح ہو جائے جس طرح میں چاہ رہا ہوں۔''
28 ''زندگی میں کچھ واپس ملنے کا چانس ملے تو کیا واپس لیں۔ گے؟''
''15 سے 20 سال کا جو دورانیہ تھا جو سال تھے وہ واپس مل جائیں جب میں اپنا پیک ٹائم سوچ رہا تھا۔''
29 ''گھر میں سب سے زیادہ پیار کس نے دیا؟''
''امی نے اور ابھی تک بہت کرتی ہیں۔ لیکن ابو سے بہت کٹ (مار) کھائی ہے میں نے اور ڈانٹ تو ابھی تک پڑتی ہے۔''
30 ''بیماری کو سیریس لیتے ہیں؟''
''جب تک تکلیف ہوتی ہے۔ جب ٹھیک ہونے لگتا ہوں تو دوائی کا کورس بھی پورا نہیں کرتا۔''
31 ''آپ کے اب تک کے ڈراموں کی تعداد؟''
''مجھے اس فیلڈ میں 13 سال ہوگئے ہیں اور بہت کام کیا لیکن جو ڈرامے میرے دل کے قریب ہیں ان میں ''تیری میری جوڑی۔ کم بخت تنو۔ باجی ارشاد۔ سایہ۔ خسارہ'' اور اب ''دھکی پٹی محبت'' آن ایئر ہے۔ انہوں نے مجھے پہچان دی راستے ہموار کیے۔''
32 ''رومینٹک رول آسانی سے کر لیتے ہیں یا نگیٹو؟''
''رومینٹک رول بہت آسانی سے کر لیتا ہوں اور نگیٹو رول بہت زیادہ آسانی سے کر لیتا ہوں۔ مگر خواہش ہے کہ رومینٹک ہیرو کے طور پر پہچانا جاؤں۔''
33 ''ادب سے لگاؤ؟''



''ہے مگر ایسا نہیں کہ مطالعہ کیے بغیر رہ ہی نہ سکوں۔ منٹو کو بہت شوق سے پڑھا ہے اور پھر اچھا مل جائے تو اسے بھی پڑھ لیتا ہوں۔''
34 ''کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟''
''نہیں ابھی ایسی نوبت نہیں آئی۔ سب کے مشورے سے ہی چلتا ہوں۔''
35 ''کچن سے لگاؤ؟ کبھی شیف بننے کا خیال

35 ''کچن سے لگاؤ؟ کبھی شیف بننے کا خیال
آیا؟''
''بالکل بھی لگاؤ نہیں ہے اور نہ ہی شیف بننا چاہتا ہوں۔ لاک ڈاؤن کے دوران شوق ہوا۔ ایک ڈش بنائی بھی مگر اس کے بعد توبہ کر لی۔ بیگم کو کہا یہ آپ کا ہی کام ہے۔''
36 ''کیا آپ برانڈ کونشس ہیں؟''
''بہت زیادہ، برانڈز کی چیزوں کا بہت شوق ہے۔ میں اچھی چیز خریدنا پسند کرتا ہوں۔''
37 ''کس کے لیے زندہ رہنا چاہتے ہیں؟''
''اپنی فیملی کے لیے۔ اپنے بیوی بچوں کے لیے۔''
38 ''ایک نصیحت جو گرہ سے باندھ لی؟''

''زندگی میں، میں نے بہت ''نہ'' کی جس کی وجہ سے مجھے اپنا کیریئر بنانے میں ٹائم لگا تو اپنی نصیحت کو خود ہی گرہ سے باندھ لیا ہے کہ ہر بات میں اور کام میں ''نہ'' نہیں کرنا چاہیے۔''

39 ''مجھے نفرت ہے؟''

''ان سے ہے جن کو میں پسند نہیں کرتا۔ میں انسانوں سے نفرت نہیں کرتا مگر اختلافات سے ضرور کرتا ہوں۔''

40 ''ایک خواہش جو حسرت بن گئی؟''

''حسرت تو نہیں۔ مگر خواہش ہے کہ میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ دنیا گھوموں اور باحیثیت آرٹسٹ کے میں بہت اعلیٰ مقام حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

41 ''کون سا رول کرنے کی خواہش ہے؟''

''مجھے رومینٹک رول کرنے کی خواہش ہے اور لیڈ کردار کرنا چاہتا ہوں بہت خواہش ہے۔''

42 ''آپ کا ناقابل فراموش کردار؟''

''ابھی تک کوکہ ایسا موقعہ نہیں ملا۔ مگر پھر بھی باجی ارشاد میں جو رول میں نے کیا تھا تو اس سے اچھا ''کرشن'' کا کردار کوئی کر نہیں سکے گا۔ بہت اچھا فیڈ بیک ملا تھا مجھے۔''

43 ''کس رول کو کرنے سے انکار کیا؟''

''ابھی ایسی نوبت نہیں آئی۔ ''نہ'' کے نقصانات کے بعد اب ''نہ'' نہیں کرتا۔''

44 ''کس سیاست دان کا کردار کرنا چاہتے ہیں؟''

''سیاست دان کے کردار میں بہت مارجن ہوتا ہے پرفارمنس کا لیکن کسی کی کاپی کر کے نہیں کر سکتا۔''

45 ''چاند پر پہنچ کر دنیا میں پہلا پتھر کس کو ماریں گے؟''

''نہیں۔ کوئی ایسا نہیں کہ جس کو پتھر ماروں البتہ کچھ نگیٹو چیزوں کو ضرور پتھر ماروں گا تاکہ وہ ختم ہوں۔''

46 ''آپ کی فیوچر پلاننگ؟''

''بہت کام کرنا ہے۔ ایک اچھا گھر بنانا ہے۔ ایک اچھی کار لینی ہے۔ بہت سی چیزیں لینا چاہتا ہوں جس کے لیے بہت پیسہ چاہیے۔''

47 ''بچوں کے ہاتھ میں موبائل لمحہ فکریہ یا وقت کا تقاضہ؟''

''بالکل لمحہ فکریہ ہے۔ ہاتھ میں موبائل ہو مگر ضرورت کے تحت ہونا چاہیے۔''

48 ''پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟''

''پورٹ گرینڈ جا کر سمندر کے کنارے کھانا کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے یا پھر ''دو دریا'' پر جا کر مزہ آتا ہے۔''

49 ''آئینے کو کتنا وقت دیتے ہیں؟''

''آئینے کو میں بہت وقت دیتا ہوں۔ مجھے تیار ہونے میں پورا ایک گھنٹہ لگ جاتا ہے۔''

50 ''شادی کرنا کیوں ضروری ہے؟''

''شادی کرنا ضروری ہے مگر اپنا کیریئر بنانے کے بعد۔''

51 ''ٹی وی ٹاک شو کے بہترین اینکر؟''

''مجھے اقرار الحسن بہت پسند ہیں اور وسیم بادامی کا انداز گفتگو بہت بھاتا ہے کیونکہ وہ اپنے مہمان کے ساتھ تمیز کا دائرہ نہیں چھوڑتے۔''

52 ''نصیحت جو بری لگتی ہے؟''

''وہ نصیحت بری لگتی ہے جو لوگ اپنی مرضی کو دوسروں کے سر تھوپنے کو نصیحت کہتے ہیں۔ وہ لوگوں کے اپنے فیصلے ہوتے ہیں۔''

53 ''جوائنٹ اکاؤنٹ یا سنگل اکاؤنٹ؟''

''پیسہ ہونا چاہیے۔ جوائنٹ یا سنگل میں کیا رکھا ہے۔''

54 ''ایک ڈیٹ جو آج تک یاد ہے؟''

''اگر آپ ڈیٹ والی ڈیٹ پوچھ رہی ہیں تو اس کو تو آپ گول مول کر دیں۔ شادی کی ڈیٹ یاد نہیں رہتی اور باقی بھی ڈیٹ یاد نہیں رہتیں۔''

55 ''ایک کھانا جو انی ٹائم کھایا جا سکتا ہے؟''

''بریانی اور پیزا۔''

56 ''اپنی پرفارمنس میں کیا کمی محسوس کرتے ہیں؟''
''کمی محسوس ہوتی ہے پہلے بہت زیادہ ہوتی تھیں۔ اب ذرا کم ہوتی ہیں۔ مگر میں اپنی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''
57 ''اپنا ڈرامہ دیکھ کر کیا سوچتے ہیں؟''
''ہائے کیا کمی ہے مجھ میں جو اتنے سال لگا دیئے زندگی کے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے دوسروں کے مقابلے میں بہت کام کر رہا ہوں۔''
58 ''کس چینل پہ ریموٹ رک جاتا ہے؟''
''کوئی خاص چینل نہیں ہے کچھ بھی اچھا لگ رہا ہو۔''
59 ''پہلی فلم جو سینما میں دیکھی؟''
''سعود کی فلم ''چوڑیاں'' دیکھی تھی۔''
60 ''کوکنگ یا کھانا کیا پسند ہے؟''
''کوکنگ تو بالکل بھی پسند نہیں ہے کھانا بھی پسند نہیں ہے۔ کھانا میں زندہ رہنے کے لیے کھاتا ہوں۔''
61 ''جن بھوت اور نظر لگنے پر کتنا یقین ہے؟''
''جن بھوت تو ایک حقیقت ہے ان کی اپنی ایک دنیا ہے اور نظر لگنے پر بھی میں یقین رکھتا ہوں۔''
62 ''سگنل پر کھڑے ہو کر کس چیز کا جائزہ لیتے ہیں؟''
''کیا جائزہ لینا۔ بس سگنل کھلے اور ہم جائیں۔''
63 ''بچپن میں کون سے فنکار پسند تھے؟''
''شاہ رخ خان اور ان کو دیکھ کر ہی اداکاری کا شوق ہوا اور اپنے پاکستان میں فیصل قریشی بہت پسند ہیں۔''
64 ''خواتین رائیٹرز میں پسندیدہ رائیٹرز؟''
''عمیرہ احمد اور ان کے ڈرامے میں، میں نے کام بھی کیا ہے۔''
65 ''بچپن میں کون کون سے گیم کھیلے؟''
''ماریو۔ اسنوکر۔''
66 ''شاپنگ کے لیے نکلتے ہیں تو پہلے کس کا خیال آتا ہے؟''



''بٹ کا خیال آتا ہے کہ کتنا ہے پھر جو پسند آتا ہے لے لیتا ہوں۔''
67 ''کب ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتے ہیں؟''
''جب مجھے نیا پروجیکٹ ملتا ہے۔ بہت خوشیاں مناتا ہوں۔ اور جب کوئی کام کی تعریف کرتا ہے تو۔''
68 ''کبھی چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنیں؟''
''اسپیشلی نہیں لیکن اگر کسی کمرے میں ہیں اور کوئی باتیں کر رہا ہے تو پھر سن لیتا ہوں۔''
69 ''تنہائی میں کس کو یاد کر کے روئے؟''
''جنہوں نے تکلیف دی ان کو یاد کر کے رویا ہوں۔ لوگوں کے غلط رویوں کو یاد کر کے رویا ہوں۔''
70 ''کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟''
''نجومی کو ہاتھ تو نہیں دکھایا بلکہ فال ضرور نکلوائی ہے۔ استخارے کروائے ہیں۔ اس ٹائپ کے کام میں نے بہت کروائے ہیں۔''

71 ''اگر کسی سیلیبرٹی کا انٹرویو کرنا پڑے تو آپ کا انتخاب؟''
''میرا انتخاب ''فیصل قریشی'' ہوں گے اور ہمایوں سعید۔''
72 ''نیند کتنی پیاری ہے؟''
''اتنی ہی پیاری ہے جتنی ضرورت ہے۔''
73 ''آپ کے گھر میں کون کون اس فیلڈ میں ہے؟''
''کوئی بھی نہیں سوائے میرے مگر شوقین بہت ہیں لیکن میں ایک مرد مجاہد ہوں جو بغاوت کرکے اس فیلڈ میں آیا۔ باقی کسی میں کرنے کی ہمت نہیں۔''
74 ''بچت کس شکل میں کرتے ہیں؟''
''بچت والے کام میں نے اپنی بیگم کے سپرد کیے ہوئے ہیں سارا حساب کتاب ان کے پاس ہوتا ہے۔ مجھے بھی جتنی ضرورت ہوتی ہے ان ہی سے لیتا ہوں۔''
75 ''شادی میں کن رسومات کے خلاف ہیں؟''
''رسومات ہونی چاہیں۔ اچھے اچھے کپڑے پہننے کا موقعہ ملتا ہے۔ انجوائے کرنے کا موقعہ ملتا ہے ملاقاتیں ہو جاتی ہیں اپنے لوگوں سے۔ تو مجھے بہت اچھی لگتی ہیں ساری رسومات۔''
76 ''ٹی وی کا کون سا پروگرام بند ہوجانا چاہیے؟''
''نیوز چینلز بند ہوجانے چاہئیں۔ انہوں نے بہت ٹینشن پھیلائی ہوئی ہے۔''
77 ''آج کی فکر زیادہ کرتے ہیں یا کل کی؟''
''آج اور کل دونوں کی فکر بہت کرتا ہوں، ٹینشن لے لیتا ہوں اور کل کی فکر زیادہ ہوتی ہے۔''
78 ''زندگی کب تقسیم ہوجاتی ہے؟''
''جب آپ کی فیملی بن جاتی ہے تو پھر اپنے سے زیادہ اپنی فیملی کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے۔ بہت سی خواہشات کو مارنا پڑتا ہے۔''
79 ''گھر میں مزاج کا کون گرم ہے؟''
''ابو بہت گرم ہیں چھوٹی چھوٹی بات پر غصہ آجاتا ہے۔ اب خیر پہلے سے کم ہوگیا ہے غصہ۔''
80 ''کس عمر میں موبائل فون ملا؟''
''جب ہم بڑے ہوچکے تھے تب موبائل آئے۔ ہماری عمر میں تو موبائل ہوتے ہی نہیں تھے۔ جب موبائل لینے کے قابل ہوئے تو ہم نے بھی لے لیا۔''
81 ''کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟''
''نشے کی حد تک تو نہیں لیکن مجھے ''کافی'' بہت پسند ہے۔ نشے کی حد تک صرف اداکاری پسند ہے۔''
82 ''دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟''
''کبھی دل کی تو کبھی دماغ کی، لیکن کسی چیز کا شوق ہوتا ہے تو وہ دل سے ہوتا ہے اور شوق پورا کرنا میرے لیے ضروری ہوتا ہے۔''
83 ''کیا چیز لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟''
''موبائل لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتا اور کہیں بھی جاؤں امی اور بیگم کو بتائے بغیر گھر سے نہیں نکلتا۔''
84 ''کھانا کھانا کہاں پسند ہے۔ بیڈ پر، ڈائننگ ٹیبل پر یا چٹائی پر؟''
''کھانا ہی تو کھانا ہے۔ کہیں بھی مل جائے۔''
85 ''بی پی ہائی ہوجاتا ہے جب؟''
''غصے کا میں تیز ہوں۔ ٹھنڈا بھی جلدی ہوجاتا ہے۔''
86 ''اچھی بری خبر پہلے کس کو سناتے ہیں؟''
''اچھی خبر تو فوراً امی کو بتاتا ہوں اور بری خبر بیگم کو کہ وہ سمجھ دار ہے۔''
87 ''غصے میں پہلا لفظ کیا نکلتا ہے؟''
''گالی ہی نکلتی ہے۔''
88 ''پسندیدہ تہوار؟''
''جب چھٹی مل جائے تو وہ پسندیدہ تہوار بن جاتا ہے۔''
☆ ''خوف آتا ہے؟''
''مرنے کے سین کرنا پڑتے ہیں، کردار کی ڈیمانڈز ہوتے ہیں لیکن کفن پہن کر اور دوسرے لوازمات کے

ہر جو سین ہوتے ہیں وہ میں بالکل بھی نہیں کرنا چاہوں
۔ مجھے بہت خوف آتا ہے۔"
89 "اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں یا دوسروں
سے؟"
"میں اپنے تجربے سے سیکھتا ہوں اور اپنی تربیت
کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"
90 "کبھی غربت میں وقت گزارا؟"
"ہماری تربیت اس انداز میں کی گئی کہ ہمیں کہا گیا
کہ محنت کرو اور اپنی خواہشات کو خود پورا کرو تو غربت
میں تو وقت نہیں گزارا مگر تربیت نے محنت کرنا ضرور سکھا
دیا۔"
91 "بریانی میں بوٹی نہ ملے تو؟"
"بریانی اتنے مزے کی ہوتی ہے کہ بوٹی نہ بھی ہو تو
گزارا ہو جاتا ہے۔ بس بریانی چٹ پٹی ہونی چاہیے۔"
92 "ڈرائیونگ کے وقت کون سا گانا زیادہ
سنتے ہیں؟"
"ویسے تو میوزک موڈ پر منحصر ہے۔ مگر پھر بھی میں
ہر میوزک سننا پسند کرتا ہوں۔ موڈ فریش رہتا ہے۔"
93 "ڈاکٹر، حکیم اور ہومیوپیتھک کس پر یقین
ہے؟"
"ڈاکٹر پر۔ ویسے بھی فیملی میں ڈاکٹرز بہت ہیں،
اس لیے ان ہی پر یقین ہے۔"
94 "پاکستان میں کیا چیز فری ہونی چاہیے؟"
"میڈیکل فری ہونا چاہیے کیونکہ ہر کوئی افورڈ نہیں
کر سکتا اور پاکستان میں میڈیکل بہت مہنگا ہوتا جا رہا
ہے۔"
95 "محفل میں بیٹھ کر موبائل استعمال کرنے
والوں کے لیے کیا کہیں گے؟"
"یہ تو اب ٹرینڈ بن چکا ہے محفل میں بیٹھ کر موبائل
یوز کرنا۔ مگر میں بہت احتیاط کرتا ہوں۔"
96 "موجودہ حکومت سے مطمئن ہیں؟"
اس کے بارے میں کیا کہوں بہت برے حالات
ہو گئے ہیں۔"
97 "ملک سے باہر جاب کی آفر آئے تو؟"
"باہر کی جاب کی آفر چھوڑ کر ہی یہاں بیٹھا ہوا
ہوں، اگر تعلیم ختم ہوتے ہی باہر چلا جاتا تو آج بہت اچھا
اسٹیبلش ہوتا۔"
98 "غصے میں آپ کا ری ایکشن؟"
"بہت شدید ہوتا ہے اور بعد میں جب احساس
ہوتا ہے تو میں سوری بھی بول دیتا ہوں۔"
100 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"ہر دن کے بعد رات ہے اور ہر رات کے بعد دن
ہے یہ ایک حقیقت ہے اور شہرت کو تو زوال آتا ہی ہے تو
اس دن کے لیے میں نے اپنا بزنس سیٹ کر کے رکھا ہوا
ہے۔"
☆

سائرہ رضا

یونہی بے سبب سا تذکرہ

لاک ڈاؤن کے بعد......آج......

یہ ایک ایسی صبح ہے۔ جس کی خاموشی......خشک و سرد ہوا اور نرم دھوپ کچھ لکھنے پر اکساتی ہے۔ کچھ بہت اچھا......بہت خاص......کاغذ بھی وہی ہے اور قلم بھی......وہی بیڈ پر میری مخصوص جگہ......کھلی کھڑکی......مگر شاید میں وہ نہیں رہی۔

آپ سب کی پیاری سدرۃ المنتہیٰ جیلانی نے ایک روز فون کیا۔

''کیا لکھ رہی ہیں آج کل آپ؟''

میں نے کہا ''کچھ بھی نہیں۔''

''کچھ بھی نہیں......کیوں آپ کے پاس تو دو چار پراجیکٹ ہیں، کیا وہ مکمل ہو گئے؟''

میں نے قہقہہ لگایا ''وہ پراجیکٹ لکھنا تھوڑی ہے ،وہ تو پیسہ کمانے کا ذریعہ ہیں۔ لکھنا تو کچھ اور ہوتا ہے؟''

''سدرہ شاک میں چلی گئی۔'' آپ اتنی صاف گوئی سے کیسے بول لیتی ہیں۔''

''اپنے منہ سے......ہاہاہا''

(قسم سے جتنے پیسے ڈرامے والے دیتے ہیں اس کے آدھے بھی ڈائجسٹ دیتا تو میں کبھی)

تو یہ کہ میں نے بہت عرصے سے کچھ نہیں لکھا اور یہ خلش ایک ڈپریشن بن کر مجھے اندھی کھائی میں دھکیل رہی ہے جہاں لکھاری مر بھی سکتا ہے۔

(آپ سوچیں گے، چھوڑ دو پیسہ کمانا......کوئی زبردستی ہے کیا......)

اس کا جواب آپ پر چھوڑتی ہوں......کیا چھوڑ دوں......کیا چھوڑا جا سکتا ہے)

جو ہم لکھ رہے ہیں۔ لوگ اسے کچرا کہتے ہیں۔ جو ہم لکھنا چاہتے ہیں۔

اسے کوئی گھاس نہیں ڈالتا......ریٹنگ کی تلوار سب کی گردنوں پر کھڑی ہے۔ مزے کی اور حیران کن بات......جن چیزوں پر اعتراض اٹھایا جاتا ہے۔ وہی سب سے زیادہ دیکھی جاتی ہیں۔

کوئی سر پھرے ان کے بیچ ہیں۔ جنہیں ہٹ دھرم بے وقوف بھی کہا جا سکتا ہے وہ اچھا کام لے بھی آئیں تو کوئی دیکھتا نہیں۔

خود کو زندہ رکھنا ہے تو......ہاں میں ہاں ملانی ہوگی۔

آج کل ہر جگہ ''ارطغرل'' کا ذکر خیر ہے۔ کیا بچہ کیا بوڑھا......کیا مرد کیا عورت اس کے دیوانے ہیں۔

جسے سرکاری سطح پر موٹ کیا جا رہا ہے۔ حکومتی ارکان کہتے ہیں۔ ''تاریخ پر ڈراما بنائیں۔''

مجھے بڑی ہنسی آئی......فرسٹ ایر سے فورتھ انٹرتک میرا مضمون تاریخ اسلام تھا۔ ساتھ سوشیالوجی اور اسلامک اسٹڈیز اور پولیٹیکل سائنس جس کو بتاتی'' اپنے مضامین کے بارے میں بتاتی اسلام پر ناک بھوں چڑھاتا۔

''یہ کیوں لیا......اس کا بھلا کیا اسکوپ ہو سکتا ہے۔ اس سے اچھا ایجوکیشن، سوشل ورک، انگلش لے لیتیں۔

میرے پاس کوئی مضبوط جواب وجواز نہیں تھا کہ میں نے کیوں یہ مضمون چنا بس مجھے تاریخ اچھی لگتی تھی۔

تاریخ کو پڑھنا......جاننا سوچنا

(اس کے باوجود میں اس مضمون کو بہت تفصیل سے نہ پڑھ پائی۔ جس کا افسوس ہے ویسے مجھے گھریلو عورتوں کی طرح یکم تاریخ بھی پسند ہے۔ تنخواہ کی تاریخ......پھوں......)

خیر تو تاریخ......اور اس پر تاریخ اسلام......اور اس میں بھی ترکوں کی تاریخ......جس کی تعریفوں میں یہ کس و ناکس ہلکان ہوا جارہا ہے۔ ان کا حسن، ان کی شجاعت (ان کے ڈرامے......)

ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ حسین تھے اور ہیں...... اور بہادر بھی تھے...... لیکن وہ وحشی تھے۔ جنگجو تھے۔ جاہل تھے۔ اور بے فیض بھی عبسی خلیفہ معتصم باللہ نے ایرانیوں کا زور توڑنے کے لیے ترکوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا۔ یہ تمام لوگ مملوک (غلام) تھے جو کہ وسط ایشیا اور افریقہ سے لائے جاتے تھے۔ اور اپنے ہم قوم افسروں کے ماتحت تھے۔ عباسی فوج میں ترکوں کی شمولیت سے وقتی طور پر مفید نتائج پیدا ہوئے۔ معتصم کو تمام فوجی مہمات میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ لیکن ترکوں کے ہاتھوں میں اقتدار دے کر معتصم اللہ نے بڑی سیاسی غلطی کی۔ یہ لوگ غیر مہذب تھے۔ ان میں اطاعت وفا شعاری اور نظم وضبط کا مادہ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے اقتدار سے ناجائز فائدے اٹھائے۔ جسے چاہتے اقتدار پر بٹھا دیتے۔ اتار دیتے۔

معتصم کے ہی زمانے میں دیبا کی وردیاں اور سونے کے ٹیکے بنے یہ بغداد کی گلیوں میں گھوڑے دوڑاتے اور کسی کے ٹھوکر کھانے کی انہیں ذرا پروانہ ہوتی تھی۔

معتصم کے بعد متوکل باللہ ترکوں کے عروج کو سلطنت کے لیے خطرناک خیال کرتا تھا۔

ترک اس بات سے واقف ہونے پر اس کے دشمن ہو گئے اور ایک رات محل میں گھس کر قتل کر دیا گیا۔

مستنصر باللہ کو شاہی طبیب کے ساتھ مل کر زہر آلود نشتر کا نشانہ بنایا گیا۔

معتز باللہ کو ترکوں نے محل سے گھسیٹ کر باہر نکالا دھوپ میں کھڑا کر کے زدوکوب کی اور بعد میں اسے قید کر کے مارا گیا۔

حکمرانوں اور اپنے ناپسندیدہ لوگوں کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیر دینا بھی ترکوں کا پسندیدہ مشغلہ رہا۔ قاہر باللہ کے ساتھ یہی کیا گیا۔

تاریخ بہت طویل ہے اور صفحات بہت کم......

(ترک عثمانیہ پر پھر کبھی بات کی جاسکتی ہے۔ یا زیادہ مناسب یہ ہوگا کہ ترک عثمانیہ کے کارنامے "دیکھنے کے بجائے پڑھے جائیں۔ ہاں پڑھنے میں گلیمر کا عنصر کم ہوگا۔

تاریخ کے مضمون کو پڑھنا بعض لوگ خشک تصور کرتے ہیں۔

شاید اسی لیے تاریخ کو دکھانے اور عوام کو رجھانے کے لیے اسے رنگین کرکے پیش کیا جارہا ہے۔ اور سراہا جا رہا ہے۔

پچھلے دنوں امی نے کہیں پڑھا جملہ مجھے سنایا اور میں اش اش کر اٹھی۔

"تاریخ کا تو پتا نہیں...... البتہ ہمارے ہاں کے مرد وہاں کی عورتوں کے حسن کو دیکھ کر سراہ رہے ہیں۔ تو ساتھ ہی ہماری عورتیں بھی اسیر ہو رہی ہیں۔"

(طمانچہ......ٹھاہ......)

دراصل تاریخ تو وہی ہے جو نجانے کتنے سالوں سے لائبریوں کی الماریوں کے گرد آلود شیشوں کے پار دیمک کے ہاتھوں مٹتی جا رہی تھی۔

بس یہ ہوا ہے کہ تاریخ کو کمرشل کر دیا گیا۔ ڈیٹ اپ ڈیٹ ہوگئی۔

(مجھ سے کوئی پوچھے تو میں تاریخ کے نام پر سب سے مستند ڈراما "باادب، باملاحظہ، ہوشیار کو مانتی ہوں)

اس سارے معاملے کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ سرکاری اعلان و پسندیدگی۔ عوام کی شدید پذیرائی کے باوجود کوئی بھی چینل یا پروڈکشن ہاؤس تاریخی ڈراما بنانے میں ذرا دلچسپی نہیں رکھتا۔

حالانکہ میں انہیں بتانا چاہتی ہوں کہ ہماری اپنی برصغیر پاک و ہند کی تاریخ بیک وقت رنگین، غمگین، نمکین، سنگین اور بہترین ہے۔ سادہ الفاظ میں بارہ مسالے کی چاٹ سمجھ لیں۔

آہ......آہ......آہ

میں سوچتی ہوں ہم ہمیشہ سے پانی رہے جس برتن میں ڈالا۔ اس کی شکل اختیار کرلی۔ ہمارے سابقہ حکمراں ولوابین وجاگیردار انگریزوں اور انگلستان سے متاثر رہے۔ ان سب نے انگریز جیسا ہونے کے لیے سردھڑ کی بازیاں لگائیں۔ کالے منہ والے گورا صاب...... اونہہ......

میں نے ہوش سنبھالا تو چائنیز کھانے تھے۔ سوپ، رائس اور چاؤمن سرکار کی سرپرستی میں ترانہ زبان زد عام ہوا۔ پاک چین پوئی وان شوئے۔ وان شوئے وان شوئے۔

پھر پزا آگیا......اٹالین کھانے

اور اب سرکار ترکوں کے پیچھے لگ گئی ہے۔ اور عوام کو بھی لگا دیا ہے اگر آپ کے پاس چار پیسے آگئے ہیں تو پہلا دورہ ترکی کا......

یہ نیا ٹرینڈ ہے ورنہ تاریخ تو مکلی کا قبرستان بھی ہے۔ لاہور کے دروازے...... اور اولڈ کراچی کی وہ عمارتیں جن پر بجلی فون نیٹ کی تاروں کے جال کسی پاگل سو سالہ بڑھیا کے چہرے پر جھولتی جٹاؤں کا منظر پیش کرتے ہیں۔

دوسروں کی شرافت، شراکت، وجابت، صداقت، عدالت اور وکالت کے بجائے اگر اپنی تاریخ کے چہرے پر لگی گرد جھاڑ لی جائے۔

تو اندر سے شان شوکت، عظمت و مرتبہ، جاہ و جلال بمعہ کمال زوال، حسن دل بری......خواہش و سازش...... علم و فن......فن......عمل......اتار چڑھاؤ اور گھماؤ۔

آغاز سے انجام تک کی ایسی شکل نکلے گی۔ جس میں مقام فیض کے ساتھ ساتھ......مقام عبرت کے اسباق بھی ہوں گے۔

"عبرت! جو عام طور پر وقت گزر جانے کے بعد آتی ہے۔

میں ارطغرل نہیں دیکھتی اس لیے کہ میں نے اس کو تب پڑھا تھا جب لوگ کہتے تھے۔ تاریخ اسلام کیوں لی۔۔

اس کا بھلا کیا اسکوپ

یونہی برسبیل تذکرہ...... ذرا بات سن...... کچھ قریب آ۔



قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ بہت سے علاقے لاک ڈاؤن کی زد میں ہیں جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔ ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو مارچ یا جون کا پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/70 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بنک اکاؤنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر 03172266944 میں رقم بھیج کرسکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ 840 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام ''عمران ڈائجسٹ، اکاؤنٹ نمبر 0010000015680030، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے PK44ABPA0010000015680030'' کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو 500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک 500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

فی ڈائجسٹ ایشیا، افریقہ، یورپ 18,000 روپے، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا 20,500 روپے،

کسی بھی معلومات اور آڈر کے لیے اس واٹس ایپ نمبر 03172266944 پر رابطہ کریں

عفت سحر طاہر

رنگ دے میرے

ہائی وے پر ٹرالر اور کار کا شدید ایکسیڈنٹ ہوتا ہے ٹرالر کا ڈرائیور بھاگ جاتا ہے، کار بری طرح پچک جاتی ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا مرد اور اگلی نشست پر ہی بیٹھی عورت خون میں لت پت ہیں۔ ریسکیو عملے کا انتظار ہے کہ وہ آ ئے تو گاڑی کی باڈی کاٹ کر لاشیں نکالی جائیں اسی وقت گاڑی سے ایک بچے کے رونے کی آواز آتی ہے۔

ہاسپٹل میں چار لوگ آئی سی یو کے باہر بیٹھے ہیں نرس باہر آ کر کہتی ہے آپ کے پیشنٹ کو ہوش آ گیا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

سرخ پھولوں سے سجی گاڑی پوش ایریا کے ایک بنگلے کے آگے رکتی ہے تو۔ دولہا کی ماں ملازمہ سے کہتی ہے کہ دلہن کو لے کر اندر آؤ۔ ملازمہ دلہن کو بیڈ روم میں بٹھا کر جانے لگتی ہے تو دلہن اس سے سر درد کی گولی مانگتی ہے۔ ملازمہ کہتی ہے کہ چائے بھی لے آؤں۔

دولہا کمرے میں آتا ہے۔ تو وہ اس کی شکل دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ وہ ایک بچی کو لے کر آتا ہے کہ اس کے لیے میں نے تم سے شادی کی ہے۔

نرمین کو ہواؤں میں اڑنے اور اونچے خواب دیکھنے کا شوق ہے حریم اس کی چھوٹی بہن اسے سمجھاتی ہے۔

نرمین کی سہیلی سجل کہتی ہے کہ تمہیں عباد وسیم پوچھ رہا تھا۔

نرمین اپنی دوست صوما کی سالگرہ میں جانے کی ضد کرتی ہے لیکن اس کی اماں کو اعتراض ہوتا ہے کہ جوان جہان لڑکی آدھی رات کو سالگرہ میں سے واپس آئے گی تو محلے والے کیا کہیں گے۔ اس کے اصرار پر ابا سے جانے کی اجازت





دے دیتے ہیں لیکن اس کی اماں ناراض ہی رہتی ہیں۔
زمین صوما کی سالگرہ کی تقریب میں (جو کہ تھیم پر تھی) گھر سے تیار ہو کے نہیں جاتی بلکہ سجل کے گھر سے تیار ہو کر جاتی ہے۔
راستے میں سجل رانا سعید سے عباد وسیم کے متعلق بات کرتی ہے کہ رانا سعید عباد کا دوست ہے وہ عیاد سے زمین کی دوستی کرادے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنی دوست کو بربادی کے راستے پر مت ڈالو۔ پارٹی میں زمین کی عباد سے ملاقات ہوتی ہے لیکن وہ یمنی الطاف کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگلی ملاقات میں سجل بتاتی ہے کہ عباد وسیم، رانا سعید سے تمہارا پوچھ رہا تھا۔ زمین بے یقین ہوتی ہے۔
وہ اپنے حواس میں نہیں تھی فیملی ڈاکٹر فریحہ کی ولیمے کی صبح اس کا چیک کرنے آیا تو اس نے کہا کہ شاکڈ اور ڈپریسڈ ہیں۔ میڈیسن دیں آرام کرائیں شام تک بہتر ہو جائیں گی۔
سجل زمین کو آفس کے بعد لے کر کلب آجاتی ہے زمین کا موڈ آف ہے۔ وہاں ان کی ملاقات عباد وسیم سے ہوتی ہے۔ دونوں کے درمیان رکھائی سے بات چیت ہوتی ہے۔ عباد وسیم ان کے جوس کا بل ادا کر دیتا ہے۔ زمین کو برا لگتا ہے۔
نصرت زلفی کو کہتی ہیں کہ اٹھ کر دکان پر چلا جا لیکن وہ نہیں سنتا۔ وہ زمین کی ہم راہی کا خواب دیکھتا ہے نصرت کہتی ہیں کہ وہ پڑھی لکھی لڑکی تجھ سے شادی سے انکار کر دے گی۔ زلفی کہتا ہے کہ وہ میرے بچپن کی منگ ہے۔
زمین کے پاس چھٹی والے دن عباد کا فون آتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ دن گزارنا چاہتا ہے۔ زمین، سجل کے گھر کا بہانہ کر کے اس کے بتائے ہوئے ریسٹورنٹ میں اس کا انتظار کرتی ہے۔
عباد وسیم کے ساتھ ایک بھرپور دن گزار کر زمین خوشی خوشی گھر لوٹ آتی ہے۔ زمین کو اس کی کھوجتی چمکتی آنکھوں کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا۔
زمین کی غیر موجودگی میں اماں کے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ حریم ابا کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے زمین کو فون کرتی ہے، فون بند ہونے کی صورت میں وہ تھک ہار کر سجل کے نمبر پہ کال کرتی ہے، اسے مبارک باد دیتی ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہے کہ کس چیز کی مبارک باد اور اپنے گھر میں صبح سے کپڑے دھونے کی مظلومیت کا رونا روتی ہے۔ حریم پریشان ہو جاتی ہے۔ ابا آجاتے ہیں وہ اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔
زمین کے آنے پر حریم اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کہاں تھی، زمین سچ اسے بتا دیتی ہے۔
عباد وسیم، رانا سے ملتا ہے تو زمین کی بات ہوتی ہے، رانا کہتا ہے کہ وہ شریف گھرانے کی ہے اس کو بخش دے۔ عباد ہنسنے لگتا ہے۔
مائرہ صبح صبح پھپھو کے گھر پہنچتی ہے جہاں عباد وسیم اور نزہت ناشتہ کر رہے ہیں۔ مائرہ اور نزہت کی معنی خیز باتوں سے انجان بنا عباد وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا ہے۔
حریم بے ساختہ میرب کو پیار کرتی ہے، وہ گھبرا جاتی ہے۔
نزہت گھر واپسی پر حریم کو کہتی ہیں کہ وہ میرب کے سلسلے میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کریں گی۔
حریم عباد کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اس کے شوروم تک آجاتی ہے عیاد اسے دھمکاتا ہے وہ اس سے کہتی ہے کہ تم خراب کیریکٹر کے ہو۔ میری بہن کا پیچھا چھوڑ دو۔ زمین پتا چلنے پر ناراض ہوتی ہے اور عباد سے معذرت کرتی ہے وہ معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔
مارک ڈینیل کو بتاتا ہے کہ اس کی مسلمان لڑکے سے دوستی ہے۔ نصرت پھپھو تاریخ طے کرنے کے لیے مٹھائی اور شادی شدہ بیٹی کو لے کر آتی ہیں۔ زمین گھر میں نہیں ہوتی۔
حریم کو وہ اس کے گھر لے کر آتا ہے اماں اور طوبیٰ بہت خوش ہوتی ہیں لیکن ابا کے آنے سے پہلے اسے جانے کا کہتی ہیں۔
عباد کی برتھ ڈے کے موقع پر عباد زمین کو اپنے فلیٹ پر تنہا بلاتا ہے، وہاں جانے کے بعد زمین کو باپ کی بات یاد آتی ہے کہ دو نامحرموں کے بیچ تیسرا ہمیشہ شیطان ہوتا ہے۔
عباد زمین کو اپنے فلیٹ پر بلاتا ہے۔ اس کے قریب آنے پر وہ وہاں سے واپس آجاتی ہے۔ عبد کی پرکھ کہ وہ پورا اترتی ہے۔ ادھر نصرت پھپھو تاریخ لینے آجاتی ہیں۔ اماں اور حریم کے پوچھنے پر زمین شادی کی ہامی بھر لیتی

ہے۔ نصرت پھپھو اور زلفی خوش ہو جاتے ہیں۔ سجل فون کر کے زمین کو لاتی ہے۔ وہاں عباد وسیم موجود ہوتا ہے اور
سے پروپوز کرتا ہے۔ زمین خوشی خوشی گھر آتی ہے۔
رات میں حریم نریم سے کہتی ہے کہ شادی کا کارڈ پسند کر لو۔ وہ کہتی ہے پہلے لڑکا تو پسند کر لوں۔ پھر اسے
تی ہے کہ عباد وسیم نے اسے پروپوز کیا ہے۔ دروازے میں کھڑی اماں یہ سن کر بے سدھ ہو کر گر پڑتی ہیں۔

بارہویں قسط

میں وہی ہوں
نظر بھر کے دیکھو ذرا
سارے خوشحال موسم بھی جس نے فقط!!
پچھلے زخموں کی بے کل اداسی میں کاٹے
جس کی آنکھوں نے بس ایک چہرے کے عکس منور کو دیکھا
سنبھالے رکھا
جس کے ہاتھوں نے اک لمس آخر کو صدیوں بچانے کی خاطر
کسی کو چھوا تک نہیں

میں وہی ہوں
نظر بھر کے دیکھو ذرا!!

''تم آخر چاہتی کیا ہو؟ میں کسی کے پاس نہ جاؤں یا کوئی میرے پاس نہ آئے؟''
اس کے ہاتھوں کی گرفت میں حریم کی سانس حلق میں ہی کہیں اٹکی رہ گئی، وہ اس کی گھنی پلکوں والی سیاہ آنکھوں کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا لیکن یہ پل بھر کا ہی کھیل تھا، اسی وقت زور سے دروازہ بجنے اور مائرہ کے بولنے کی آواز آئی۔
''اب آ بھی جاؤ۔ پانچ منٹ پہلے تو تم لیٹ ہو رہے تھے۔ بس دو منٹ کا کہہ کر آئے تھے۔ اب تمہیں دیر نہیں ہو رہی۔'' وہ یقیناً اسے گھٹنوں کے بل گرنے اور پگھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ حریم کے ہاتھوں پہ اس کی گرفت ڈھیلی پڑی۔
''آ رہا ہوں یار۔'' وہ اونچی آواز میں کہہ کر بعجلت واپس پلٹ گیا۔ یہ دیکھے بنا کہ اس کے لمس سے منجمد ہو چکی شہزادی ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ وہ سوئی ہوئی میرب کی پیشانی چوم کر حریم کو اللہ حافظ کہتا باہر نکل گیا تھا۔
''کیا چاہتی ہو۔ میں کسی کے پاس نہ جاؤں یا کوئی میرے پاس نہ آئے۔'' حریم اس کے شرارتی سے سوال کی بازگشت کو اپنے اردگرد چکراتے ہوئے محسوس کرتی ششدر تھی کہ اپنی خوشیوں کے دشمن اپنے رشتوں کے قاتل سے واقعی ''وہ کیا چاہتی تھی؟''
میرب کے کسمسانے پر وہ چونک کر حواسوں میں لوٹی اور تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ لیکن دھیان کے سارے تار اسی خیال سے جڑے تھے کہ آج مائرہ اس کے آفس میں ہوگی۔
(میرے سارے رشتے ختم کروا کے خود نئے رشتے جوڑ رہے ہو۔ ایسا تو میں ہونے نہیں دوں گی) وہ مسلسل تکلیف دہ سوچوں کے ایک گرداب میں پھنسی تھی۔

☆☆☆

''مائنڈ مت کرنا لیکن تمہاری مسز کو مینرز سیکھنے کی اشد ضرورت ہے۔'' وہ دونوں گاڑی میں آ کر بیٹھے تو مائرہ نے منہ پھلا کر سینے پر بازو لپیٹتے ہوئے شکایت کی۔ اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے وہ کھل کر مسکرایا۔

''خیر۔ مہمان کو چائے پوچھنا گڈ مینرز ہی میں شمار ہوتا ہے۔'' مائرہ تپی۔
''تم اس سے کہو کہ مجھ سے مخاطب بھی نہ ہوا کرے۔ زہر سے بری کوئی شے لگتی ہے مجھے۔''
''ہمم......'' وہ گاڑی گیٹ سے نکالتے ہوئے مین روڈ پہ آ گیا۔ اس نے مائرہ کے اتنے سخت جملے پہ کوئی ری ایکشن نہیں دیا تھا۔ مائرہ نے جزبز ہو کر پہلو بدلا۔
''پھپھو بتا رہی تھیں میرب کے ساتھ بھی کوئی خاص اچھا سلوک نہیں کرتی؟''
''پتا نہیں۔ شاید کوئی مس انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ہے۔ مجھے لگتا تو نہیں کہ وہ ایسا سلوک کر سکتی ہے میرو کے ساتھ۔''
''پردے مت ڈالو۔'' مائرہ تلخ ہوئی۔
''ایک غلط فیصلے کے نتیجے میں ہونے والی بدمزگیاں تم دیکھ ہی چکے ہو اور آئندہ شاید اس سے بڑھ کر ہو۔''
''ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ تم فکر مت کرو۔ میرب کے پاس میں بھی تو ہوں۔'' وہ پریقین انداز میں بولا۔
''ہاہ۔ تم......تم تو اب اس کی نئی ماما کے دولہا بن چکے ہو بس۔'' مائرہ نے تمسخر اڑایا تھا۔
''تم سے شادی کے بعد بھی یہی عہدہ ملتا شاید۔'' وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔
''شٹ اپ۔'' مائرہ اسے گھور کر کہتی ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔
''میں کچھ بھی ہوتی، میرب کی سوتیلی ماں نہ بنتی۔ جیسے کے وہ بن رہی ہے۔'' ملول سے انداز میں مائرہ نے کہا تو اس کے دل کو کچھ ہوا۔ کیا خبر حریم اس پھول سی بچی کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہو۔ وہ تو حریم پہ اعتماد کر کے میرب کو اس کے حوالے کر کے آ جاتا تھا۔
''اللہ خیر کرے۔'' اس نے گہری سانس بھری۔
''میں نے تم سے کہا تھا مائرہ! لیکن تمہاری ترجیحات کچھ اور ہی تھیں۔ زندگی بار بار موقع نہیں دیا کرتی۔''
''تم اچھی طرح جانتے تھے میری ضدی طبیعت کو۔ پھر کیوں اتنی شرائط کے بدلے اپنا آپ رکھ دیا؟ میرب کو پالو گی تو انعام میں مجھے حاصل کر سکو گی ورنہ نہیں۔'' اس کی آنکھوں کے زیریں کنارے سرخ ہونے لگے۔
''تو......کیا ہو جاتا مائرہ! ایک بچی ہی تو تھی۔'' وہ تاسف سے بولا۔
''اس بچی سے پہلے اس کی ماں بھی تھی۔ تم بھول رہے ہو کہ میری زندگی میں تباہی اس کی ماں نے مچائی۔ پھر تم اس بچی کو ہمارے بیچ لے آئے۔ مجھے تو مکمل زندگی، مکمل خوشیاں کبھی ملی ہی نہیں۔'' وہ تلخی سے بولی۔
''خوشیوں کو ڈھونڈنا پڑتا ہے مائرہ! یہاں کون ہے جسے مکمل زندگی اور پوری خوشیاں ملی ہوں۔ ہماری زندگی بھی آدھی ادھوری ہی ہے۔ مل کر پوری ہو سکتی تھی، لیکن خیر......اب موو آن کا وقت ہے۔'' وہ رک کر قدرے مسکرایا۔
''وہ وقت تو اب گزر گیا۔ حریم کو میری زندگی میں آنا تھا وہ آ چکی۔''
''ہونہہ......!'' مائرہ نے نخوت سے سر جھٹکا تھا۔
(دیکھتی ہوں کب تک رہتی ہے تمہاری زندگی میں)

☆☆☆

سجل کو اتنے عرصے کے بعد سامنے دیکھ کر زمین پہلے تو حیران و پریشان ہوئی پھر اس سے لپٹ گئی۔
''کتنی کمینی ہو تا۔ اتنے عرصے بعد شکل دکھائی۔ میں تو سوچ رہی تھی شادی کر کے مر کھپ گئی ہو گی کہیں۔ نہ کوئی کال نہ رابطہ۔ فون، واٹس ایپ سب بند۔''
''دھیرج......دھیرج......'' سجل نے ہنستے ہوئے میرب کو گود میں لیا تھا۔
''بس کچھ نہ پوچھو۔ زندگی جیسے اس گزرے سال میں زیر و زبر ہو گئی ہے اور شادی نہیں ہوئی بلکہ شادی کا

رڈ دینے آئی ہوں۔''
''شکر اللہ کا۔ تمہارے والے کو بھی خیال آیا کہ رخصت کروالے تمہیں۔'' زرمین نے اس کے رخسار پہ چٹکی
ری۔ چھ سات ماہ بعد اس سے ملاقات ہو رہی تھی۔
''تم سناؤ۔ کیسی گزر رہی ہے؟ مسٹر سیٹھی کیسے ہیں؟ تبدیلی قائم ہے یا واپس اپنی دنیا میں لوٹ چکے؟'' سجل
سے چھیڑ رہی تھی۔
''سب اے ون ہے ماشاء اللہ۔ اور اتنی حسین بیوی پا کر کون واپس لوٹے گا۔'' زرمین اوپن کچن میں برنر جلا
لر چائے کا پانی رکھتے ہوئے ناز سے مسکرائی۔
''یہ تو ہے۔ بڑی مشکل سے پایا ہے اس نے تمہیں، اور قربانی بھی دی اپنے رشتوں کی۔'' سجل نے میرب کو
لدگداتے ہوئے اونچی آواز میں اعتراف کیا تو پتی کا ڈبہ اپنی جگہ پہ واپس رکھتے زرمین کے ہاتھ ٹھٹک گئے۔
''قربانی تو میں نے دی ہے صحیح معنوں میں۔ وہ تو مرد ہے۔ شام کو واپسی پہ ماں باپ سے مل کے آجاتا
ہے۔ دل لگی کے لیے یہاں بیوی بچی بھی موجود ہیں۔ مسئلہ تو میرا ہے سجل! لڑکیوں کے ماں باپ تو دلوں پہ پکے
تالے لگا کر معافی کی چابی گم ہی کر دیتے ہیں۔'' وہ چائے کے مگ سجل کے سامنے آبیٹھی۔
''آہستہ آہستہ رابطے کی کوشش کرو۔'' سجل نے اس کا دکھ محسوس کرتے ہوئے مشورہ دیا۔ پھر آزردگی سے بولی۔
''لڑکیوں کے پیچھے ان کی باقی کی نسل رل جاتی ہے یار! ایک کا کیا، باقیوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ بیٹیوں کی بخشی
'ہار' والدین کو ساری عمر یاد دلائی جاتی ہے۔ والدین کا دکھ پرانا ہی نہیں ہونے دیا جاتا تو وہ بے چارے اتنی
جلدی معاف کیسے کریں۔''
زرمین چپ رہ گئی۔
''خیر...... ابھی تو فی الحال میری شادی میں شرکت کی تیاریاں کرو۔ جو کہ بڑی مشکل سے وقوع پذیر ہونے
جا رہی ہے۔'' سجل نے ہنستے ہوئے اس کا موڈ بدلنے کی سعی کی۔
''حریم آتی ہے یہاں مجھ سے ملنے۔'' زرمین کے بتانے پر وہ خوش ہوئی تھی۔
''ارے واہ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے اب باقی گھر والے بھی جلد ہی مان جائیں
گے۔'' سجل نے خوش فہمی میں گھرتے ہوئے پوچھا۔
''ابا نے میری جگہ اس کی بات طے کر دی ہے زلفی کے ساتھ۔'' زرمین نے لمحہ بھر اسے دیکھ کر تکلیف سے
کہا۔ تو سجل کی مسکراہٹ گم ہو گئی۔
''واٹ......؟'' اسے جھٹکا لگا تھا۔
''اس نے انکار کیوں نہیں کیا یار! یہ فرماں برداری ثابت کرنے کا کون سا انداز ہے بھلا۔'' سجل جز بز
ہوئی۔ ''ایک تو ہمارے معاشرے کی یہ سوچ۔''
''بس...... وہی...... ایک بیٹی کے کرم کی سزا باقیوں کو۔'' زرمین دکھ سے مسکرائی۔
''بڑے افسوس کی بات ہے ویسے یار! یہ زلفی کون سا ڈاکٹر، انجینئر لگا ہوا ہے جو ایک بیٹی تو اس کے نکاح
میں لازمی دینی ہی دینی ہے۔'' سجل نے تاسف سے کہا۔
''بس......'' زرمین گہری سانس بھر کے اٹھی۔
''یہی دنیا ہے۔ مجھ سمیت سب ہی کو بس اپنے اصول اپنی ضد پیاری ہے۔ دوسروں کے جذبات نہیں۔''
سجل اسے دیکھ کر رہ گئی۔
''تم خود جاتیں، بات کرتیں اماں ابا سے۔'' سجل کو دکھ ہوا۔

"جو مجھے کنویں میں دھکیلنے پر راضی تھے ان کے لیے ایک بیٹی کیا تو دوسری کیا۔" وہ آزردہ سی مسکرائی۔
"خیر۔ یہ تو سراسر ظلم ہے حریم بے چاری پر۔" سجل نے میرب کو اٹھا کر پرام میں ڈالتے ہوئے سیٹ بیلٹ لگائی۔
"تم جاؤ اور بات کرو اس کے حق کے لیے زمین! اب تم ایک مضبوط پوزیشن میں ہو۔ عباد وسیم سیٹھی کی بیوی ہو۔ تمہاری بات میں دم ہوگا، وزن ہوگا۔" سجل نے پورے خلوص سے اسے مشورہ دیا تھا زمین گہری سانس بھرتی مسکرا کر اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

☆☆☆

زلفی چوٹ کھائے ناگ کی طرح بل کھا رہا تھا۔
"میں اسے ساری زندگی معاف نہیں کروں گا تم دیکھنا اماں! مامی نے تو شہ دے دے کر سر پہ چڑھا رکھا ہے اسے۔ اسی لیے اتنی منہ زور اولاد ہے ماموں کی۔" ماں نے آکر ممانی کی دھمکی سنائی تو زلفی نے تڑپ کر کہتے ہوئے منہ بنایا۔
"بکواس بند کرلے اپنی۔ اور بندے کا رنگ کالا ہو مگر کرتوت کبھی کالے نہ ہوں پتر! تجھے کہا کس نے تھا یہ شکل لے کے اسے کالج سے لینے پہنچ جا۔ اچھی خاصی بنی ہوئی اپنی عزت رول کے رکھ لی۔" زاہدہ بھی بیزار تھیں۔
"اماں! میں کہہ رہا ہوں کہ اپنی بھتیجی کی رخصتی کی تیاری پکڑو۔ ورنہ اس کے تیور بھی بڑی والے ہی دکھائی دے رہے ہیں مجھے۔" زلفی نے دانت کچکچائے۔
"تو کسی پاسے لگ تو سہی۔ ایک اسٹور تو سنبھالا نہیں جا رہا تجھ سے۔ کس بنیاد پہ رخصت کروا لاؤں اسے۔ اس کا بھی خرچا اٹھانا پڑا تو تیرا ابا چار جوتے لگا کر ہم تینوں کو گھر سے باہر پھینک دے گا۔" زاہدہ نے اسے گھورا۔
"اماں! میری پیاری اماں! بس ایک بار تو یہ بات منوا لے ابا سے۔ ساری عمر اسٹور ہی سنبھالوں گا۔" زلفی ماں کو مکھن لگا رہا تھا لاڈ سے زاہدہ کے گلے میں بانہیں ڈالیں تو اس نے پیچھے جھٹک دیا۔
"دفع دور خبردار...... جواب اپنے پیروں پہ کھڑے ہوئے بنا نام بھی لیا حریم کا۔ اور اتنا سمجھ لے زلفی! یہ دنیا کی آخری پڑھی لکھی اور خوب صورت لڑکی ہے جو شاید قسمت سے تجھے مل جائے۔ یہ نہ ملی تو کوئی بھی مفلس میٹرک فیل اور عام سی شکل کی لڑکی ملے گی۔" زاہدہ نے صاف گوئی کا شان دار مظاہرہ کیا تو زلفی منہ بنا کر دل ہی دل میں اللہ نہ کرے کا ورد کرنے لگا۔
یہی بات اپنے جگری یار رفیق عرف فیقے پان والے کو بتائی تو اس نے اپنی کمزور پسلیوں والے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بڑھک ماری۔
"مجھے بتا زلفی! چک کے ہی نہ لے آنا پڑتا۔ اسے بھی پتا چلتا۔ زلفی کی پاور کا۔"
"اوئے دفع کراوئے! پہلے ہی کیا کم مار پڑی ہے محض موٹر سائیکل پہ بٹھانے کے پیچھے۔" زلفی بددل ہوا۔
"ایک پان لگا ذرا کتھے چونے والا۔"
"حد ہے ویسے یار! ایسی میسنی لڑکیاں ہوتی ہیں جو ہوتی زمانے بھر کی تیز طرار ہیں لیکن گھروں میں سر پہ دوپٹے ڈال کے پھرتی ہیں جیسے ان سے زیادہ شریف کوئی اور نہ ہو۔" رفیق کے ہاتھ تیزی سے پان بنانے میں مصروف تھے اور زبان باتیں بنانے میں۔
"بس یہ بھی ایسی ہی ہے۔" زلفی نے اس کی تائید کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے پان لے کر منہ میں ڈالتے ہوئے بے دلی سے کہا۔ درحقیقت حریم کے ردعمل نے اسے جی بھر کے مایوس کیا تھا۔
"دھیان رکھیو۔ پہلی والی بھی ایسے ہی پھسل گئی تھی ہاتھ سے۔ اب اسے گنوایا تو وہ موٹے شیشوں کی عینک والی نصرت ہی بچے گی پھر۔" رفیق خباثت سے مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے الٹی میٹم دے رہا تھا۔

’’تو دیکھتا جائیو۔ تیرے بھائی کی قسمت بڑی تیز ہے۔ یہ والی تو کسی قیمت نہ جانے دوں گا۔ کل ہی بیٹھتا ہوں جا کر اسٹور پر۔ دیکھتا ہوں ابا کیسے چھ مہینے سے پہلے میری شادی پہ راضی نہیں ہوتا۔‘‘

زلفی نے دوسرا پان میٹھا بنوایا تھا۔ پان منہ میں ڈال کر بالوں سے ہاتھ صاف کرتا ’’حساب کھاتے میں لکھ لے‘‘ کہتا وہ بے نیازی سے چل دیا تو رفیق اسے اونچی آواز میں گالی دے کر رہ گیا۔

اور یہی بات رات زلفی نے ابا سے کہی تو وہ پہلے تو بے یقینی سے اسے دیکھتے رہے۔ پھر جلبلا کر بولے۔

’’کہیں میرا اسٹور بیچنے کا ارادہ تو نہیں ہے کم بخت مارے؟‘‘ ان کا دماغ دور کی کوڑی لایا تھا کہ زلفی جیسے ہڈحرام سے وہ اچھائی کی توقع تو کبھی بھی نہ رکھتے تھے۔

’’دیکھ لے اماں! کام نہ کروں تو ہڈحرام۔ کرنا چاہوں تو چور ڈاکو۔‘‘ زلفی ان کی بے اعتباری پر اپنی جگہ تلملا کر رہ گیا۔

’’اے ہائے۔ مذاق کر رہے ہیں تجھ سے۔ چل میرا بچہ۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ صبح وقت پہ جگا دوں گی میں تجھے۔ اچھا ہے نا احساس ذمہ داری پیدا ہوگئی ہمارے بچے میں۔‘‘ زلفی کو آنکھ کے اشارے سے اندر بھیجتے ہوئے زاہدہ نے منہ میں گویا شیرینی بھر کے پھوپھا کے سامنے تعریف کی۔

’’آہم۔‘‘ انہوں نے طنزیہ ہنکارہ بھرا۔ ’’جو احساس پیدا ہوا ہے نا اس کے اندر، وہ میں اچھی طرح سے جان گیا ہوں۔ صبح چابیاں دے کر مجھ سے پہلے اسے بھیجنا اسٹور پہ۔ ذرا جھاڑو پوچا کرے پہلے، پھر گاہکی شروع ہوگی۔ اسے بھی پتا چلے شادی کی ذمہ داری کے قابل کیسے ہوا جاتا ہے۔‘‘ شوہر کی تلخ و تند باتیں سن کر زاہدہ تو منہ بنا ہی رہی تھی۔ اندر کمرے میں سن گن لیتا زلفی بھی اپنے بال نوچنے کو ہو رہا تھا۔

(یہ ابا بھی نا...... معجزہ ہی ہے جو میری شادی ہونے دی جائے)

ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے وہ تمام ’’اچھی باتیں‘‘ سوچنے لگا جو اپنے اندر پیدا کر کے چھ ماہ کے اندر اندر ابا کو مجبور کر دیتا کہ وہ حریم اور اس کی شادی خانہ آبادی پر راضی ہو جاتے۔

’’پھر دیکھنا حریم مصطفیٰ! تم سے تمہارے ہی نہیں، تمہاری بہن والے سود بھی چکواؤں گا۔‘‘ وہ زہریلے انداز میں مسکرایا تھا۔

☆☆☆

لے آئی پھر کہاں پر قسمت ہمیں کہاں سے
یہ تو وہی جگہ ہے، گزرے تھے ہم جہاں سے
لے آئی پھر کہاں پر......
مجبور کر رہی ہے پھر گردش زمانہ
ہم چھیڑ دیں وہیں سے گزرا ہوا فسانہ
لیکن کوئی بتا دے بھولے تھے ہم جہاں سے
یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے

کہیں پاس ہی کسی دوکان پر پرانے گانوں کے شوقین دکاندار نے نور جہاں کی آواز میں بڑا دکھی سا گانا چلا رکھا تھا۔ مغنیہ کی پرسوز سی آواز سن کر۔ اس کے دل میں ہوک اٹھی۔ لفظ بھی کیا خوب شے ہیں۔ موقع محل کے لحاظ سے ہوں تو غمی، خوشی، پیار نفرت سب کا آسانی سے اظہار کر دیتے ہیں۔

وہ جانی پہچانی گلیوں میں چلتی بنا کسی ٹھوکر کے ہی ہر قدم پر لڑکھڑا رہی تھی۔ قیمتی لباس، مہنگا جوتا...... لیکن سر تا پا خود کو بڑی سی سیاہ چادر میں ڈھانپے وہ ان جانے پہچانے لیکن اجنبی ہو چکے راستوں پر کسی ننھی بچی کی طرح چل

رہی تھی۔ جس نے آج ہی پہلے قدم اٹھائے ہوں اور ٹھوکریں کھا کھا کر چلتی ہو۔

دروازے کی بیل بجانے کے بعد اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل پڑی تو اس نے بے طرح ہی دروازہ بجا دیا۔

"ارے۔ دم تو لو۔ دروازے کے ساتھ تھوڑی بندھے بیٹھے ہیں ہم۔" اماں کی آواز آہستہ آہستہ دروازے کے قریب آئی اور کھٹاک سے کنڈی کھل گئی نرمین دروازے کے پٹ پہ زور ڈالے کھڑی تھی دونوں دروازے وا ہونے پر لڑکھڑا کر تقریباً اماں کے اوپر گرسی گئی۔

اُفف! یہ بیٹیاں! ہزاروں کا پرفیوم لگا بھی لیں تو ایک ماں نے جو اپنی بچی کو پہلی بار گود میں لیے خوشبو سونگھی ہوتی ہے۔ وہ اپنی اس خوشبو کو اس مہنگی خوشبو میں نہیں چھپا سکتیں۔ لاکھوں کے جوڑے میں ملبوس اس وجود کے لمس میں سے ماں کو اس ننھے لمس کا اشارہ مل جاتا ہے جو پہلی بار اس کی گود میں سما کر اسے معتبر کر گیا تھا۔

اماں نے نرم مگر کپکپاتے ہاتھوں سے تھام کر اسے سنبھالا۔ اس کی سیاہ چادر سر اور چہرے سے سرک کر کندھوں پہ گر گئی۔ گویا ماہتاب بدلیوں سے باہر نکل آیا ہو۔ خوب صورت تو وہ پہلے بھی بہت تھی لیکن اب تو حسین تر ہو رہی تھی۔

"اماں!" وہ لرزتی کپکپاتی اماں سے لپٹ گئی۔ آنسوؤں بھری آنکھیں لیے اماں کے بازو اسے لپٹانے کے لیے اٹھتے ہی نہ تھے۔

"میں نے آپ کو بہت یاد کیا اماں!" وہ سچے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"جاؤ۔ پانی لے کر آؤ۔ مسافروں کو پانی پلائیں تو بہت ثواب ملتا ہے۔" اماں نے ساکت کھڑی حریم کو کہا تو نرمین تڑپ اٹھی۔ اماں تسلی سے اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"مجھے یاد نہ کرتیں نرمین! گھر سے بھاگتے ہوئے اپنے ابا کی عزت کو یاد کرتیں۔ اس کے اونچے سر کو یاد کرتیں۔ ہماری برادری میں عزت کو یاد کرتیں۔"

"اماں! پلیز۔ خدا کے لیے۔ آپ کا دل سکون میں نہیں کہ میرے تن پہ قیمتی کپڑے ہیں۔ شان دار سی گاڑی میں بیٹھ کے آئی ہوں، روپے پیسے کی کمی نہیں جس کے ساتھ گھر سے نکلی تھی آج اسی کے عالی شان گھر میں عزت کے ساتھ رہتی ہوں۔ وہ دھوکے باز اور غاصب نہیں نکلا۔ پڑھا لکھا اور محبت کرنے والا شخص ہے۔" نرمین نفع گنواتے ہوئے ہانپنے لگی۔

"مجھے تو اپنے محبت کرنے والے بندے کی بے عزتی رلاتی ہے پگلی! ناخوش تو میں اس کا اونچا شملہ رلنے سے ہوں۔" اماں دکھ سے بولیں۔

تو نرمین نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"یہ میرے ہاتھ دیکھیں اماں! جس راستے پہ آپ لوگ بیٹیوں کو چلانا چاہتے ہیں۔ وہ بہت مشکل ہے۔ اس پہ پاؤں جلتے ہیں اماں! بدن راکھ ہوتا ہے اور روح تن سے نکلنے کو ہر پل مچلتی ہے۔ اتنا پیار، اتنی محبت اور مان دے کر ایک ہی وار میں اس کا خراج وصول کر لینا بھی تو محبت نہیں ہے اماں!"

"پانی پی لیا ہو تو جاؤ اب۔ تم مرچکی ہو ہمارے لیے اور ہم تمہارے لیے۔" اماں کی کرختگی عود آئی۔

"اماں!" حریم ان کی سنگ دلی پہ تڑپی۔

"میں تو اپنی "کرنی" کی وجہ سے مر چکی ہوں آپ کے لیے اماں! تو اسے، اپنے ہاتھوں سے کیوں مار رہی ہیں۔" نرمین اب خود کو سنبھال چکی تھی۔ حریم کا ہاتھ تھام کر تلخی سے بولی تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔

"بکواس بند کرو اور جاؤ یہاں سے۔ کیوں مرے ہوؤں کو پھر سے مارنے چلی آئی ہو۔" اماں کی رنگت زرد سے لال پڑنے لگی۔

''میرا قصور تھا تو سزا مجھے ملتی اماں! میری بہن سے قصاص کیوں لیا جا رہا ہے؟'' زرمین بھڑکی تو حریم کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔
''بھاگ جانے والے اپنی من مرضی کی زندگی پا لیتے ہیں۔ پیچھے رہ جانے والوں کی قسمت میں ان کے حصے کا قصاص ہی بچتا ہے پھر۔'' اماں تلخ ہوئیں۔
''مینو...... بس کرو۔ کیا فضول قصہ چھیڑ کے بیٹھ گئی ہو۔ اتنے عرصے بعد آئی ہو۔'' حریم نے اسے ٹوکا۔
''اتنے عرصے بعد اسی لیے آئی ہوں حری! برداشت نہیں ہو رہا مجھ سے۔ میری ہیرے جیسی بہن کے لیے وہ زمانے بھر کا نکما زلفی ہی رہ گیا ہے۔ اماں! یہ...... ہماری صورتیں دیکھیں اماں! ہماری ڈگریاں...... کیا ہم زلفی کے ہی قابل تھیں؟ نہیں رشتہ ڈھونڈا جاتا تو مجھے بتائیں، میں حریم کے لیے ایک سے ایک اعلا رشتہ لاؤں گی۔''
زرمین کی آواز میں بے دھڑک سی سرکشی تھی۔
اماں کا ہاتھ بے اختیار ہی اٹھ گیا۔ ہلکا سا تھپڑ تھا لیکن زرمین کو چپ کروا گیا۔
''یہ وہ تھپڑ ہے، جو مجھے تمہاری پہلی سرکشی پر ہی مار دینا چاہیے تھا۔'' اماں سرتاپا غصے سے کانپ رہی تھیں۔
حریم کو افسوس ہوا۔ اس کے لیے زرمین خواہ مخواہ آگے آ گئی۔
''تھپڑ نہیں اماں! آپ جیسے والدین کو تو بیٹی کو پیدا ہوتے ہی مار دینا چاہیے۔'' زرمین انگلی کی نوک سے آنکھ کے کنارے آیا آنسو جھٹکتے ہوئے تلخی سے مسکرائی۔
''بکواس بند کرو اور جاؤ یہاں سے۔ اپنی قیمتی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے امیر شوہر کے عالی شان گھر میں۔''
اماں سختی سے کہہ کر یوں کھڑی ہوئیں، جیسے اس کے نکلتے ہی دروازہ بند کرنے کا ارادہ ہو۔
''وہ تو میں چلی ہی جاؤں گی اماں! لیکن یاد رکھیے گا کنواری بیٹی کا ایک دکھ لیکن شادی شدہ بیٹیوں کے ہزار دکھ ہوتے ہیں۔ تب مائیں بہت روتی ہیں، ان کی ہر ہوک اور کوک سن کر...... لیکن کچھ نہیں کر پاتیں۔'' وہ جاتے ہوئے کہہ گئی تھی۔
''دروازہ اچھی طرح بند کر دے حریم! تیرے ابا کو پتا نہ چلے کہ وہ کم بخت آج آئی تھی یہاں۔'' اماں کی سرسراتی آواز سن کر حریم چونک کر تیزی سے آگے بڑھ کر دروازہ بند کرنے لگی۔
اس نے کبھی، زندگی میں کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن اس گھر کی اسی دہلیز سے بالکل ایسے ہی اسے بھی لوٹایا جائے گا۔

☆☆☆

''تم گئی کیوں تھیں وہاں؟ حالت دیکھو ذرا اپنی۔''
عباد شام کو گھر لوٹا تو اس کی متورم آنکھیں، بکھرے بال اور بے حد ٹوٹا ہوا انداز دیکھ کر سمجھ گیا کہ کہاں سے ہو کر آ رہی ہے۔ ابھی صبح ہی تو وہ اسے سختی سے منع کر کے گیا تھا۔
''جانا ہے تو میرے ساتھ چلو۔ اکیلے نہیں جانے دوں گا تمہیں۔'' اور زرمین زور سے ہنسی تھی۔
''لو...... مجھے کیا وہ اکیلے گھر میں گھسنے نہیں دیں گے؟''
اور اب...... آثار بتا رہے تھے کہ اس کی ہنستی مسکراتی اپنی زندگی میں مطمئن بیوی ماں باپ کے در سے ٹھکرائی گئی تھی۔
''عباد......!'' وہ ٹوٹ کر اس کے شانے سے لگ گئی۔
''اماں تو بہت پیار سے ملیں، لیکن ناراض ہیں مجھ سے بہت۔ ابا کے آنے سے پہلے گھر سے جانے کا کہہ دیا مجھے۔ اسی بات کا دکھ ہو رہا ہے۔''

وہ اس سے نظر ملائے بغیر جھوٹ سچ ملا کر کہہ رہی تھی۔ عباد بچہ نہیں تھا، ایسی سچویشن سے وہ بھی گزر چکا تھا۔ بنا کوئی تبصرہ کیے اس کا سر تھپتھپانے لگا۔ وہ خاموشی سے آنسو بہائے گئی۔

''میں نے کہا بھی تھا میرے ساتھ جانا۔ دونوں ان کی باتیں سنتے تو آدھی آدھی سہہ لیتے۔ پوری تم اکیلی سے سہی نہیں جا رہی۔'' کچھ دیر بعد وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔

افف اس کے الفاظ...... اور ان لفظوں سے جھلکتی پروا۔ کس قدر بدلا تھا اس انسان کو محبت نے۔ زرمین دکھی ہونے کے باوجود بڑے دل سے مسکرائی۔ عباد نے جھک کر اس کی مسکراتی شکل دیکھی تو مصنوعی خفگی سے بولا۔

''واہ۔ ہماری جان گئی اور ان کی ادا ٹھہری۔'' زرمین بے ساختہ ہنس دی۔

''بس اب یہ طے ہے زرمین عباد! جب بھی تم نے اپنے پیرنٹس سے ملنا ہوگا، ہم دونوں اکٹھے جائیں گے۔'' وہ تھوڑی دیر بعد کھانے کے دوران اٹل لہجے میں اسے کہہ رہا تھا زرمین مسکرا دی۔

''اور تمہارے گھر؟''

''وہاں جب مما کا موڈ ٹھیک ہوگا۔'' وہ گہری سانس بھرتا پھر سے کھانا کھانے لگا۔

''زیاد کی شادی پر ہی راضی نامہ ہوسکتا ہے تم لوگوں کا۔'' وہ اظہار خیال کر رہا تھا۔

''وہ بے چارہ تو ہماری وجہ سے پھنس گیا ہے۔ کیا بنا مائرہ والے قصے کا۔'' زرمین نے دلچسپی سے پوچھا۔

''پتا نہیں۔ مجھے تو لگ رہا ہے جب سے میں نے اسے زیاد سے شادی کرنے سے روکا ہے، وہ اپنے ارادے میں مزید اٹل ہوگئی ہے۔'' عباد نے بے چارگی سے کہا۔

''تم ملے ہو اس سے؟'' زرمین نے اسے گھورا۔

''ہاں۔ ریسٹورنٹ بلایا تھا، مگر صاف پتا چل رہا ہے کہ اب وہ بدلہ لینے پر اتر آئی ہے۔ خاص طور پر میرے منع کرنے کے بعد۔'' عباد نے تاسف سے کہا۔

''خیر۔ بدلے بدلے میں زندگی برباد کرنے سے کیا حاصل۔'' زرمین کے تبصرے پر سر ہلاتا وہ کھانا ختم کرنے لگا۔ زرمین بھی سویٹ ڈش لانے کے لیے اٹھ گئی۔

☆☆☆

''ایک تو تم اور تمہارے کام۔ اپنے بزنس میں کون اتنا سر کھپاتا ہے بھلا؟ اپنا بزنس تو کرتے ہی وہ ہیں جو کام کی ٹینشن سے بچنا چاہتے ہیں۔'' مائرہ لنچ ٹائم میں اس کے آفس کا دروازہ کھول کے اندر آتے ہوئے بولی، جہاں وہ لیپ ٹاپ سامنے رکھے ای میلز چیک کر رہا تھا۔

''ہوں، اچھا۔'' وہ بے ساختہ مسکرایا۔ پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر گہری سانس اندر کھینچتے خود کو ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔

''تم تو ایسے جان کھپا رہے ہو، جیسے نائن ٹو فائیو کی جاب ہے تمہاری۔'' مائرہ کرسی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے اس کی مصروفیت پہ چوٹ کرتے ہوئے بولی۔ وہ ہنسنے لگا۔

''نائن ٹو فائیو جاب ہی میں کام کیا جاتا ہے کیا؟ اپنا بزنس کیا ٹھپ کرنے کے لیے شروع کرتے ہیں لوگ۔''

''اچھا۔ دفع کرو لوگوں کو، اور اٹھو۔ کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں اچھا سا لنچ کراؤ۔'' مائرہ نے بے چینی سے کہا۔ ''بہت بھوک لگ رہی ہے۔''

''ذرا صبر کرو۔ لنچ یہیں آ رہا ہے۔'' وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے کرسی جھلاتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

''کہاں سے آ رہا ہے؟'' مائرہ نے آنکھیں پھیلائیں۔

''گھر سے۔ لنچ ٹائم نو ریسٹورنٹ۔ اونلی ہوم فوڈ۔'' اس نے مسکراہٹ دبائی تو مائرہ بے اختیار آگے کو جھکی۔

''ڈونٹ ٹیل می۔ مطلب...... تمہاری وہ مشرقی بیوی گھر سے ''ٹفن'' بھیجتی ہے تمہارا؟'' مائرہ کا سوال اس قدر بے ساختہ تھا کہ وہ بے اختیار قہقہہ لگا بیٹھا۔

''یہی سمجھ لو۔ وقت نہیں ملتا آفس سے نکلنے کا تو میں نے خود یہ روٹین بنائی ہے۔''

''بہت بور ہو گئے ہو یار! واقعی...... سنا تھا صحبت اثر ڈالتی ہے بندے پہ۔ آج دیکھ لیا جیتا جاگتا نمونہ۔ تمہاری لوئر مڈل کلاس بیوی لے بیٹھی تمہیں۔'' مائرہ بدمزا ہو کر بولی۔ وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پیون کا لایا ہوا لنچ باکس کھول رہا تھا۔ پورے آفس میں اشتہا انگیز سی خوشبو پھیلنے لگی۔

''آج تم بھی یہیں لنچ کرو۔ بہت مزے کا کھانا بنانی ہے حریم۔'' وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے کہہ رہا تھا مائرہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بہت شکریہ۔ تم کھاؤ یہ ہیلدی اور جرمز فری فوڈ۔''

''اوہوں۔ واہ۔ چیک تو کرو۔'' وہ کریمی چکن چمچے میں بھر کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''مجھے اتنے ہیوی کھانے ہضم نہیں ہوتے۔ تم ہی چڑھاؤ چربی کی تہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے چمچہ اپنے منہ لے گیا۔

''یو آر امپاسیبل۔'' مائرہ اسے کھاتے دیکھ کر پہلو بدل رہی تھی۔

اسی وقت فون بجنے لگا تو وہ چونک کر سیل فون کی طرف متوجہ ہوا۔

''حریم کی کال ہے۔'' وہ مسکرایا اور فوراً کال اٹینڈ کی۔ مائرہ سرتاپا ان دیکھی آگ میں جلتی اس کے کال اٹینڈ کرتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہیلو سویٹ ہارٹ۔''

اس کا بے حد نرم لب و لہجہ باہر نکلتی مائرہ کے کانوں سے ٹکرایا تو وہ بل کھا کر رہ گئی اس کے روم روم سے نفرت کے شرارے پھوٹ پڑے تھے۔

☆☆☆

ان کے آفس جانے کے بعد حریم کا وہ سارا دن جیسے کوئلوں پہ سلگتے گزرا۔ مائرہ نے جو کھیل اس کی آنکھوں کے سامنے شروع کیا وہ ناقابل برداشت تھا۔

''گھر میں ہر کام کے لیے نوکر موجود ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ تم بالکل ہی بیگم صاحبہ بن کے پھرتی رہو۔ ان کے سر پہ کھڑی ہو کر صفائی کروایا کرو۔'' نزہت نے سخت انداز میں کہہ دیا تھا۔

سو آج بھی وہ نوکروں کے سر پہ کھڑی ہو کر سارے گھر کو شیشے کی طرح چمکا کر فارغ ہوئی تھی۔ لیکن دھیان کے سارے تار جیسے ادھر ہی بندھے ہوئے تھے۔ لنچ آج ویسے ہی ثریا کے ہاتھ کا بھیجا جا رہا تھا۔

وہ لنچ کی تیاری کے لیے کچن میں گئی تو وہاں ثریا کے ساتھ نزہت کو کچن میں دیکھ کر رک گئی۔

''آہم۔ کیا آج کے لنچ کا مینیو ڈیسائڈ ہو چکا ہے؟''

''ہو چکا ہے۔ لیکن تم صرف اوپر کے کام کر دو۔ پکانے کا کام یہ خود کرلے گی۔'' نزہت نے دوٹوک انداز اپنایا۔

حریم ٹھٹکی۔ یہ نیا آرڈر ملا تھا جبکہ پچھلے ہفتے سے نا صرف گھر کے لیے بلکہ آفس میں بھی اس کے ہاتھ کا بنا کھانا ہی جا رہا تھا۔ نزہت باہر نکل گئیں۔ ایک نظر ثریا پہ ڈالتی حریم تیزی سے ان کے پیچھے لپکی۔

''مجھے اچھا نہیں لگتا کہ خاتون خانہ کے ہوتے ہوئے کام والیوں سے ہانڈی پکوائی جائے۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے پکانے میں۔ میں مینیج کر سکتی ہوں۔'' جلدی سے کہا۔

''سنا نہیں تم نے۔ میں نے ثریا کو مینیو بتا دیا ہے۔ جا کے اسے ہیلپ آوٹ کرو اور بچی کو سنبھالو۔ جس کام کے لیے یہاں آئی ہو۔'' انہوں نے تحکمانہ اور کاٹ دار انداز میں میں ہر جملہ کہا تھا۔ حریم کا جمع شدہ اعتماد ختم ہونے لگا۔

''لیکن...... آفس میں تو میں ہی کھانا بھیج رہی ہوں کئی روز سے۔ آپ کے بیٹے کے کہنے پر۔'' حریم نے یاد دلایا۔

''تم سے پہلے بھی آفس میں کھانا جاتا تھا بی بی! تم کون سا ایسے تنجن بنا کے بھیج رہی ہو اسے، جو کام والیاں نہیں بنا سکتیں۔ جس حد میں رکھا جائے انسان کو اسی میں رہنا چاہیے۔'' نزہت تلخ ہوئیں تو حریم مزید بحث کو عبث جان کر وہاں سے ہٹ گئی۔

مگر ہوا وہی تھا جو نزہت نے آرڈر کیا۔ اس نے سبزی بنوانے میں لہسن پیاز کاٹنے میں مدد کی کھانا ثریا اور نسرین نے مل کر بنایا تھا۔ ہاں حریم نے اپنے لیے کریم چکن بنایا تو وہ ایک چھوٹے باکس میں ساتھ رکھ دیا نجانے کیوں؟

''ہونہہ۔ مجھے کیا۔ خود کے بیٹے کا ہی آرڈر تھا کہ نوکروں کے ہاتھ کی پکی ہانڈی نہیں کھا سکتا۔'' وہ ''مجھے کیا'' والے انداز میں کندھے اچکاتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ میرب کے ساتھ کھیلتے، لایعنی باتیں کرتے بھی لنچ ٹائم پہ اللہ جانے کیوں اس کا دھیان پھر سے اس طرف چلا گیا۔

اسے یاد آیا جب وہ پہلی بار ''لیٹیشی لیڈرز'' کی آوٹ لیٹ پر گئی تھی۔ عباد کو نرمین سے ملنے سے روکنے کے لیے، اسٹاف کی نظر بچا کر وہ جلدی سے عباد کے آفس میں داخل ہوئی تو وہاں وہ اور اس کی دوست انتہائی قربت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سوچتے ہوئے حریم کا دل گھبرا سا گیا۔

اس نے بے اختیار ہی موبائل اٹھایا اور اس کے نمبر پر کال ملا دی۔ جو فوری طور پر اٹینڈ ہوئی۔

''ہیلو سویٹ ہارٹ۔'' دوسری طرف سے بڑا ہی میٹھا لہجہ تھا، حریم سٹپٹا گئی۔

''ہہ...... ہیلو......''

''جی۔ بولیے۔ سن رہا ہوں۔'' وہ شاید کچھ کھاتے ہوئے بات کر رہا تھا۔

''وہ...... یہ...... میرب یاد کر رہی تھی نہیں۔'' حریم کو یاد کرنے پر بھی یاد نہ آیا کہ اس نے کیوں کال کی تھی۔

''اچھا...... میرب کو میرا تھینکس کہنا۔'' مسکراتی ہوئی آواز۔

حریم خود میں جھنجھلائی۔

''تم نے کھانا نہیں بنایا آج؟ چکن کے سوا کچھ بھی اچھا نہیں بنا۔'' اس کا اگلا جملہ...... حریم ساکت رہ گئی۔

''مما نے منع کر دیا ہے۔'' وہ شکایتی انداز میں کہتے کہتے احساس ہونے پہ ایک دم بات اور لہجہ دونوں ہی بدل گئی۔

''خیر۔ میں کون سا تمہاری میڈ بن کے آئی ہوں اس گھر میں۔ بقول تمہارے یہاں تمہاری مما کے اصول چلتے ہیں۔ پہلے بھی پکتا ہوگا نوکروں کے ہاتھ کا کھانا۔'' وہ اب قدرے تیکھے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''ہمم...... ان حالات میں بھی تم نے کریمی چکن بنایا۔ شکریہ۔'' وہ منہ چلاتے ہوئے شرارت سے بولا۔ یقیناً ساتھ ساتھ اسی چکن سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ حریم سن ہوئی (اسے کیسے پتا چلا؟)

''آہم......'' وہ کھنکھاری۔ ''مائرہ کہاں ہے؟ وہ تو بہت بزی ہو گی بزنس چلانے میں۔'' نا چاہتے ہوئے بھی ہلکی سی کڑواہٹ حریم کے لہجے میں اتر آئی جس کا اسے خود بھی احساس نہیں تھا۔

''نہیں۔ ابھی یہیں تھی۔ تمہاری کال آئی تب ہی گئی ہے۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا تو حریم کو فوراً یاد آیا اس

نے کال ریسیو کرتے ہی حریم سے اپنا لگاؤ ظاہر کرنے کے لیے جو الفاظ بولے تھے۔
کیا مائرہ کو کچھ جتانے کے لیے؟ اسے خود سے دور رکھنے کے لیے......
اس نے بنا مزید بات کیے کال کاٹ دی تھی دل مضطرب کا اضطراب مزید بڑھا تھا۔

☆☆☆

میرا من کرتا ہے کہ میں ہر روز تم سے
کچھ نئے الفاظ میں محبت کا اظہار کروں
لغت تمام ہو جائے تو
نئی زبانوں میں محبت کا اظہار کروں
زبانیں تمام ہو جائیں تو
نئے اشاروں میں محبت کا اظہار کروں
میں چاہتی ہوں کہ تم ہر روز
میری محبت کا ایک نیا زاویہ دیکھو
یہاں تک کہ تمہیں میری ہر سانس محبت لگنے لگے
یہاں تک کہ میری ذات فنا ہو جائے
اور محبت امر!!

''زیڈ! کب آ رہے ہو؟ اور یہ سیٹ آگے کیوں کروائی ہے تم نے؟'' کیتھی کا بلا مبالغہ یہ پچاسواں فون تھا ان تین دنوں میں۔ اب جبکہ اس کی کل کی واپسی کی سیٹ تھی تو پتا چلا کہ اس نے مزید پندرہ دن کی ٹکٹ ایکسٹینڈ کروالی ہے۔

''بس یار! یہاں کے سلسلے ہی ایسے ہیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے۔ لیکن یقین رکھو پندرہ دن بعد لازمی آ رہا ہوں۔'' وہ اس کی خفگی پر بے اختیار مسکرا دیا۔

''مس کر رہی ہو مجھے؟'' جان بوجھ کر پوچھا۔

''میں نے ایسا تو نہیں کہا۔'' وہ اسے چڑانے کے لیے بولی۔

''اچھا...... مجھے تو ایسا ہی لگا کہ تم یہی کہنا چاہ رہی ہو۔'' وہ ہنسا۔

''آلاٹ...... (بہت)'' وہ لفظوں کو کھینچ کر فوراً بولی تو زیاد قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''مس یو ٹو ڈیئر! بس یہاں کچھ مسائل آن پڑے ہیں۔ امید ہے کہ ان چند دنوں میں میں وہ سب حل کر کے واپس آ جاؤں گا۔'' زیاد نے اسے تسلی دی۔

''پندرہ دن چند دن نہیں ہوتے مسٹر!'' وہ ناراضی سے بولی۔

''جب چٹکی بجاتے گزر جائیں گے دیکھنا تب چند دن ہی لگیں گے۔'' زیاد نے اسے چھیڑا۔

''سنو! مارک نے مجھے مسلم کمیونٹی سینٹر سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔'' کیتھی نے مدھم آواز میں کہا جو وہ بمشکل سمجھ پایا۔

''اوہ...... پھر......؟'' زیاد پریشان ہوا تھا۔

''کچھ نہیں۔ اسے تو میں نے ڈاج دے ہی دیا تھا لیکن اب وہ یقیناً میرے گھر والوں کو میرے خلاف کرنے کی کوشش کرے گا۔ ڈینی پہلے ہی میرے پاس قرآن پاک دیکھ چکا ہے۔'' کیتھی نے بتایا۔

''اپنا دھیان رکھو سویٹ ہارٹ! یہ کوئی چھوٹا معاملہ نہیں ہے۔ تم بڑے مصائب کا شکار ہو سکتی ہو۔''

''اب کشتی بیچ سمندر ڈال دی تو موجوں سے کیا ڈرنا۔'' وہ ہنسی تھی۔
اس کی ہنسی کی جلترنگ نے زیاد کو مسحور کیا۔ کافی لمبی بات کرنے کے بعد وہ جب اپنے کمرے سے باہر آئی تو اس کا موڈ بہت فریش تھا۔ ڈینیئل چھٹی پہ آیا ہوا تھا اور آج کیتھی کا اس کے ساتھ لانگ ڈرائیو اور چھوٹی موٹی پارٹی کا پروگرام تھا۔ وجہ...... ڈینیئل کی تنخواہ میں اضافہ ہونا تھا۔ وہ دونوں لانگ ڈرائیو پہ نکلے تو کیتھی کو احساس ہوا کہ ڈینیئل بہت کم بات چیت کر رہا تھا۔
''کوئی پریشانی ہے کیا؟ میں بہت زیادہ خرچہ نہیں کرواؤں گی یقین رکھو۔'' کیتھی نے اسے چھیڑا تھا۔ وہ مبہم سا مسکرایا۔ یا شاید زبردستی۔ کیتھی کی بھائی کے ساتھ بے حد اچھی دوستی تھی وہ اس کے موڈ کے سارے رنگوں سے واقف تھی۔ ڈینیئل لگی لپٹی رکھے بغیر صاف سیدھے مزاج کا بندہ تھا۔ لیکن آج جیسے کسی کشمکش کا شکار ہو۔
''تم لاسٹ ٹائم چرچ کب گئی تھیں؟'' ڈینیئل نے اس کے ہاتھ میں آئس کریم تھماتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا تو کیتھی کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ اگر وہ پرانی کیتھ ہوتی تو تڑخ کر بھائی کو یاد دلاتی کہ مذہب اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن اب دل میں چور تھا تو رنگ بدل گیا۔
''کیوں۔ یہ سوال پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی تمہیں؟'' کیتھی نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔
''میرے کسی دوست نے تمہیں مسلم کمیونٹی سینٹر سے نکلتے دیکھا ہے۔'' ڈینیئل اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔ جیسے چاہتا ہو کہ آگے کی تمام وضاحت کیتھی خود ہی کر دے۔ اور ادھر کیتھی لفظوں کے جوڑ توڑ میں مصروف تھی کہ کن الفاظ میں اپنی صفائی پیش کرے پھر یک دم اس کے ذہن کی گرہ کھلی۔
''یہ یقیناً تمہیں اس خبیث مارک نے بتایا ہوگا۔'' وہ تیقن سے بولی۔ ''میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تمہارا کوئی بھی دوست اتنا فارغ نہیں ہے کہ میرے ویئر اباوٹس کی خبریں تم تک پہنچاتا رہے۔'' کیتھی نے تلخی سے کہا۔
''تو کیا اس نے جھوٹ بولا ہے؟'' ڈینیئل نے اس کی باتیں نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔
''سچ کہا بھی ہو تو کیا؟ ہمارے ملک ہمارے شہر میں کسی بھی جگہ جانے پر پابندی نہیں ہے۔ ہر جگہ ہماری گورنمنٹ کی ملکیت ہے۔'' کیتھی نے لاپروائی کا تاثر دیا۔
''لیکن ہم مسلم کمیونٹی سینٹر نہیں جا سکتے کیتھ! تم جانتی ہو وہاں واعظ ہوتے ہیں مسلمانوں کی ذہن سازی ہوتی ہے۔''
''تو......؟ اپنا عقیدہ مضبوط ہونا چاہیے انسان کا بس۔'' کیتھی نے اس کی بات ہنسی میں اڑائی۔
''خود کو امتحان میں مت ڈالو۔'' ڈینیئل نے اسے نصیحت کی۔
''میرا بھی تمہارے لیے یہی مشورہ ہے ڈیئر! خود کو مارک کے گھیرے اور اثر سے نکالو۔ یہ شخص کسی کا بھی دماغ خراب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔'' کیتھی نے اسے جواباً نصیحت کی تھی ڈینیئل نے اسے گھورا۔
''شٹ اپ۔ اور دھیان سے سنو۔ ان مسلمان دوستوں سے پیچھا چھڑاوا پنا۔ باقاعدگی کے ساتھ چرچ جایا کرو تاکہ اگر تمہارے ذہن میں کوئی ابہام ہیں تو وہ دور ہوں۔'' ڈینیئل نے سنجیدگی سے اسے ٹوکا۔
''ہم...... صحیح۔'' بات جس نہج پہ جا رہی تھی، کیتھی جانتی تھی مزید بحث کیے بنا اچھی بچیوں کی طرح سر ہلا دیا۔ ڈینیئل اس کی فرماں برداری پر بے ساختہ مسکرا دیا۔

☆☆☆

''میرب کا سیکنڈ برتھ ڈے پلان کر رہا ہوں میں، گھر میں ہی۔ میرب خوش ہو جائے گی۔'' وہ حریم کو بتا رہا تھا۔ لیکن ان دنوں وہ اس قدر پژمردہ اور ڈیپریسڈ ہو رہی تھی کہ ٹھیک سے خوش بھی نہیں ہو پائی۔ بس غائب دماغی سے سر ہلا دیا۔ نہ کوئی خوشی نہ تبصرہ۔

”کوئی مسئلہ ہے کیا؟“ وہ زیرک نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
”مسئلہ......؟“ حریم نے بے تاثر نظروں سے اسے دیکھا۔ ”زندگی تو خود ایک مسئلہ بن چکی ہے۔ اس میں مزید کیا مسئلے ہوں گے۔“
”تم مائرہ کو لے کر ان کمفرٹیبل فیل کرتی ہو؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ ایک دم حریم کے حواس الرٹ ہوئے۔
”مم......میں......؟ وہ کیوں بھلا؟“ وہ ہڑبڑائی۔
”یہ تو تم بتاؤ گی مجھے۔“ وہ آرام سے بولا۔
”مجھے کیا ضرورت ہے غیر اہم لوگوں کو اہمیت دینے کی۔ میں کیوں ان کمفرٹیبل فیل کرنے لگی اس سے۔“ حریم نے تیکھے انداز میں بھنویں اچکائیں۔
”دیٹس گڈ۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم کسی سے بھی متاثر نہ ہو۔ میری بیوی ہو۔ میرب کی ماں ہو تم...... اور کوئی بھی اس مقام پر نہیں ہے۔“ وہ لیپ ٹاپ کھول کر اپنی ٹانگوں پہ رکھتے ہوئے دونوں تکیے اپنی کمر کے پیچھے رکھ رہا تھا۔ حریم نے اسے گھور کر دیکھا۔ (وہ کیا جتا رہا تھا؟)
”تم کسی کو بھی اس مقام پر فائز کر سکتے ہو میری طرف سے کھلی اجازت ہے۔“ حریم تنفر سے کہتے ہوئے سامنے کاؤچ پہ جا بیٹھی۔ وہ بے اختیار نظریں لیپ ٹاپ اسکرین سے ہٹا کر اسے تحیر سے دیکھنے لگا۔
”تم نے کبھی مفاہمت، کمپرومائز جیسے الفاظ نہیں پڑھے کیا؟“ اس نے بہت تحمل سے پوچھا۔
”ہاہ! جس نے پڑھا ہو وہ بھی کمزور سے ہی ان جذبات کی توقع کرتا ہے۔ تم نے کیوں نہ کیا اپنی مجبوریوں سے کمپرومائز اور مفاہمت؟“ وہ چیخی۔
”تمہیں کیا معلوم حریم مصطفیٰ! میں نے بھی کون کون سے کمپرومائز (سمجھوتے) کیے ہیں اپنی زندگی میں۔“ وہ پھیکا سا مسکرا دیا۔
”مجھے صرف اپنی زندگی کی پروا ہے۔“ حریم نے پاؤں کاؤچ پہ رکھتے ہوئے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے اور آزردگی سے بولی۔
”مجھے صرف اپنی زندگی کو ٹھیک کرنا ہے۔ واپس اس مقام پہ لے جانا ہے جہاں میں اماں ابا کی بہت فرماں بردار بیٹی تھی۔ ان کی نظروں میں میرے لیے مان تھا نفرت نہیں۔“ حریم کے انداز میں اس قدر بے بسی و بے چارگی تھی کہ اسے ایک پل لگا سمجھنے میں کہ وہ ڈیپریشن کی کس اسٹیج پہ کھڑی تھی۔ جہاں انسان خود کو بالکل تنہا سمجھ کر اپنی زندگی کو ”آسان ترین“ طریقے سے ”من پسند“ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ لیپ ٹاپ بند کر کے بستر سے اتر کر حریم کی طرف آیا۔
”کیا کیا سوچتی رہتی ہو؟“ ہلکے پھلکے انداز میں پوچھتا وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔
”بس یہی...... کہ زندگی کو آسان کیسے بناؤں۔“ حریم نے سلگتی آنکھیں موند لی تھیں ماتھا گھٹنوں پہ ٹکا دیا۔
”مشکل چیزیں آسان بن سکتی ہیں اگر کوئی ساتھ دینے والا ہو۔“ وہ نرمی سے بولا۔ حریم نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔
”ہم مل کر میرب کا برتھ ڈے سیلیبریٹ کرتے ہیں۔ میرب سے بھی تو محبت ہے تمہیں۔ مجھ سے اس کا کیا رشتہ ہے وہ اگنور کر دو صرف یہ سوچو کہ نرمین کی بیٹی ہے وہ۔“ اس نے حریم کے دل کو جیسے مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔ اس کے آنسو بہہ نکلے۔
”تو پھر ٹھیک ہے۔ دو چار ہی دن باقی ہیں، تیاری کر لو۔ میرب بھی خوش ہو جائے گی۔“ وہ اس کا سر تھپتھپا کر بولا تھا۔

☆☆☆

''تم کون سی تیاریوں میں مصروف ہو اسٹوپڈ؟'' رابعہ نے ابھی شاپنگ کر کے لوٹتی بیٹی کو گھر کا تھا۔

''مام پلیز! موڈ خراب مت کیجیے گا لیکچر سنا کر۔ آپ کو اچھی طرح پتا ہے میرب کا برتھ ڈے انوی ٹیشن آیا ہوا ہے۔'' مائرہ بدمزہ ہوئی۔

''ایک تو تم اور دوسری تمہاری پھپھی۔ دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے اس عورت نے بلکہ ہماری زندگیاں بھی۔'' رابعہ اس پہ چلائی تھیں۔

''اب دیکھیے گا، سارے بدلے ایک ہی بار چکا دوں گی میں۔ آپ فکر نہ کریں۔'' مائرہ نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ کہا۔

''بکومت۔ اور سیدھے سیدھے آنے والے پرپوزلز میں سے کسی ایک کو سلیکٹ کر کے عزت سے اپنا گھر بساؤ۔'' رابعہ کو اس کی دماغی کجی سے خلجان ہونے لگا۔

''گھر ہی بساؤں گی... آپ فکر مت کریں... لیکن اپنی پسند سے۔''

''بس کر دو۔ اللہ کا واسطہ ہے۔ ضرور اسے طلاق دلوا کر سوتن کی بیٹی پالنی ہے تم نے؟ ایسا ہی تھا تو پہلے ہی ہمت کر لیتیں۔'' رابعہ نے اس کے آگے عاجز آکر ہاتھ جوڑے۔

''اللہ کے لیے، بس کر دیں یہ میلوڈرامہ۔ اف مجھے سمجھانے کے بجائے اگر آپ خود کو سمجھا لیں تو بہتر ہوگا مما! یہ میری زندگی ہے اور اس کا ہر فیصلہ میں خود کروں گی۔'' وہ اپنے شاپنگ بیگز اٹھاتی اندر چلی گئی رابعہ سر تھام کر رہ گئیں۔

☆☆☆

رنگ ریز میرے
او رنگ ریز میرے
کون سے پانی میں تو نے
کیسا رنگ ڈالا؟
کہ......
موہے رنگ ڈالا!

وہ میرب کو تیار کر کے نزہت کے حوالے کر کے آئی تو پرسکون تھی۔ اب بس مائرہ کی فیملی کے آنے تک حریم نے خود تیار ہونا تھا وہ اپنی جھونک میں کمرے میں داخل ہوئی تھی ساتھ ہی اسے لگا خوشبوؤں سے گھرے پہاڑ سے ٹکرا گئی ہو۔ چاند تارے سب ہی چرمرا کے نظر آ گئے۔

''اوہو! سنبھل کے بھئی۔'' اس نے حریم کو نرمی سے سنبھال کر کھڑا کیا تھا۔

''آر یو اوکے؟'' وہ متفکر سا اسے پیشانی تھامے دیکھ رہا تھا۔

''اُفف۔ دیکھ کر تو چلیے کم از کم۔'' حریم کی ناک پہ بھی چوٹ آئی تھی سو آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

''سوری۔'' وہ انگشت شہادت سے اس کی سرخ ہوتی ناک نرمی سے سہلا کر مسکراتے ہوئے بولا۔ حریم کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی۔

''جلدی سے تیار ہو کر آجاؤ۔ مہمان آچکے ہیں تقریباً۔'' اس کے انداز پر مسکراہٹ دباتے ہوئیوہ کہہ رہا تھا۔ ماموں کی فیملی کے علاوہ چند بہت قریبی اقارب کو انوائٹ کیا گیا تھا اس برتھ ڈے پلس فیملی ڈنر میں۔ اس کے جانے کے بعد حریم نے بے اختیار ہی اپنی ناک کو ہاتھ سے چھوا تھا۔ پھر جھرجھری لے کر جیسے حواس میں

لوٹی۔
"استغفراللہ۔"
وہ تیزی سے آگے بڑھ کر تقریب میں پہننے کے لیے جوڑا نکالنے لگی جو کل اس کے شوہر کی مہربانی کی بدولت آج اس کی وارڈروب میں باقی نئے جوڑوں کے ساتھ بڑی شان سے لٹک رہا تھا۔
وہ کپڑے بدل کر جلدی سے پیر جوتوں میں پھنساتی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ خیال یہی تھا کہ الٹے سیدھے بال بنا کے کیچر لگا کر جلدی سے جا کر تقریب میں شامل ہو جائے۔ مگر آئینے میں خود کو پہلی ہی نظر میں دیکھ کر وہ خود ہی مسمرائز سی ہو گئی کامدانی میرون کلر کا لباس اس کی شفاف رنگت پر کھل اٹھا تھا۔
"تو ایسے لگتے ہیں امیر لوگ۔" اس نے مغموم انداز میں مسکراتے ہوئے برش اٹھا کر اپنے سیاہ سلکی بالوں کو سیدھا کیا تھا۔ سامنے رکھا گولڈن باکس اٹھا کر حریم نے کھولا۔ یہ آج ہی وہ دے کر گیا تھا۔
"فیملی کے لوگ ہوں گے تو میں چاہتا ہوں کہ تم اس گھر میں اپنی حیثیت کے مطابق تیار ہو۔"
اس وقت اس کے الفاظ سن کر حریم تپ گئی تھی لیکن اب اس نے چپ چاپ گولڈ اور ڈائمنڈ سے سجے خوب صورت آویزے کانوں میں ڈالے اور ڈائمنڈ سے سجا گولڈ کی چین والا پینڈنٹ شفاف گردن کی شان بڑھانے لگا۔ اس نے بالوں کو سمیٹ کر سوئس رول بنایا اور حسب عادت کیچر میں مقید کر دیا آنکھوں میں کاجل کی لائنیں کھینچیں لپ اسٹک اٹھائی۔ لیکن پھر واپس رکھ دی۔
"میں کیوں اسے یہ طمانیت دوں کہ میں یہاں ایک مطمئن زندگی گزار رہی ہوں۔"
ضدی سی سوچ کا دماغ سے گزر ہوا تو اس کا دل چاہا جیولری بھی اتار دے اور ماسی شکل بنا کر مہمانوں کے بیچ پہنچ جائے اور یہ سوچ اس قدر شدید تھی کہ حریم خود اپنی کیفیت سے گھبرا سی گئی۔ دروازہ کھٹکھٹا وہ اندر آیا تھا۔
"مہمان آچکے ہیں حریم!" وہ کہتے ہوئے اس کی طرف آیا اور پھر لحہ بھر چپ رہ گیا۔ حریم چونک کر ڈریسنگ ٹیبل کی چیزیں سیٹ کرتی درحقیقت اپنے اندرونی خلفشار کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔
"نائس۔" وہ دو قدم مزید آگے بڑھا تو حریم نے اپنی پشت پر اس کے مدھم سے تعریفی الفاظ سنے اس نے بے ساختہ چہرہ اٹھا کر آئینے میں دیکھا۔ وہ اس کے داہنی جانب کھڑا آئینے میں ہی اسے دیکھ رہا تھا۔
"یو آر لکنگ بیوٹی فل۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ کھلے ماحول کا پروردہ۔ ان کے لیے کسی کی تعریف کرنا عام سی بات تھی۔ لیکن حریم کے تو تمام مساموں سے پسینہ نکلنے لگا۔ یہ کسی مرد کی جانب سے اس کی زندگی کی پہلی تعریف تھی۔
حریم نے جلدی سے پلٹ کر بیڈ سائڈ سے اپنا دوپٹہ اٹھا کر شانوں پر ڈالا تھا۔
"میں آ ہی رہی تھی۔" بالوں کی لٹ کو نروس انداز میں کان کے پیچھے اڑستی وہ صفائی پیش کرتے ہوئے بولی۔
"بس...... یہ تیاری مکمل ہے؟ مطلب...... نو میک اپ لک؟" وہ تھوڑا پیچھے ہٹ کر سر تا پا اسے دیکھتے ہوئے ہنس دیا۔ حریم کا اعتماد لوٹنے لگا۔
"بس...... اتنا ہی کافی ہے۔"
"چلیں پھر......" اس نے بازو آگے پھیلا کر اسے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔
"تم جاؤ، میں آجاتی ہوں۔" حریم جز بز ہوئی۔
"ہر کام میں ضد نہیں لگایا کرتے مسز! کچھ لوگوں کی رائے توڑنے کے لیے بہت سے ان چاہے اقدام بھی کرنے پڑتے ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا تو حریم چپ چاپ اس کے ساتھ چل دی۔
ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی سب کی نظریں جیسے ان کے خوب صورت کپل پہ گڑ گئیں، وہیں مائرہ

سرتاپا سلگی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ کوئی منتر پڑھ کر حریم کو اس کے پہلو سے غائب ہی کردے۔ نزہت کو بھی اپنے بیٹے کے ساتھ اتنے اعتماد اور دعوے کے ساتھ حریم کا آنا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ مگر وہ جانتی تھیں کہ فی الحال بازی ان کے ہاتھ میں نہیں تھی۔

☆☆☆

مہمانوں کو ڈنر سرو کرنے کے بعد میرب کو ڈھونڈتی حریم اپنے کمرے تک آئی۔ کیک کاٹنے اور گفٹ لے کر خوش ہونے کے بعد وہ تھوڑی ہی دیر کھیلی تھی۔ حریم نے اسے زبردستی تھوڑا کھانا اور کچھ کیک کھلایا اس کے بعد وہ نیند سے بوجھل آنکھیں مسلنے لگی۔

''میرے خیال میں اسے نیند آرہی ہے۔'' وہ حریم کے پاس آ کھڑا ہوا جو اپنے قیمتی جوڑے کی پروا کیے بنا منہ بسورتی میرب کو شانے سے لگائے تھپک رہی تھی جو اس کے لیے بہت سکون آور منظر تھا۔ ان کی کلاس میں ایسے ہر فنکشن میں بچے کام والیوں کے سپرد ہوتے تھے اور مائیں قیمتی کپڑوں اور زیورات کی نمائش میں مصروف۔

وہ بہت دلچسپی سے میرب کے لیے حریم کی فکر اور پیار دیکھ رہا تھا۔

''ہاں۔ میرا خیال ہے میرو تھک گئی ہے بہت، میں اسے سلا دوں۔ کھانا آ کے سرو کرتی ہوں ابھی آدھا گھنٹہ باقی ہے۔''

حریم نے پریشان حال ماں کی طرح فکرمندی سے کہا تو وہ عجیب سے احساس میں گھرا اسے میرب کو لے کر جاتے دیکھتا رہا۔

میرب کو سلا کر حریم نے جلدی سے ثریا اور نسرین کے ساتھ مل کر ڈنر سرو کیا۔ تو اس نے میرب کو کچن کی طرف آتے دیکھا۔

''افف...... یہ جاگ گئی۔ اتنی جلدی۔'' اس نے جلدی سے میرب کو پیالے میں اسکیٹیز ڈال کر ٹی وی کے سامنے بٹھایا اور باقی کا کام نمٹانے لگی۔ اور اب جب کاموں سے فارغ ہو کر دیکھا تو میرب کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ اس نے ڈرائنگ، ڈائننگ چھان مارا کہ شاید مہمانوں کے بیچ جا بیٹھی ہو لیکن وہ مہمانوں کے بیچ تو کیا بیڈ روم میں بھی نہ ملی۔ حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے حریم نے نزہت کے بیڈ روم میں بھی جھانک لیا۔ یا اللہ! اس کا دماغ چکرا گیا۔ کہاں گئی؟

وہ کچھ خیال آنے پر تیزی سے لان کی طرف بڑھی تو کوریڈور سے مڑتے مائرہ سے ٹکرا گئی۔

''وہ...... مم...... میں واش روم جا رہی تھی۔'' مائرہ گڑبڑائی۔

لیکن حریم کے اعصاب میرب کے رونے کی آواز سن کر تن سے گئے۔ وہ مائرہ کی بات ان سنی کرتی میرب کو آوازیں دیتی، اندھیرے لان کی طرف تیزی سے دوڑی۔ میرب کے اونچی آواز میں بلک کر رونے کی آواز قریب تھی۔ حریم نے جھپٹ کر اسے خود سے لپٹا لیا۔

''اوہ میری جان! تم یہاں کیسے آگئیں۔'' اس نے بے تحاشا روتی ہوئی میرب کو سینے سے لگاتے ہوئے یہی سمجھا کہ وہ اندھیرے سے ڈر گئی ہے۔ اس نے جھک کر اس کے رخسار چومے...... تو میرب کا بے تحاشا رونا اور ہاتھوں پہ چپچپاہٹ کا عجیب خوف زدہ کر دینے والا احساس اسے سن کر گیا۔ اسی وقت لان کی تمام لائٹس کسی نے آن کر دیں تو میرب کا چہرہ اور کپڑے خون سے بھیگے ہوئے تھے۔ اس نے بے ساختہ خوف زدہ سی چیخ کے ساتھ میرب کو خود سے دور کیا تھا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

عنبرین ابدال

احساسِ ندامت

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' سمرا نے حیرانی سے اپنے سامنے کھڑے عدیل سے کہا۔ جو اپنی بات کرنے کے بعد ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھتے ہوئے اپنے بال بنا رہا تھا۔

''وہی کہہ رہا ہوں، جو تمہیں سنائی دے رہا ہے۔'' عدیل کے انداز میں ذرہ بھر بھی جھجک نہیں



تھی۔ بلکہ وہ تو یوں مطمئن تھا جیسے آفس سے واپسی پہ اس کے لیے کوئی گفٹ لانے کا کہا ہو۔

سمرا نے منہ کھول کر سینے میں دبی سانس کو باہر نکالنا چاہا مگر وہ تو سینے میں ہی اٹک گئی تھی۔ وہ تیزی سے عدیل کے قریب آئی۔

"آپ مذاق کر رہے ہیں نا۔ مجھے تنگ کر رہے ہیں نا۔" سمرا نے اپنا ہاتھ عدیل کے بازو پر رکھتے ہوئے امید بھری نظروں سے اپنے شریک سفر کو دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"اس میں مذاق والی کون سی بات ہے۔ لیکن اگر تم خود کو بہلانے کے لیے مذاق سمجھ رہی ہو، تو شوق سے سمجھ لو۔ اچھا ہے۔ تم زیادہ ڈرامے بازی نہیں کرو گی۔ جیسے ہر بار کرتی ہو۔ یوں ہی تو میں نے تمہیں ڈرامہ کوئین کا نام نہیں دیا۔"

عدیل نے ہنس کر کہتے ہوئے سمرا کے گال کو ہلکا سا تھپتھپایا اور پلٹ کر اپنے اوپر پرفیوم کی برسات کر دی۔ اتنی تیز خوشبو کہ سمرا کو اپنا سانس بند ہوتا محسوس ہوا۔ وہ بے اختیار ناک پہ ہاتھ رکھ کر پیچھے ہوئی۔ زیادتی کسی بھی چیز کی کیوں نہ ہو، گلے میں اٹکتی ہے۔ سمرا نے کھانستے ہوئے سوچا۔

"عدیل!" سمرا نے اب کف لنکس لگاتے عدیل کا بازو تھاما۔

"پلیز کہہ دو، مذاق کر رہے ہو؟ میری جان نکل رہی ہے۔ اب بس بھی کرو نا۔" اس کی آنکھوں میں نمکین پانی تیزی سے جمع ہونے لگا۔

"اس میں مذاق والی کون سی بات ہے۔" عدیل نے اپنے بازو سے سمرا کا ہاتھ ہٹایا اور پلٹ کر صوفے پر بیٹھ کر شوز پہننے لگا۔

آنسو آنکھ سے نکل کر گال پر پھسلنے لگے۔

"میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔" اب کے اس کے لہجے میں درشتی در آئی۔

"کیوں نہیں کرنے دو گی۔ یہ میری زندگی ہے۔ میں اپنی زندگی میں کچھ بھی کروں اور یوں بھی شادی کی بات کی ہے۔ تمہیں چھوڑنے کی نہیں۔ میں دو بیویوں کو سنبھال سکتا ہوں۔ اتنی حیثیت ہے میری۔ میں تمہارے اور اس کے خرچے افورڈ کر سکتا ہوں تو پھر تم مجھے ایسا کرنے کیوں نہیں دو گی۔"

عدیل نے سر اٹھا کر استفہامیہ نظروں سے سمرا کی طرف دیکھا جو یک ٹک اسی پہ نظریں جمائے کھڑی تھی۔

"خیر، میں اس وقت آفس جا رہا ہوں۔ تم بھی سکون سے سوچ لو۔ ہنگامہ کرنا ہے تو تمہاری مرضی۔ ہاں اگر آسانی سے مان جاؤ گی، تب اچھی بات ہے۔ مجھے انیلا اچھی لگتی ہے اور میں نے اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ بلکہ فیصلہ تو ہو گیا ہے، اب تو عمل کی باری ہے۔" عدیل اٹھ کر سمرا کے قریب آیا۔

سمرا وہیں صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔

☆☆☆

پانچ سال پہلے ہی تو سمرا نے عدیل سے پسند کی شادی کی تھی۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ نہیں...... بلکہ ٹھیک ٹھاک تھا۔

جو سمرا چاہتی وہی ہوتا۔ ویسا ہی ہوتا۔ اسے تو اپنی خوش قسمتی پہ یقین ہی نہیں آتا تھا۔

عدیل اس کی ہر فرمائش فوراً پوری کرتا تھا۔

وہ تو سمرا کی ایک ایک ادا کا دیوانہ تھا۔

سمرا نے بھی اپنی اداؤں سے وہ سب کروایا جو وہ چاہتی تھی یعنی شادی کے فقط دو ماہ بعد ہی وہ عدیل کو اس کے گھر والوں سے لے کر الگ ہو گئی۔ گھر کا بڑا بیٹا یوں بنا کسی وجہ کے گھر چھوڑ جائے۔ بے چارے ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائی تو حیرت سے دیکھتے رہ گئے۔

"آخر الگ ہونے کی کوئی تو وجہ بتاؤ بیٹا!" طیبہ بیگم اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتی عدیل سے پوچھنے اس کے کمرے میں آئیں۔

ماں کو یوں بے بسی سے روتا دیکھ کر عدیل کے چہرے پر شرمندگی کے اثرات نظر آنے لگے۔ سمرا جو عدیل کے چہرے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ گھبرا گئی۔

اف۔ کس قدر چالاک ہیں میری ساس۔ معصوم سا چہرہ بنا کر کیسے بیٹے کو الو بنانے چلی آئی ہیں۔

سمرا نے دل میں سوچا اور فوراً میدان میں اتر آئی۔

''ہم اپنی زندگی کھل کر جینا چاہتے ہیں۔ ہم اپنا گھر بنانا چاہتے ہیں۔ آخر کو کچھ سالوں بعد بھی تو الگ ہونا ہی ہوتا ہے..... تو ابھی کیوں نہیں؟''

سمرا نے اپنے لہجے کو حتی الامکان نارمل رکھنے کی کوشش کی ورنہ دل تو چاہ رہا تھا، خوب کھری کھری سنا کر اپنے کمرے سے باہر نکال دے۔

''کچھ سالوں بعد.....'' طیبہ بیگم نے حیرانی سے سمرا کی طرف دیکھا۔

''کچھ سالوں کے بعد بھی کیوں بیٹا؟ تم دو ہی تو بھائی ہو۔ ایک بہن ہے۔ اس کی شادی کے بعد تم اور دانش ہی تو ہو۔ ڈبل اسٹوری گھر ہے۔ ایک بھائی اوپر رہ لے۔ ایک بھائی نیچے۔ میں اور تمہارے بابا.....''

''آنٹی پلیز۔ آپ پلیز ہمیں جانے دیں۔ ایک گھر میں دو گھر نہیں رہ سکتے۔ زیادہ مسئلے ہوتے ہیں۔ عدیل! میں تمہارے ساتھ اپنی زندگی کا ایک ایک پل جینا چاہتی ہوں۔ ہمارا گھر، ہماری جنت۔ کیا میری یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی۔'' سمرا نے کہہ کر باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

عدیل اپنی جگہ سے اٹھا اور سمرا کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''امی آپ بھی نا۔ لے کر میری سمرا کو رلا دیا۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ ساتھ رہنے سے زیادہ بہتر ہے، ہم الگ رہ لیں۔ بعد میں بھی تو الگ ہوتے ہی ہیں اور یوں بھی الگ رہنے کا پلان ہے۔ آپ سب کو چھوڑنے کا تو نہیں۔'' عدیل نے سمرا کو چپ کرواتے ہوئے ماں سے کہا۔

سمرا دل ہی دل میں ہنس دی۔ پلان تو چھوڑنے کا ہی ہے۔ میرے بھولے سرتاج۔ تمہاری کمائی پہ صرف میرا حق ہے بلکہ تم پہ بھی اب صرف میرا حق ہے اور میں اپنا یہ حق لے کر رہوں گی۔

اور پھر واقعی میں سمرا نے ایسا ہی کیا۔ پہلے الگ ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ عدیل کو اپنے آپ میں اتنا الجھا لیا کہ وہ بھول ہی گیا کہ اس کے کوئی ماں باپ یا بہن بھائی بھی تھے۔ وہ تو اپنی سگی بہن کی شادی میں غیروں کی طرح شریک ہوا۔ باپ کے بیمار ہونے پر غیروں کی طرح ہسپتال دیکھنے کے لیے آیا۔

طیبہ بیگم کو مہینوں ہی گزر جاتے، اس سے بات کیے۔ اس کی شکل دیکھے مگر عدیل کا ریموٹ کنٹرول تو سمرا کے ہاتھ میں تھا۔

جانے کب اس ریموٹ کنٹرول کے سیل کسی اور کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ سمرا مطمئن ہوگئی تھی جو وہ اپنی زندگی میں چاہتی تھی، اس نے پالیا تھا۔ اس کے میکے کے لوگ اپنی بیٹیوں کے نصیب سمرا کے جیسے ہونے کی دعا کرتے۔ سمرا اپنے خاندان میں گردن اکڑا کر کسی ملک کی شہزادی کی طرح بیٹھی ہوتی۔

مگر اب کچھ ہی عرصے میں جانے کب اور کیسے عدیل، انیلا بیگ کا دیوانہ بن چکا تھا۔

عدیل بھی وہ جو ماں سے بات کرنے سے پہلے اس کی اجازت طلب کیا کرتا تھا اور آج یوں.....

وہ کتنی ہی دیر بیٹھی روتی رہی۔ اس کی سلطنت میں کوئی کیسے گھس گیا اور اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ تو مطمئن ہوگئی تھی اور انیلا بیگ نے ایک ہی جھٹکے میں اس کا اطمینان تاش کے پتوں کی طرح بکھیر دیا تھا۔

''میں عدیل کو منالوں گی۔ وہ میری ہر بات مانتا ہے۔ یہ بھی مان لے گا۔''

سمرا اپنے آنسو صاف کرتی عزم سے اٹھی اور شیشے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

آئینہ بتا رہا تھا وہ اپنے اطمینان میں خود سے

غافل ہو چکی تھی۔ روکھی جلد کو فیشل کی ضرورت تھی۔ آئی برو کے کمان میں بھی تیکھا پن نہیں تھا۔ بال بھی روکھے اور اپنی آب و تاب کھو چکے تھے۔

اف! یہ میں نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ شاید اسی لیے عدیل نے مجھے تنگ کرنے کے لیے شادی کا شوشا چھوڑا ہے۔ سمرا نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور دھیرے سے مسکرائی۔

وہ چند لمحے خود کو آئینے میں دیکھتی رہی اور پھر کسی فیصلے پر پہنچ کر پلٹی۔

سب سے پہلے پارلر گئی۔ فیشل کروا کر مینی کیور، پیڈی کیور کروایا۔ آئی برو بنوا کر اپر لپس بنوائی۔ کٹنگ کروا کر جب اس نے خود کو آئینے میں دیکھا تو وہ دیکھتی ہی رہ گئی۔

وہ خود کو پہلے کی طرح ہی فریش لگی۔ پارلر سے نکلنے کے بعد اس نے بوتیک سے خوب صورت سا ڈریس خریدا۔ جو اسے آج ڈنر پر عدیل کے ساتھ پہن کر جانا تھا۔ وہ دل ہی دل میں عدیل کے ساتھ ڈنر کا پلان بنا چکی تھی۔ گھر آ کر وہ کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹ گئی تاکہ وہ فریش نظر آئے۔

سمرا نے ایک گھنٹے کی نیند لی اور مندی مندی آنکھوں سے اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ بچوں کے اسکول سے آنے میں کچھ ہی وقت بچا تھا۔ سمرا نے رکشے والے کو بچوں کو اسکول سے سیدھا اپنی بہن کے گھر لے جانے کا کہا۔ اپنی بہن کو وہ پہلے ہی بتا چکی تھی کہ اسے عدیل کے ساتھ ڈنر پر جانا ہے۔ ڈنر سے واپسی پر وہ بچوں کو گھر لیتی ہوئی آئے گی۔

عدیل کے آنے میں کچھ ہی دیر تھی۔ سمرا نے اٹھ کر شاور لیا۔ وہی خوب صورت ڈریس زیب تن کیا۔ جو وہ واپسی پہ لیتی ہوئی آئی تھی۔

خوب صورت سا میک اپ کیے وہ بے قراری سے عدیل کا انتظار کرنے لگی۔ انتظار تھا...... کہ انتظار ہی رہا۔ اس نے بار بار عدیل کے نمبر پر فون کیا جو پہلے تو آن تھا مگر سمرا کے بار بار کال کرنے پر بند ہو چکا تھا۔ سمرا وہیں زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔ گھڑی کی سوئیوں نے سوا گیارہ کا ہندسہ بھی عبور کر دیا تھا تب کہیں جا کر دوڑ بیل بجی۔ سمرا نے دروازہ کھولا تو سامنے ہی عدیل مسکراتا ہوا کھڑا میسج ٹائپ کر رہا تھا۔ وہ یوں ہی گردن جھکائے اندر آ گیا۔

ایک گھونسا سا سمرا کے دل پر پڑا تھا۔ اس کی ساری محنت اور تیاری رائیگاں گئی تھی۔ عدیل نے تو ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد اسے دیکھا بھی نہیں۔

''بچے کہاں ہیں؟'' بچوں کے روم میں انہیں نہ پا کر عدیل نے استفسار کیا۔

''سمیہ کے گھر۔'' سمرا آہستگی سے کہہ کر گرنے کے سے انداز میں بیڈ کے کنارے بیٹھی۔

''کیوں؟''

سمرا نے سر اٹھا کر عدیل کو دیکھا۔

''تمہارے ساتھ ڈنر کے لیے جانا تھا۔ تمہارے ساتھ ٹائم گزارنا چاہتی تھی مگر.....'' بات کے آخر میں سمرا کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا پھنس گیا۔

''پلیز سمرا! اپنی عمر دیکھو اور اپنی حرکتیں دیکھو۔ بہتر ہے، تم فضول باتوں میں ٹائم ضائع مت کرو اور بچوں پہ دھیان دو۔'' عدیل نے خفگی سے کہتے ہوئے بیڈ کے دوسرے کنارے لیٹتے ہوئے کہا۔

پہلی بار ہوا تھا۔ جب عدیل نے اسے عمر کا طعنہ دیا۔ وہ عدیل سے پورے پانچ سال بڑی تھی۔ مگر خود پہ توجہ اور مین ٹین رکھنے کی وجہ سے چھوٹی لگتی تھی۔

زندگی میں سب کچھ پہلی بار ہی تو ہوا تھا۔ وہ بھولی تھی تو رہے، پروا کس کو تھی۔ وہ یوں رو رہی تھی، تو روتی رہے تب بھی پروا نہیں تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا اور یہ بدلنا سمرا کو بہت تکلیف دے رہا تھا۔

☆☆☆

وہ صبح اپنی بہن کے گھر آئی اور رو رو کر اپنی داستان سنا دی۔

''سمرا! تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' سمیہ اس

کے پاس آ بیٹھی۔
''کیا بتاؤں؟ عدیل تو کچھ بھی سننے کو تیار نہیں۔'' سمرا نے دل گرفتی سے کہا۔
''کیوں سننے کو تیار نہیں، یہ کیا بات ہوئی۔ تم فکر مت کرو، میں اس سے بات کروں گی۔''
سمیہ نے اسے تسلی دی اور زبردستی ناشتا کروایا۔
سب نے عدیل سے بات کرلی۔ سمرا کی بہن، ماں اور بھائی تک نے..... مگر اس نے کسی کی نہیں سنی۔
''میں آپ کی بیٹی کو خوش رکھ سکتا ہوں۔ شرط بس یہ ہے اگر یہ مجھے شادی سے نہ روکے اور سمرا کو میری شادی سے اتنا ہی مسئلہ ہے تو بے شک مجھے چھوڑ دے۔''
عدیل نے بے لچک لہجے میں کہا اور باہر نکل گیا۔ سمرا تو سمرا..... اس کے گھر والے بھی حیران رہ گئے۔
سمرا پھر سے رونے لگی۔
''تم ہمت مت ہارو۔ اپنی ساس سے بات کرو۔ وہ عدیل کو سمجھائیں گی۔''
سمرا کی والدہ نے اسے نئی امید کی ڈور تھمائی۔
''وہ کیوں عدیل کو سمجھائیں گی؟'' سمرا نے ناامیدی سے کہا۔
''سمجھائیں گی۔ آخر کو وہ بزرگ ہیں اور وہی تمہیں بیاہ کر لے گئی تھیں۔'' سمرا کی والدہ کو پانچ سال کے بعد خیال آیا تھا۔
''امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تم ان کے پاس جاؤ۔'' سمیہ نے بھی ماں کی بات کی تائید کی تو سمرا نے چاروناچار اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

''پلیز آنٹی! آپ عدیل کو سمجھائیں، وہ ایسے نہ کرے۔'' وہ برسوں بعد طیبہ بیگم کے پاس آئی تھی اور کیسے لٹی ہوئی آئی تھی۔
طیبہ بیگم کے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔
''اتنی پریشان کیوں ہو؟ کیا تم نے نہیں سنا۔ مکافات عمل کی چکی ہیں سب کو پسنا ہے۔ جو بوؤ گے وہی ملے گا۔ کل وہ تمہارے لیے ہمیں چھوڑ کر چلا گیا تھا، آج وہ کسی اور کے لیے تمہیں چھوڑ کر جا رہا ہے۔''
طیبہ بیگم کے کہنے پر سمرا کو لگا کسی نے آئینے پر جمی دھول صاف کر کے اس کے سامنے رکھ دیا۔
اس آئینے میں وہ اپنا چہرہ دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ شرمندگی، ندامت بس یہ دو چیزیں اس کے چہرے پر بکھری ہوئی تھیں۔
''مجھے آنٹی کے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔'' سمرا نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دل میں کہا۔
''لیکن میں عدیل کو سمجھاؤں گی۔ تم فکر مت کرو۔ تمہارے انکل سے بھی کہوں گی۔ بس اسے کہنا ہمارا فون اٹھا لے۔ تم پریشان مت ہو۔'' طیبہ بیگم نے اسے تسلی دی اور اپنی چھوٹی بیٹی کو سمرا کے لیے چائے کا انتظام کرنے کے لیے کہنے لگیں۔
سمرا کو لگا وہ آج کے بعد کبھی سر نہیں اٹھا پائے گی۔ مکافات عمل تو اس کے سامنے آچکا تھا۔ ایسے میں اپنی ساس اور سسر کی اچھائی بھی آشکار ہو چکی تھی۔
وہ اس پہ ہنسنے اور باتیں مارنے کی طاقت کے باوجود اس کے لیے پریشان تھے۔
کاش وہ گزرے پانچ سال لوٹ آئیں۔
سمرا کی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور اس کے دامن میں کھو گیا۔ احساس ندامت نے اس کا سر جھکا ڈالا تھا۔

☆

لاوَنی لاوَ اینوں شگناں دی مہندی
مہندی کرے ہتھ لال!

ٹم سن لڑکیوں کے گلا پھاڑ انداز میں گانے کی آواز، قہقہے اور ڈھولک کو دیوانہ وار پیٹنے کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ بے قراری اور بے سکونی کا طوفان سا اس شور کے ساتھ گھلا ملا تھا جو اسے کسی کروٹ چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ وہ کروٹیں بدل بدل کے تھک چکی تھی۔ اس کا پورا بدن تھکاوٹ سے چور تھا مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

اس کے ساتھ والی چارپائی پہ دن بھر کی تھکی ہوئی اماں سو رہی تھیں۔ کچھ فاصلے پہ چاروں چھوٹی بہنیں ام کلثوم، زینب، رقیہ اور خدیجہ میٹھی نیند کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ اس نے بوجھل، متورم سی آنکھوں سے ان سب کو دیکھا تو ان کے سکون اور میٹھی نیند پہ اسے رشک سا آیا۔

اک وہی جھلی جاگ رہی تھی۔

اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہر دو چار راتوں بعد یا تو نیند اس سے دور رہتی تھی یا وہ خود سوچوں سے ہلکان نیند کو قریب نہیں آنے دیتی تھی۔ آج کی رات بھی یہی ہو رہا تھا۔

کروٹوں کے لامتناہی سلسلے سے عاجز آتی وہ یوں چت لیٹ گئی کہ چمک دار ستاروں سے سجا تھال جیسا سیاہ آسمان آنکھوں کے سامنے تھا۔ چودھویں کے روشن اور چمکتے دمکتے چاند نے پورے آسمان پہ نور پھیلا رکھا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھنے لگی۔

حنا بشریٰ

سب کھیڈ نصیباں دا



''کئی لوگوں کا نصیب کتنا روشن ہوتا ہے۔''
''بالکل اس چاند جیسا چمک دار اور روشن۔''

دل کے محراب سے سرگوشی ابھری تھی۔ اسے لگا کہ اس سرگوشی نے اس کی بے کلی اور بے چینی میں اضافہ کر دیا کہ پلکوں کی نمی اسے کنپٹیوں پہ محسوس ہوئی تھی۔ جیسے اس نے بہت بے دردی سے رگڑا تھا۔ بہت غصے کے ساتھ اور بہت نفرت کے ساتھ......
''پتا نہیں اللہ سوہنے نے کئی لوگوں کا نصیب اتنا

ناولٹ



کھوٹا کیوں لکھا ہے؟'' اور پھر لاتعداد شکوے دل میں مچلنے لگے۔ ایسی اداس اور الجھن زدہ راتوں میں وہ اکثر ایسے ہی شکوے کرتی تھی۔ اب سے نہیں بلکہ بچپن سے ہی۔

''اللہ اکبر...... اللہ اکبر......''

مولوی عبدالمتین کی آواز مسجد کے گنبد و محرابوں کو چیرتی اس ''جھلی'' کی سماعتوں تک نہ پہنچتی تو اسے احساس ہی نہ ہوتا کہ پو پھٹ چکی ہے...... سحر طلوع ہو چکی ہے وہ نہ جانے کب تک یونہی الجھتی رہتی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔

کسل مندی کے ساتھ۔

بے دلی کے ساتھ۔

اچاٹ و اداس دل کے ساتھ۔

کیونکہ مولوی عبدالمتین کی بیٹی نماز قضا کیسے کر سکتی تھی...... اللہ سے شکوے اپنی جگہ مگر منکر سجدہ وہ کیسے ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

''سورنجان، گل دھاوہ، چاسکو، بہی دانہ، تخم ریحان، تخم کبابہ۔''

ہر ڈبہ مولوی حکیم عبدالمتین پکڑتے ہوئے ہر جڑی بوٹی کا نام بھی دھیمی آواز میں لے رہے تھے۔ ہر ڈبے کو اس کی مقررہ جگہ پر رکھنے سے پہلے وہ ڈبے پہ لگی سفید رنگ کی نئی نکور پرچی پہ لکھا اس جڑی بوٹی کا نام ضرور دیکھتے۔ پرانے بوسیدہ ڈبے جن کا اصل رنگ بھی اڑ چکا تھا مگر وہ ابھی بھی مضبوطی لیے ہوئے تھے۔

''شاباش میری بٹیا...... شاباش......!''

اس کام میں ان کی معاون لاڈلی بیٹی نور فاطمہ تھی۔ جو اپنی سب بہنوں میں سب سے زیادہ حسین تھی۔ ویسے تو مولوی صاحب کی ساری بیٹیاں ہی خوب صورت تھیں۔ مگر نور فاطمہ حسن و جمال میں سب سے نمایاں تھی۔ گلابی دمکتی رنگت، بادامی آنکھیں جو انتہائی سحر انگیز تھیں۔ لانبی گھنی پلکوں کی جھالر نے انہیں مزید چار چاند لگا دیے تھے۔ مگر وہ حسن ایسا تھا جو خود سے لاپرواہ تھا۔ اسے اپنی ''سحر انگیزی'' کا قطعی علم نہ تھا۔

''ابا...... بس یہ آخری......!'' آخری ڈبہ مولوی صاحب کو پکڑاتے ہوئے وہ قدرے مصروف انداز میں گویا ہوئی تھی۔

مولوی عبدالمتین اس گاؤں سوجان کے امام مسجد بھی تھے اور پیشے کے اعتبار سے حکیم تھے۔ ان کے باپ دادا خاندانی حکیم تھے۔ اور نسل در نسل امامت کے فرائض بھی سرانجام دیے رہے تھے۔ مولوی عبدالمتین کے باپ دادا جو تقسیم ہند سے قبل برصغیر پاک و ہند میں اپنی حکمت و دانائی کی وجہ سے معروف و مقبول تھے۔ ان کے ہاتھ میں خدائے بزرگ و برتر نے ایسی شفا رکھی تھی کہ ان کے ہاتھوں سے بستر مرگ پہ پڑے مریض شفا پاتے تو لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔ سخت سے سخت مرض کا علاج بھی وہ یوں کر لیا کرتے تھے کہ جیسے کوئی بڑی بات ہی نہ ہو۔

''حکیم صاحب! مریض کو سانپ نے ڈسا ہے۔ اپنی نسل کے سب سے خوفناک اور زہریلے سانپ نے......!''

تڑپتے مچلتے مریض کے ساتھ آئے رشتے دار سخت خوف زدہ دکھائی دیتے۔ کہ بس چند منٹوں تک ان کا پیارا۔ اللہ کو پیارا ہوا......!''

وہ حکیم صاحب کا اطمینان دیکھ کر سراپا احتجاج ہوئے جا رہے ہوتے۔

''اپنی بولتی بند کر اور وہاں سامنے کونے میں بیٹھ......!''

مختلف جڑی بوٹیوں کا مرکب تیار کر کے حکیم صاحب ساتھ آئے شخص کو زوردار انداز میں جھڑکتے اور کونے میں بیٹھنے کی تلقین کرتے۔

''کہا ہے نا کچھ نہیں ہوگا اسے......''

اس انتہا کا یقین ہوتا کہ وہ شخص دنگ رہ جاتا اور یہ صرف لفظی یقین نہ ہوتا بلکہ عمل بھی دکھائی دیتا۔ دوا کے چند قطرے مریض کے حلق سے اترتے تو وہ یوں آنکھیں کھول دیتا کہ جیسے عزرائیل نے اس کی جان

ٹی کردی ہو۔
بالکل ایسی ہی مہارت اور کاملیت عبدالمتین کو بھی اپنے بڑوں سے ملی تھی مگر بدقسمتی سے آگے ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ پانچ بیٹیاں تھیں۔ بہت سے لوگ مشورہ دے چکے تھے کہ کوئی شاگرد رکھ لیں۔ اور اسے اپنا علم سکھائیں ورنہ یوں تو آپ کا نام ختم ہو جائے گا۔
مگر مولوی صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی کہ شاگرد رکھنے پر تو راضی نہ ہوئے مگر انہوں نے اپنی سب سے بڑی بیٹی نور فاطمہ کو اپنا علم سکھانا شروع کر دیا۔ علاقے کے لوگوں نے اعتراض بھی کیا کہ بھلا بیٹیوں سے نام اور علم کہاں چلتا ہے مگر مولوی صاحب کی اپنی ہی منطق تھی کہ کسی غیر کو اپنا علم نہیں دینا۔ نور فاطمہ بلا کی ذہین بھی تھی دانا بھی اور عقل مند بھی۔ چھوٹی سے چھوٹی جڑی بوٹیوں کے نام اسے یاد ہوتے تھے۔ اب عمر اور بڑھاپے کی وجہ سے عبدالمتین کہیں غلطی کر جاتے مگر نور ہرگز غلطی نہ کرتی۔

☆☆☆

''ابا...... اس بار آپ سونف کا عرق سامان میں نہیں لائے!''
عبدالمتین آج صبح سویرے ہی نماز کے بعد شہر سامان لینے چلے گئے تھے۔ سامان کی فہرست نور فاطمہ نے بنا کر دی تھی۔ پھر بھی عبدالمتین کچھ نہ کچھ بھول آئے تھے۔
''اوہ بیٹا...... بھول گیا۔'' سفید براق عمامے کے ایک سرے سے جو عبدالمتین کے بائیں کندھے کی جانب لٹکا ہوا تھا۔ اپنی عرق آلود پیشانی پونچھتے وہ قدرے تاسف سے بولے تھے۔ ایک تو اتنی گرمی میں وہ سخت مشقت کے بعد لوٹے تھے اور پھر بھی کچھ نہ کچھ بھول آئے تھے مگر نور فاطمہ اس درجہ کی باریک بین تھی کہ یہ بھی نظر میں تھا کہ کون سا سامان آ گیا ہے اور کون سا بھول گئے ہیں۔ اس نے بہنوں کے ساتھ مل کر سارا سامان مخصوص ڈبوں میں ڈالا تھا ام کلثوم اور خدیجہ نے ہر ڈبے کے لیے سفید کاغذ کی پرچیاں جو مناسب سائز کی تھیں تیار کر کے ڈبوں پر چپکا دیں...... اور پھر بہت احتیاط کے ساتھ نور فاطمہ نے سیاہ قلم سے ہر چیز کا نام ان سفید خالی پرچیوں پر لکھا تھا اور یہ سب وہ ہمیشہ سے کرتی تھی۔
''بس یہ بڑھاپا بھی نا......!'' عبدالمتین دھیما سا مسکرائے اور اپنی عرق آلود پیشانی ایک بار پھر پونچھی۔ ان کی محبت بھری نگاہیں نور فاطمہ کے چہرے پر تھیں۔ مگر آج معمول سے ہٹ کر اداس اور بجھی بجھی سی محسوس ہوئیں تو اندیشوں نے دل کی دھڑکنوں کو تیز کر دیا۔
''طبیعت ٹھیک ہے تمہاری بٹیا!'' وہ حکیم ہی تھے جو ہزاروں مریضوں کے مرض کی تشخیص چہرہ دیکھتے اور نبض پکڑتے ہی کر دیتے۔ وہ اپنی نور نظر کی ناسازی طبع کو نہ جان پاتے۔
''ٹھیک ہوں ابا!'' جواب تھکاوٹوں کا مظہر تھا سو باپ کا دل مطمئن نہ کر سکا۔
''مگر مجھے تو نہیں لگ رہیں۔'' باپ کی فکر دو چند ہو گئی۔
نور فاطمہ وہ ''توتا'' تھی جس میں عبدالمتین کی جان تھی، وہ اپنی سب بیٹیوں سے پیار کرتے تھے مگر نور فاطمہ کی جو جگہ تھی وہ کسی اور کی نہ تھی اکثر چھوٹی زینب اور خدیجہ باپ سے شکوہ کرتیں۔
''ابا...... آپ کو نور آپا زیادہ ''پیاری'' ہیں؟''
تو عبدالمتین محض مسکرا کر رہ جاتے تھے اور کبھی جواب دیتے تو یوں دیتے۔
''نور فاطمہ میری بیٹی بھی ہے اور بیٹا بھی! اس لیے مجھے زیادہ پیاری ہے۔'' ان جذبات کو بیان کرتے ہوئے عبدالمتین کی آنکھیں نم ہو جایا کرتیں۔ شاید یہ سوچ کر کہ ایک دن ان کی لاڈلی بیٹی رخصت ہو جائے گی۔ نور فاطمہ سب سے بڑی تھی سو اسے سب سے پہلے رخصت ہونا تھا۔
''لا، اپنی نبض دکھا......!'' عبدالمتین مطمئن نہ ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ اترا ہوا لگ رہا تھا آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے یوں جیسے ساری رات یا

تو کوئی جاگتا رہا ہو یا پھر روتا رہا ہو۔

''نہیں ابا ......میں ٹھیک ہوں آپ خوامخواہ فکر کر رہے ہیں......!'' مختلف عرقیات کی بوتلیں جن پر نام لکھنے کے بعد دیوار گیر الماری میں رکھ رہی تھی۔ اس نے اپنی کیفیات و احساسات چھپانے کی سعی تو بہت کی تھی مگر وہ باپ تھے اس کی رگ رگ سے واقف تھے۔ اولاد کی رمزیں جانتے تھے۔

''کچھ ماں نے تو سخت سست نہیں کہہ دیا؟''

عبدالمتین کی بیوی عائشہ سخت مزاج کی تھی شاید بیٹیوں کی ماں ہونے کی وجہ سے اپنا مزاج سخت کر لیا تھا کیونکہ جانتی تھی کہ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو زمانہ ماں کو ہی باتیں سنائے گا۔ ماں ہی نکمی تھی جو بیٹیوں کی تربیت ایسی کی ہے۔

''نہیں ابا......اماں نے تو کچھ نہیں کہا!'' باپ کو مطمئن کرنے کے لیے نور نے، اپنی آواز اور لہجے میں خوش گواری بھرنے کی ناکام کوشش کی۔ اب وہ مختلف انواع و اقسام کے مشروبات اور سرکے الماریوں میں رکھنے کے بعد الماریوں کے شیشوں کو نم مگر صاف کپڑے سے چمکانے میں مصروف تھی کہ شیشے میں کسی کا عکس ابھرا تھا۔ وہ عائشہ تھیں مگر نور نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ خاموشی سے اپنے کام میں لگی رہی تھی۔

''نور فاطمہ کی طبیعت ٹھیک ہے؟'' دل کی بے چینی نے عبدالمتین کو عائشہ سے سوال کرنے پر مجبور کیا تھا۔

☆☆☆

عبدالمتین بہت نرم خو اور مہربان باپ تھے۔ خاص طور پر نور فاطمہ کے لیے بہت زیادہ شفیق، اس کی چھوٹی چھوٹی فرمائشیں وہ خود پر بوجھ ڈال کر بھی پوری کیا کرتے تھے۔ اپنی بیٹیوں کی خواہشوں کو وہ ''فرض'' سمجھ کر پورا کیا کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیٹیوں کے ساتھ عمدہ اور مہربان سلوک کرنے کی تلقین کی ہے۔ عبدالمتین کی بے جا نرمی اور لاڈ پیار کو دیکھتے ہوئے عائشہ نے خود کو ذرا سخت بنالیا تھا۔ روک ٹوک، ڈانٹ ڈپٹ اور ہر چھوٹی موٹی غلطی پر نصیحت کرنا، فرض سمجھتی تھیں۔

''بیٹیوں سے نرمی والا سلوک کیا کرو۔ کل کو انہوں نے دوسرے گھر چلے جانا ہے۔'' عبدالمتین عائشہ کا رویہ بیٹیوں کے ساتھ کبھی کبھار حد سے زیادہ درشت لگا کرتا تھا ان کے مطابق ماں بیٹی کا تعلق بہت دوستانہ قسم کا ہونا چاہیے۔ بیٹی اپنے دل کی ہر بات ماں سے با آسانی کر سکے۔ اپنا دکھ، تکلیف، پریشانی ماں کو ایسے ہی بتائے جیسے کوئی لڑکی اپنی ''سہیلی'' کو اپنے دل کا حال بتاتی ہے۔ ماں کو اولاد کے لیے اس قدر مشفق ہونا چاہیے کہ انہیں اپنی الجھنیں، پریشانیاں باہر سہیلیوں کو نہ بتانی پڑیں۔ مگر عائشہ کا فلسفہ عبدالمتین سے بالکل مختلف تھا۔

''بیٹیوں کو خواہ مخواہ چھوئی موئی اور نازک نہیں بنانا چاہیے۔ انہوں نے دوسرے گھر جانا ہوتا ہے پتہ نہیں وہاں کیسے حالات ہوں۔ اس لیے انہیں ذرا کھینچ کر رکھنا چاہیے۔'' فلسفہ اپنی جگہ مگر عائشہ اپنی بیٹیوں کو ایک سا چاہتی تھیں بس اظہار عبدالمتین جیسا نہ ہوا کرتا تھا۔

''میں تو صبح سے پوچھ پوچھ کر تھک گئی ہوں۔ مجال ہے جو کچھ بتایا ہو......!''

عائشہ کے انداز میں سخت چڑچڑاہٹ تھی۔ ایک گھر کے کاموں کی تھکان اور اوپر سے نور فاطمہ کی پراسرار خاموشی کا ''معمہ''۔ صبح سے سب بہنیں بھی پوچھ چکی تھیں مگر اس نے جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ یہ ''معمہ'' حل نہیں ہونے دوں گی۔

''صبح سے شام ہوگئی ہے۔ حلق سے ایک لقمہ اس ''لڑکی'' نے نہیں اتارا۔''

عائشہ عبدالمتین کی دکان کے دو دروازوں کے لیے نئے پردے سی کر لائی تھیں۔ عبدالمتین کی دکان گھر سے ملحقہ یوں تھی کہ ایک دروازہ گھر کے صحن کی طرف کھلتا تھا اور دوسرا گلی کی طرف......بیٹیوں والا گھر تھا۔ سو انہوں نے دونوں دروازوں پہ پردے

اگانے کا حکم دے رکھا تھا۔ پرانے پردے کافی بوسیدہ ہو گئے تھے۔ لٹکے ہوئے بھی برے لگتے تھے۔ ان کا ہاتھ ذرا کشادہ ہوا تو عائشہ نے پہلی فرصت میں دو عدد نئے پردے بنا ڈالے۔ پاس پڑی لکڑی کی کرسی پہ چڑھ کر وہ پردے لٹکا رہی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ عائشہ نے یہ بھی انکشاف کیا کہ عبدالمتین کی ''نورنظر'' صبح سے بھوکی ہے۔

نورفاطمہ کا معمول تھا۔ وہ صبح فجر کے ساتھ ہی اٹھ جایا کرتی تھی۔ مولوی صاحب مسجد کی امامت سے فراغت کے بعد کچھ دیر آرام کے لیے گھر آتے تو ان کا ناشتہ تیار ہوتا۔ فجر کی نماز کے بعد ماں کو بھی چائے بنا کر دیتی تھی۔ باقی سب کا ناشتہ ان کے اٹھنے پر بنایا کرتی تھی۔ اس دوران باپ بیٹی کے درمیان ہلکی پھلکی خوش گوار گفتگو سے ناشتے کا مزہ دوبالا ہو جاتا تھا۔ صبح حکیم صاحب سامان لینے کی غرض سے شہر چلے گئے۔ وہ سویرے ہی نکل گئے تھے اس لیے غور ہی نہ کر سکے کہ آج ان کی ''دلاری'' نے ناشتہ کیا ہے یا نہیں......؟

''کیا...... صبح سے کچھ کھایا نہیں!'' عبدالمتین کا مارے افسوس کے برا حال تھا۔ ان کی عادت تھی کہ گھر سے جلدی نکلتے تو تلقین کر کے نکلتے کہ......

''بیٹا...... ناشتہ کر لینا......!''

''جی ابا......!'' نور باپ کے اس دلار پر نہال ہو جایا کرتی تھی۔

ان کی لاڈلی صبح سے بھوکی تھی۔ سارا کام ان کے ساتھ مل کر کروایا تھا۔ سارا سامان سمیٹا تھا۔ ان کی دکان اب تیار تھی کہ مریضوں کے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ مگر وہ خود ابھی تک ''بھوکی'' تھی یہ بات تو جیسے ''کانٹے'' کی طرح عبدالمتین کے سینے میں چبھ گئی تھی۔ اب یہ چبھن اسی صورت میں ختم ہو سکتی تھی۔ اگر نورفاطمہ اپنی الجھن بتا دیتی یا کچھ کھا پی لیتی اور وہ ان دونوں کاموں کی طرف نہیں آ رہی تھی۔ باپ کی آواز و لہجے میں اپنے لیے فکر اور درد محسوس ہوا تو آنکھوں کے کٹورے نمکین پانی سے بھر گئے۔ مگر اس نے ان کٹوروں سے نمکین پانی چھلکنے نہ دیا۔

''مجھے کیا پتا کچھ بتائے تو پتا چلے......!'' عائشہ دونوں پردے لگا چکی تھیں اور ان پردوں کی وجہ سے دکان بہت نکھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ مگر عائشہ نورفاطمہ کی طرف سے سخت کوفت زدہ سی محسوس ہوئی تھیں۔ ان کی باقی بیٹیوں کی عادت تھی کہ کوئی تکلیف پریشانی ہوتی تو اس کا اظہار ماں کے سامنے ضرور کرتیں۔ مگر نورفاطمہ کی عادت سب سے بالکل مختلف تھی سارا دن منہ غبارے کی طرح پھلا کر پھرتی رہتی تھی مگر مجال تھی کہ کچھ بتا دیتی۔ عائشہ ماں ہونے کے ناتے اصل معاملے کی تہہ تک پہنچ جایا کرتی تھیں۔ مگر وہ بھی آج ناکام رہی تھی نا جانے یہ تحقیق و تفتیش کا سلسلہ ابھی کتنی دیر اور جاری رہتا۔ نورفاطمہ اور کتنی دیر ماں باپ کے سوالوں کی زد میں رہتی۔ اگر وہ آنسوؤں کو آنچل میں چھپاتی باہر نہ نکل جاتی وہ خود تو چلی گئی مگر بصارتوں کے [illegible] لال ہو گئی

☆☆☆

رنگین بڑی سی چارپائی پر پڑے پانچ پہ ململ اور ریشمی جوڑے سب بہنوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے ماسوائے نورفاطمہ کے۔ وہ لاتعلق گم صم سی دوسری چارپائی پہ اکڑی اکڑی بیٹھی تھی۔ آنکھوں میں تیرتے سرخ ڈورے بتا رہے تھے کہ دل ابھی بھی بوجھل ہے۔

''اماں یہ مہندی رنگ کا جوڑا کس کا ہے؟'' یہ ام کلثوم تھی۔

''یہ چوڑی دار پاجامے کے ساتھ زرد رنگ کی قمیص والا جوڑا تو زبردست ہے!'' خدیجہ چہکی۔

''اماں...... یہ والا جوڑا کتنا پیارا ہے!'' سنہری چمکدار گوٹے اور شیشوں ستاروں سے مزین ایک پیلے اور سرخ رنگ کا سلکی جوڑا زینب کی توجہ کا مرکز تھا۔

سبز رنگ کا کامدار جوڑا جس کے دوپٹے پہ گھنگھرو سجے تھے رقیہ نے اوڑھ لیا۔ عائشہ ان کے تاثرات دیکھ کر بس مسکرائے جا رہی تھیں۔

گو کہ ہر کسی کو کوئی نہ کوئی جوڑا پسند آ گیا تھا۔

اور ہر ایک نے اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کر دیا تھا بس ماں کے اشارہ کرنے کی دیر تھی کہ سب اپنے اپنے جوڑے پر قبضہ جمالیں عائشہ درزن تھیں۔ محلے والوں کے کپڑے سیتی تھیں۔ اس کام سے اور حکیم صاحب کی دکان سے گھر کا گزارا اچھا ہو جاتا تھا۔ دونوں اپنی بیٹیوں کی حسب توفیق پرورش بھی کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ ان کے مستقبل کے لیے کچھ نہ کچھ جوڑنے میں لگے تھے۔

''اماں...... یہ سب کپڑے کس کے ہیں؟'' ام کلثوم مزید صبر نہ کر سکی تو بول پڑی۔

''ارے تم سب کے ہیں اور کس کے ہیں؟'' عائشہ کھل کے مسکرائی تھیں۔ عائشہ آج بہت خوش تھیں۔ درجن جوڑے سی کر دیتے تھے اور پیسے بھی اکٹھے مل گئے تھے سو عائشہ کا سرخ و سفید چہرہ کھلا کھلا تھا۔

''سچ میں......!'' جوش اور خوشی کے مارے وہ بیک وقت چلائیں۔

آج تو ان کا یوں شور مچانا بھی عائشہ کو ناگوار نہ گزرا تھا۔ ورنہ اتنا اونچا بولنے پر وہ اکثر بیٹیوں کے پیچھے پڑ جاتی تھیں۔

''شرم کیا کرو۔ کس بے ہودہ انداز میں چیخ چلا رہی ہو۔ آوازیں کہاں کہاں تک پہنچ رہی ہوں گی۔ عورت کی تو آواز کا بھی پردہ ہے!'' ایسے موقعوں پر وہ ثبوت دے دیا کرتی تھیں کہ وہ امام مسجد عبدالمتین کی دین دار اور پارسا بیوی ہے۔ جو بیٹیوں کی تربیت کے حوالے سے انتہائی حساس اور محتاط ہے۔ مگر آج وہ درگزر کر گئیں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ابھی حکیم صاحب کی دکان پر مریض اور گاہک نہیں آئے تھے ورنہ دوسری صورت میں تو عائشہ کا یہ حکم ہوتا تھا کہ سانس بھی اتنی آہستہ لو کہ آواز نہ آئے۔ باقی تو سب بیٹیاں بلا چوں چراں حکم مان لیتی تھیں مگر نور فاطمہ کو اس حوالے سے بھی اختلاف ہوتا تھا۔

''سر منہ چھپا لیا نا...... پردہ بھی کر لیا...... بس بہت ہے اماں!''

نور فاطمہ دوسری بہنوں سے بہت مختلف تھی اس کے خیال میں یہ ایک ماں کی تربیت نہیں بلکہ ''گھٹن'' ہے تربیت کے نام پر اولاد کو گھٹن دی جا رہی ہے اس کا ایسی باتوں سے دم گھٹتا تھا۔

''نور فاطمہ! تم بھی اپنی پسند کا جوڑا لے لو!'' عائشہ نے مشفقانہ انداز میں بیٹی کو پکارا۔

''نہیں اماں...... مجھے نہیں چاہیے یہ پرانی ''کترنوں'' سے بنائے گئے جوڑے!'' اس کے لہجے سے بیزاری جھلک رہی تھی۔

''نہ تو رنگ کسی کام کے ہیں اور نہ ہی فیشن کے مطابق ہیں۔''

وہ نہ صرف پھنکاری تھی بلکہ زہریلی نگاہ ان جوڑوں پر ڈالی تھی جن پر اس کی چھوٹی بہن اتاؤلی ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کی خوشی بتا رہی تھی کہ جیسے ''ہفت اقلیم'' ان کے ہاتھ لگ گئی ہو یا پھر مغلیہ شہزادیوں کا لباس۔ وہ تو دیوانی ہوئی جا رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی خوشی میں نور فاطمہ کے زہریلے جملے سنے ہی نہیں تھے۔ مگر عائشہ نے نور فاطمہ کا لفظ لفظ سن لیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لہجے اور چہرے کی خوش گواریت کی جگہ ناگواری اور غصے نے لے لی تھی۔

''شرم نہیں آتی تمہیں۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے!'' عائشہ کی بھنویں غصے سے تن گئیں انہیں نور فاطمہ کی باتیں سخت بری لگی تھیں۔

''اس میں شرم والی کیا بات ہے اماں!'' وہ بھی دھن کی پکی تھی۔

''نہیں اچھے لگے بس نہیں لگے!''

عائشہ سلیقہ مند سگھڑ عورت تھی بچے ہوئے کپڑے سنبھال کر رکھ لیتی تھی۔ لوگ بھی کھلے دل کے مالک تھے مولوی صاحب کے گھرانے کی بہت عزت کرتے تھے کبھی اعتراض نہیں کرتے تھے کہ بچے ہوئے کپڑے واپس کیوں نہیں کیے......؟

بلکہ خود سے دے جایا کرتے تھے۔

''عائشہ بہن، کسی بچی کی قمیص یا پاجامہ بنا لینا...... واپسی کی ضرورت نہیں!'' پھر عائشہ ان

لیڑوں سے کوئی نہ کوئی خاص اور خوب صورت جوڑا بنا لیتی تا کہ کسی اہم موقعے پہ کام آ سکیں۔ عید تہوار یا شادی بیاہ کے موقع پہ بچیاں یہ جوڑے دیکھتیں تو خوشی سے دیوانی ہو جاتیں۔ سوائے نور فاطمہ کے اور آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

گاؤں کے چوہدری کی بیٹی نیناں کی شادی تھی یہ جوڑے اسی مقصد کے لیے عائشہ نے دن رات بیٹھ کر تیار کیے تھے۔ ماں تھی جس کی خواہش تھی کہ اس کی بچیاں بھی اس خوشی کے موقعے پہ نئے جوڑے پہن لیں۔ ورنہ مہنگائی کے اس دور میں ماں باپ پانچ بیٹیوں کے لیے نئے اور مہنگے جوڑے نہیں بنا سکتے۔ سو سلیقہ شعاری کا تقاضا یہی تھا کہ یہ طریقہ اختیار کیا جائے جو نہ تو جیب پر بھاری گزرے اور خوشی بھی پوری کر دے۔

''اماں ان میں اچھا لگنے والی بات کیا ہے؟''
نور فاطمہ کا موڈ بھی بے حد خراب تھا وہ ابھی تک بھوکی تھی اور بھوک نے اس کی چڑچڑاہٹ کو مزید بڑھا دیا تھا۔

''کبھی آپ اپنے جہیز کے ''آثار قدیمہ'' کے جوڑے نکال کر ہمارے لیے چوغے بنا دیتی ہیں۔ کبھی لوگوں کے کپڑوں سے ہمیں خیرات مل جاتی ہے!'' نور فاطمہ کی جلن کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک سلگتی نگاہ اپنی بہنوں کے مسکراتے چہرے پر ڈالی جو ایسے خوش تھیں جیسے شہر کی اعلیٰ بوتیک سے عمدہ و دیدہ زیب ملبوسات آئے ہوں۔

''کپڑوں سے زیادہ یہ کھٹے میٹھے بیر لگ رہے ہیں!'' اب تو وہ نخوت سے ہنستی ہوئی بولی تھی جبکہ اس کی طنزیہ ہنسی پر عائشہ کھول کر رہ گئیں۔ سات آٹھ سالہ بچی ہوتی تو ایک تھپڑ رسید کر تیں مگر اب جواں سالہ بیٹی پر ہاتھ اٹھانا انہیں خود بھی معیوب لگ رہا تھا۔ کتنی حقارت سے اس نے ماں کی محنت کا مذاق اڑایا تھا۔ نور فاطمہ کے الفاظ نے عائشہ کا کلیجہ چھلنی کر دیا تھا کہ وہ ضبط نہ کر سکیں۔

''زبان بند کرو گی کہ دوں ایک تھپڑ منہ پہ نورا!''

ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ باقی چاروں بہنیں بھی ایک دم سے خاموش ہو گئیں۔ ابھی بھی ضبط کے کڑے امتحان سے گزرتی ماں نے بیٹی پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ صرف یہ سوچ تھی کہ عبدالمتین کا حکم تھا کہ ''جوان بیٹی پہ ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے۔ وہ شرمندگی کے مارے اپنے خول میں چلی جاتی ہے اور چھوٹے کے سامنے ذلت محسوس کرتی ہے۔ اسے منہ زبانی جو کہنا ہے بھلے کہو مگر ہاتھ کی مار نہ مارو......!''

ماحول نہ جانے اور کتنی دیر کشیدہ رہتا کہ عبدالمتین اندر آ گئے۔ ان کے اندر آنے کی دیر تھی کہ نور فاطمہ کے نین کٹورے پانی سے بھرنے لگے۔ وہ یہی چاہ رہی تھی کہ باپ اس کے آنسو دیکھ کر ماں کو سخت سست سنائے کہ ان کی لاڈلی کو کیوں کچھ کہا۔

''نور فاطمہ...... یہ دیکھو میں شہر سے تمہارے لیے کیا لایا ہوں!'' عبدالمتین [illegible]
اور نہرے [illegible] امتزاج [illegible]
اور موتیوں کے کام [illegible]
ہوا خوب صورت سوٹ دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا [illegible] شہر کی کسی اچھی سی بوتیک سے خریدا گیا ہے۔ جو وہاں موجود تمام نفوس کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

''ابا یہ تو بہت پیارا ہے!'' آنسوؤں کو تیزی سے دھکیلتی نور فاطمہ خوشی کے مارے باپ کی طرف لپکی۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کی ساری بہنوں کے مسکراتے چہرے کیسے ایک دم سے مرجھا گئے تھے۔ ماں کی تربیت کا اثر تھا کہ وہ نور سے جلن و حسد محسوس نہیں کرتی تھیں مگر باپ کا یوں امتیازی سلوک دیکھ کر دل تو دکھ جاتا تھا۔

''یہ کون سی نئی بات ہے۔'' ام کلثوم کے لیے یہ نظارہ نیا نہیں تھا، شانے اچکاتے ہوئے وہ دوبارہ سے کپڑے دیکھنے میں مشغول ہو گئی۔ اس کے ساتھ رقیہ بھی مگن تھی۔ مگر زینب اور رقیہ خود کو نہ روک سکیں۔

''ابا! ایسے کپڑے ہمارے لیے بھی لے آتے نا!'' ان کے بجھے ہوئے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ

سخت رنجیدہ ہوئی تھیں، باپ کا عمل انہیں ناانصافی پر مبنی لگا تھا۔ بالکل یہی کیفیت عائشہ کی بھی تھی۔ انہیں بھی عبدالمتین کے عمل پر سخت اعتراض تھا مگر فرماں بردار بیوی ہونے کے ناتے وہ اولاد کے سامنے تو کچھ نہ کہتیں مگر تنہائی میسر آتے ہی وہ ضرور شکوہ کرتیں۔

''مولوی صاحب، یوں نہ کیا کریں سب بچیوں کے ساتھ محبت بے شک ایک سی نہ کریں مگر سلوک ایک سا ہونا چاہیے......!'' عائشہ جانتی تھیں کہ عبدالمتین کا جھکاؤ ہمیشہ سے پہلوٹی کی اولاد نور فاطمہ کی طرف زیادہ تھا اس معاملے میں اتنے مجبور تھے کہ اکثر ناانصافی بھی کر جاتے تھے۔ اس بار بھی عائشہ نے بنا بولے آنکھوں سے یہ بات عبدالمتین کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ نظر انداز کر گئے۔

''بھئی نور کی سہیلی کی شادی ہے۔ تو پھر اس کا جوڑا تو سب سے اچھا ہونا چاہیے!'' یقیناً یہ دلیل عبدالمتین پورے راستے سفر کے دوران سوچتے آئے تھے۔ تبھی جھٹ سے بیوی اور بیٹیوں کے سامنے رکھ دی۔ دلیل تھی بھی مضبوط۔

چوہدری خاور کی بیٹی نیناں، نور فاطمہ کے بچپن کی سہیلی تھی۔ دونوں کا سارا بچپن ساتھ گزرا تھا۔ دونوں نے قرآن عبدالمتین صاحب سے پڑھا تھا۔ عبدالمتین جب شام کو چوہدری کے بچوں کو قرآن پڑھانے جاتے تو نور فاطمہ کو اپنی سائیکل پہ آگے بٹھا لیتے اور حویلی لے جاتے۔ دونوں قرآن بھی پڑھ لیتیں اور کچھ دیر ساتھ کھیل بھی لیتیں۔

''ارے تم لوگوں کے لیے بھی کچھ لایا ہوں!'' عبدالمتین کے ہاتھ میں سرخ رنگ کا بڑا سا چوڑیوں کا ڈبہ تھا جس میں ساری بچیوں سمیت عائشہ کے لیے بھی چوڑیاں تھیں۔ چوڑیوں کا ڈبہ دیکھ کر سب بچیاں کھل اٹھیں، مطلب عبدالمتین باقی بیٹیوں کو بھی راضی کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر عائشہ ہنوز سنجیدہ تھیں وہ خاموش ضرور تھیں مگر کسی بات پر مطمئن نہ ہوئی تھیں۔

''اور ایک چیز تو میں نے دکھائی نہیں......!''

زمین پہ نیا نکور کنستر رکھتے ہوئے عبدالمتین کا لہجہ نہایت خوش گوار تھا۔

''ابا...... یہ کیا ہے؟'' اپنا خوب صورت سا سوٹ دائیں بازو پہ ڈالے اور ہاتھ میں میچنگ چوڑیوں کا سیٹ پکڑے نور فاطمہ کی نگاہیں کنستر پر تھیں۔

''بھئی یہ تو میری نور فاطمہ ہی کھول کر بتائے گی کہ اس میں کیا ہے؟'' عبدالمتین کی شروع سے عادت تھی کہ جب بھی کوئی چیز گھر میں آتی تو وہ نور فاطمہ سے ہی کہتے کہ اس کو کھولے۔ یہ ان کی محبت کا نرالا انداز تھا۔

''دیسی گھی!'' نور فاطمہ کی تو خوشی سے چیخ ہی نکل گئی۔

''ابا...... میرے پیارے ابا...... آپ کتنے اچھے ہیں!'' نور فاطمہ کا چہرہ سرخ گلاب کی مانند کھل اٹھا تھا۔ ساری پژمردگی اڑن چھو ہو گئی تھی۔ شہر میں عبدالمتین کے ایک شاگرد کے بیٹے کا عقیقہ تھا۔ سو انہوں نے عبدالمتین کے لیے خاص جگہ سے خالص دیسی گھی منگوایا تھا۔ ان کے اکثر شاگرد ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کبھی خالص مکھن، خالص گھی، دیسی گھی میں بنے موتی چور کے لڈو، کبھی کبھار عبدالمتین اور عائشہ کے لیے کپڑے تو ایک عدد جوڑا نور فاطمہ کے لیے بھی آ جایا کرتا تھا۔ عائشہ اس جوڑے کو فوراً صندوق میں چھپا دیا کرتی تھیں۔ نور فاطمہ کو تو بھنک بھی پڑ جاتی تو ماں کے پیچھے پڑ جاتی۔

''اماں بنا دو نا جوڑا میری فلاں سہیلی کی شادی ہے فلاں کا ولیمہ ہے۔ فلاں کی مایوں ہے۔'' مگر عائشہ ٹس سے مس نہ ہوتیں۔ جانتی تھیں کہ یہی جوڑا کل کو جہیز کے لیے کام آئے گا۔ عبدالمتین نے تو کہہ بھی دیا تھا۔

''نور کے لیے رشتہ دیکھو، جوان بیٹی کو جتنی جلد رخصت کر دیا جائے ماں باپ کے لیے اچھا ہوتا ہے!''

''سچی ابا، مجھ سے سوکھی روٹی کے ساتھ ناشتہ

ہونا ہی نہیں۔“ نور کی آنکھوں میں دنیا جہاں کی خوشی سمائی تھی، وہ ایک دم باپ کے سینے سے لگی تو دونوں ماں باپ کی نظریں آپس میں ملیں۔ ان دونوں کو نور فاطمہ کی بھوک ہڑتال والی ”پہیلی“ سمجھ میں آ گئی تھی۔

”اچھا تو یہ قصہ تھا۔“ عائشہ کی خاموش نگاہیں بیٹی پر تھیں۔

جبکہ عبدالمتین اپنی لاڈلی کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ عائشہ کے چہرے پر تفکر کے گہرے سائے لرزاں تھے۔ انہیں اب نور فاطمہ کی نازک مزاجیاں ڈرانے لگی تھیں۔ پریشان آنکھیں بیٹی کا مستقبل دیکھ رہی تھیں۔ نہ جانے کل کیا ہو۔ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکی کے اتنے اونچے معیار، اعلیٰ پسند و ناپسند ان کی پریشانی کو دوچند کر گئیں۔ مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ سوائے دعا کے۔

”یا اللہ میری بیٹیوں کا نصیب روشن رکھنا۔“ اور نصیب کے معاملے میں ماں تو بس دعا ہی کر سکتی ہے۔ اپنی مرضی سے تو نصیب نہیں لکھا جا سکتا۔

☆☆☆

پورے گاؤں میں ڈھولک کی آواز اور شوخ وچنچل لڑکیوں کے گیت گونج رہے تھے۔

آیا لاڑیے نی تیرا
سہریاں والا ویاون آیا

چوہدری خاور کی پوری حویلی رنگ و نور کا سماں پیش کر رہی تھی۔ صحن میں لگے گھنے درختوں کو بھی روشنیوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ سفید اور سرخ امتزاج کے جھالر والے نفیس ٹینٹوں سے صحن کے دو حصے کر دیے گئے تھے ایک مردانہ اور دوسرا زنانہ......

ہر سجی سنوری، قیمتی ملبوسات اور خوشبوؤں میں رچی بسی دوشیزاؤں اور خواتین ماحول کو مزید بارونق بنا رہی تھی۔ چوہدری خاور کی اکلوتی بیٹی نیناں کی شادی تھی وہ خوب اپنے دل کے ارمان پورے کر رہا تھا۔ پورے گاؤں کو مدعو کیا گیا تھا۔ عبدالمتین کا گھرانہ بھی پہنچ چکا تھا۔ نکاح پڑھانے کی ذمہ داری جو تھی۔ اپنے نئے قیمتی لباس میں ملبوس نور فاطمہ کی تو آج چھب ہی نرالی تھی۔ وہ بہت پراعتماد اور پرجوش دکھائی دے رہی تھی۔

پنڈال میں موجود ہر خاتون کی نظریں بھی عائشہ کی بیٹیوں پر تھیں۔ ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کرتی وہ معلومات اکٹھی کر رہی تھیں۔ مگر نور فاطمہ سب میں نمایاں تھی۔

”اچھا، یہ ہے حکیم عبدالمتین کی بڑی بیٹی۔ جو گاؤں کی مسجد کے امام بھی ہیں!“ ایک خاتون کا تبصرہ۔

”بھئی بڑی شفا رکھی ہے اللہ نے حکیم صاحب کے ہاتھوں میں...... جوڑوں کے درد کی دوا سال بھر پہلے لے کر گئی تھی۔ ابھی تک آرام ہے۔“ دوسری عورت بولی جو کسی اور گاؤں سے آئی تھی۔

”یہ حکیم صاحب کی بڑی بیٹی نور فاطمہ
ماشاء اللہ سے چاند کا ٹکڑا ہے!“ [illegible]
کا فنکشن بھول بھال کر نور فاطمہ [illegible]
گئی تھی اپنے کماؤ پوت کے لیے چاند چہرہ بہو کی تلاش تھی۔

”بہن...... حکیم صاحب کی اور کتنی بیٹیاں ہیں؟“ وہ عورت تو یوں اتاؤلی ہو رہی تھی کہ جیسے کل ہی رشتہ لے کر حکیم صاحب کے گھر پہنچ جائے گی۔

”اچھا یہ لڑکی کی ماں ہے؟“ ایک فربہ بدن والی خاتون جو سرخ لباس میں بالکل ٹماٹر بنی ہوئی تھی۔ سیون اپ کی ٹھنڈی ٹھار بوتل جو غالباً تیسری تھی کھلوا چکی تھی۔ مگر ابھی بھی دل کو اور کی طلب تھی۔

”ویسے ماں مزاج کی کافی سخت لگ رہی ہے۔ لگتا ہے بیٹیوں کو خوب کھینچ کر رکھا ہے۔ بے چاری کیسے سہمی ہوئی ہیں!“ تیسری بوتل ختم کرنے کے بعد زوردار ڈکار لینے کے بعد اس نے ایک تنقیدی نگاہ عائشہ پہ ڈالی جو بیٹیوں کو کبھی گھورتیں تو کبھی ٹوکتیں۔ کبھی ہنسنے سے منع کرتیں تو کبھی دوپٹوں کو درست کرنے کی تلقین کرتیں۔

''لو بھئی اب اتنی بھی کیا سختی۔ یہاں کون سا مرد دیکھ رہے ہیں!'' ایک عورت کو عائشہ کی بے جا روک ٹوک اور سختی بالکل نہ بھائی تو نور فاطمہ کو لگے ہاتھوں ریجیکٹ کر دیا۔ انہیں اپنے ماڈرن اور آزاد خیال بیٹے کے لیے اتنی پردہ دار لڑکی کی ضرورت نہ تھی۔

''بہن مجھے تو بالکل یہ بات اچھی نہیں لگی کہ مولوی کی بیٹیاں ہونے کی یہ سزا ہے کہ انہیں بوریوں میں بند کر دیا جائے!'' ایک عورت کو مذہبی اقدار و روایات محض سختی اور گھٹن لگ رہی تھی۔

مووی میکر کا رخ جیسے ہی عبدالمتین کی بیٹیوں کی طرف ہوتا تو ماں کے اشارے پر ہر بیٹی نہ صرف منہ کو چھپاتی بلکہ کیمرے کے سامنے سے ہٹ بھی جاتی۔

''بھئی یہ تو محض دقیانوسیت اور گھٹن ہے۔'' ہر عورت کا تبصرہ صرف عبدالمتین کی فیملی پر ہی ہو رہا تھا اور کوئی موضوع شاید دلچسپی کا حامل نہیں تھا۔

''نہیں بہن یہ تو اپنا اپنا ماحول اور تربیت ہے۔ وہ ماں باپ ہیں جیسے مرضی ہو اولاد کی تربیت کریں ہمیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں!'' ایک عورت جو کافی دیر سے لوگوں کے بے کار تبصرے سن رہی تھی بولے بنا نہ رہ پائی۔

☆☆☆

''کتنی دیر سے تیرا انتظار کر رہی سی!'' نیناں نے اسے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے اپنے پاس بیڈ پر بٹھالیا۔ نیناں کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ اس کی دودھ مکھن جیسی رنگت مزید اجلی اور نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔

چوہدرانی کو بھی اپنی بیٹی کی گوری رنگت پر بڑا غرور تھا۔

''مکھن ملائی پہ پلی ہے میری لاڈو۔ خود بھی مکھن کا پیڑا ہے۔''

''وہ بس مہمانوں کو بوتلیں دینے میں لگی ہوئی تھی۔'' نور فاطمہ کے ذمے بھی چوہدرانی نے متعدد کام لگا رکھے تھے اب فارغ ہوئی تو فوراً نیناں کے کمرے کی طرف لپکی تھی۔

''چھڈ دفع کر تو اے دیکھ!'' نیناں کا پرجوش لہجہ اس بات کا غماز تھا کہ اس کے پاس کچھ بہت خاص ہے دکھانے کے لیے، بتانے کے لیے اور اترانے کے لیے، وہ تیزی سے اٹھی اور پہلے مکمل رازداری کے ساتھ اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور پھر اپنی قیمتی ملبوسات کی الماری کی طرف لپکی تھی۔ وہ الماری جس کے دونوں پٹ پہ آراستہ شیشوں میں سے نہ صرف اس پرتعیش کمرے کی ہر چیز کا عکس نمایاں ہو رہا تھا۔ بلکہ سجی سنوری نور فاطمہ بھی دکھائی دے رہی تھی۔ عبدالمتین کے لائے گئے ریڈی میڈ جوڑے میں تو وہ خود کو سراہے بنا نہ رہ سکی۔

''تو بڑی سوہنی ہے نور...... رج کے سوہنی!'' نیناں اکثر اس کے گلابی موی گالوں کو پیار سے چھوتے ہوئے کہتی آج نور فاطمہ نے خود کو دیکھا تو احساس ہو رہا تھا کہ۔

واقعی وہ تو رج کے سوہنی ہے۔ صراحی دار گردن اس احساس تفاخر اور اعتماد کے ساتھ ذرا سی اکڑ گئی تھی۔ مگر چند لمحوں بعد ہی اپنی سابقہ حالت میں آ گئی کہ ماں اکثر کہتی تھی کہ اس سے آگے غرور اور تکبر کا آغاز ہو جاتا ہے۔

''اے دیکھ......!'' سرخ مخملی آٹھ دس ڈبے مختلف سائز کے جو ابھی بند تھے۔ نیناں نے جوش بھرے انداز میں سارے ڈبے لا کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ اب باری باری اپنی شادی کے زیورات کی نمائش کروانا شروع کی تو نور فاطمہ کا تو دل ہی بیٹھ گیا۔

''نولکھا ہار، رانی ہار جھومر، ٹیکہ پنج انگلاں چھ عدد سونے کے بھاری کنگن وہ بھی خالص سونے کے۔ سونے چاندی کی خوب صورت نازک سی جھانجھریں۔''

نیناں نے مسکراتے ہوئے ایک بڑا سا ڈبہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''اور اے دیکھ!'' انداز بتا رہا تھا کہ کچھ بہت خاص تھا۔ سب سے زیادہ خاص حالانکہ نور فاطمہ کے لیے تو کچھ بھی عام نہ تھا۔ اس کی روشن چراغ جیسی

آنکھیں یکدم بجھ سی گئی تھیں۔ جن میں نہ روشنی تھی اور نہ ہی چمک بس اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ گھور اندھیرا۔ ایسا اندھیرا جس میں نور فاطمہ کو لگنے لگا تھا کہ وہ بینا سے یکدم نابینا ہوگئی ہے۔ اس کا چند لمحوں پہلے والا اعتماد بری طرح سے مجروح ہوا تھا۔ دل میں عجیب سی بے چینی اور بے کلی نے کسی ڈائن کی طرح پنجے گاڑ دیے تھے۔ بجھا ہوا اداس چہرہ، ہر خوشی سے عاری تھا مگر نیناں کو اپنی خوشی اور دیوانگی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”ویسے بوجھ نور فاطمہ اس میں کیا ہوسکتا ہے؟“

یہ نیناں کی پرانی عادت تھی کوئی بہت خاص چیز دکھانے سے پہلے ایک بار نور فاطمہ کو اندازہ لگانے کی دعوت ضرور دیتی تھی۔ کبھی نور غلط اندازہ لگاتی تو کبھی درست۔ مگر آج نور کا اندازہ لگانے کا بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔

”تو بتا......!“ اداسی میں گھری آواز یوں جیسے کسی کھائی سے نکلی تھی اس کے لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

”چل رہن دے......!“ نیناں کو شاید آج خود بہت بے صبری ہو رہی تھی اس لیے فوراً ڈبہ کھول دیا۔

اصلی ہیروں کا جھلمل جھلمل...... جگر جگر کرتا بیش قیمت ہار نور فاطمہ کی آنکھوں کو خیرہ کر گیا تھا۔ اس کے تو خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اصلی ہیروں کا ہار ہوگا۔ نور کے اندر کچھ ٹوٹا تھا مگر بے آواز شاید اس کا کانچ سا نازک دل ہزاروں لاکھوں کرچیوں میں بکھر گیا تھا۔

”سوہنا ہے نا؟“ نیناں کی آنکھیں خوشی سے جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ نیناں نے خاص طور پر ضد کر کے باپ سے یہ ہار لیا تھا۔ انہوں نے بھی بیٹی کی خواہش دل و جان سے پوری کی تھی۔

”چل آنا...... کچھ اور دکھاؤں۔“

نیناں اسے بازو سے کھینچتی بیش قیمت کپڑوں کی الماری کے پاس لے گئی تھی وہاں بھی اعلیٰ سے اعلیٰ ملبوسات اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ مگر نور فاطمہ نہ تو کچھ دیکھ رہی تھی اور نہ ہی سن رہی تھی اس کا دل تو ہیروں کے ہار میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

احساس کمتری کے بچھو نے اس بے دردی سے ڈنک مارا تھا کہ وہ بے دم سی ہو کر رہ گئی۔ نیناں تو ایسے بچپن سے اپنی چیزیں دکھایا کرتی تھی۔ کبھی اپنے قیمتی کھلونے، کبھی کپڑے تو کبھی جوتے۔ بلکہ کمرے میں لگا اے سی.. سوچان گاؤں میں چوہدری خاور کا گھر واحد تھا جہاں اے سی لگا تھا۔ مگر اس کی برف جیسی ٹھنڈک میں بیٹھ کر بھی نور فاطمہ کو اپنا بدن جلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

شاید یہ جلن تھی۔

احساس کمتری کی۔

یا پھر احساس محرومی کی۔

جو بھی تھی اس کا سکون کئی کئی روز [illegible] دیتی تھی، راتوں کو [illegible] رونا، جاگنا، [illegible] اور خود کو ایک عام سے انسان کی بیٹی [illegible] اور اللہ تعالیٰ سے ڈھیروں شکوے کرنا، وہ خود پہ لازم کرلیا کرتی تھی۔

وہ نیناں کی بیش قیمت چیزیں دیکھ کر کتنی ذہنی اذیت کا شکار ہو جایا کرتی تھی، اس کا اندازہ تو شاید کبھی نیناں کو بھی نہیں ہوا تھا، اگر ہو بھی جاتا تو کیا فرق پڑتا تھا، نمود و نمائش کی دلدادہ اور دکھاوے کی گود میں نازوں سے پلی چوہدری کی بیٹی کو بس غرض اس بات سے تھی کہ زیادہ سے زیادہ اپنی سہیلیوں میں اپنی امارت اور عیش و عشرت کی دھاک بٹھا سکے۔

وہ اپنی اکثر استعمال شدہ اشیاء جن سے نیناں کا دل بھر جاتا تھا۔ نور فاطمہ کو دے دیا کرتی، جن میں اس کی ”اترنیں“ بھی شامل ہوا کرتی تھیں۔ جن کا بڑا پن دیکھ کر نور اذیتوں کے گہرے سمندر میں غرق ہو جایا کرتی تھی اس کا دل چاہتا تھا کہ اس کے پاس بھی ڈھیروں پیسے ہوں، وہ بھی اپنی پسند کی نئی نئی چیزیں خریدے، ہر وہ چیز جو اس کا دل چاہے، بالکل نیناں کی طرح ہر وہ چیز کھائے جو اس کا من کہے،

بالکل نیناں کی طرح...... یوں ترس ترس کر گھٹ گھٹ کر زندگی نہ گزارے۔

ان کے ہاں تو اچھا کھانا صرف ان دنوں میں ہوتا تھا جب گاؤں میں کسی کا عقیقہ یا نذر نیاز ہوا کرتی تھی، ڈھیروں ڈھیر چاول، جن میں بریانی، زردے اور نان حلوے شامل ہوتے تھے، لوگ عزت واحترام میں سب سے پہلے امام مسجد کے گھر نیاز پہنچانا اپنا فرض سمجھتے تھے، مگر نور فاطمہ کو ان نذر نیاز کے کھانوں سے گھن آتی تھی، اور کئی دفعہ تو اسے اپنے آپ سے بھی گھن آتی تھی کہ وہ کیوں ایک مولوی کے گھر پیدا ہوئی، جس کی ساری زندگی ایسے ہی ابتر حالت میں گزرنی ہے۔ نور فاطمہ کا نیناں کے کمرے میں دم گھٹنے لگا، اسے لگا کہ اگر مزید وہ یہاں رہی تو یہ گھٹن اس کی جان لے لے گی، جبکہ نیناں کے پاس ابھی بہت کچھ تھا، اس کو دکھانے کے لیے...... ''شاید قارون کا خزانہ''......

مگر نور فاطمہ میں حوصلہ نہیں تھا، ان سب کو دیکھنے کا۔ اپنے کچی مٹی سے بوسیدہ وجود کو زمین بوس ہونے سے بچانے وہ جو اپنے دھیان میں باہر بھاگی تو زمین پہ پڑے گٹھڑی نما وجود سے ٹکرا گئی، صاف ستھرے، سفید رنگ کے لباس میں ناتواں، ہانپتا کانپتا وجود شاید کسی تکلیف کے باعث زمین پہ گر پڑا تھا۔

''اماں ٹھیک، آپ ٹھیک تو ہیں؟'' اپنا غم کچھ لمحوں کے لیے یکسر فراموش کرتے نور کی اب مکمل توجہ اس معمر خاتون کی جانب تھی، جس کے لیے خود سے اٹھنا محال تھا، کمر میں ہاتھ ڈال کر انہیں سہارا دے کر اٹھاتی نور انہیں کرسی پہ بٹھانے میں کامیاب تو ہوگئی، مگر خود بھی بری طرح ہانپ گئی۔ وہ خاتون ٹانگوں کے کسی عارضے میں مبتلا تھی، بغیر سہارے کے چل پھر نہیں سکتی تھی، جس کا ثبوت دور گری لاٹھی تھی، جو نور نے تیزی سے پکڑتے ان کو تھمائی تو تشکر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اپنا لرزتا جھریوں زدہ ہاتھ انہوں نے اس کے سر پہ رکھ دیا۔

''جیتی رہو۔''

''آپ کے ساتھ کوئی نہیں ہے......؟''

نور کو کچھ حیرت سی ہوئی تھی کہ ایک بیمار عورت جو بغیر سہارے کے چل بھی نہیں سکتی تھی، اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔

''میری بہو آئی ہے میرے ساتھ......'' معمر خاتون کی سانسیں ابھی تک پھولی ہوئی تھیں، ان کی بات سن کر نور کی حیرت دوگنا ہوگئی تھی، بہو ساتھ تھی، مگر جب ساتھ آ کر بھی ایک بیمار بندے کا خیال و دھیان نہیں رکھنا تھا ''تو ساتھ آنے کا فائدہ......؟'' یہ سوال نور کے ذہن نے اس سے کیا۔

''وہ دلہن کی ''بری'' دیکھنے گئی ہے۔''

شاید معمر خاتون نے نور فاطمہ کے خیالات پڑھ لیے تھے، دلہن کی ''بری'' جس کا چرچا پورے گاؤں میں ہو رہا تھا۔

''بڑی نصیبوں والی ہے نیناں۔''

ہر عورت کی زبان پہ جملہ تھا، نور کو لفظ ''نصیب'' سے ہی چڑ سی ہوگئی تھی، یہ لفظ تو جیسے اس کی چڑ بن گیا تھا، جہاں کسی کے اونچے نصیب کی بات ہوتی، اس کا دل اپنے ''نصیب کی پستی'' پہ سلگنے لگتا تھا۔

''سنو......'' وہ اپنی ہی سوچوں میں غرق جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ یہ صدا زنجیر بن گئی۔

''گاؤں سوچان کی رہنے والی ہو......؟'' معمر خاتون کی آنکھوں سے جھلکتی مشتاقی میں مدھم سی مسکراہٹ بھی شامل تھی۔

''جی۔''

''یہاں اس گاؤں میں کوئی حکیم......'' اس عورت کی بات ادھوری رہ گئی کہ بھاگتی ہوئی زینب اور خدیجہ اس طرف آ گئیں۔

''کھانا کھل گیا...... کھانا کھل گیا۔''

اور نور فاطمہ کا بازو پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لے گئیں۔

☆☆☆

رخصت ہوتی پھیکی سی شام کی آنکھوں میں غضب کی اداسی تھی، ایسی ہی اداسی نور فاطمہ کی آنکھوں میں بھری تھی، جو صحن کے ایک کونے میں

اس کی آنکھوں میں اترنے لگا تھا، برگد کی جھکی ہوئی شاخیں چپکے چپکے ٹھنڈی آہیں بھر رہی تھیں، گاؤں سوچان میں بڑی دعاؤں سے بہت عرصے بعد مینہ برسا تھا۔ عبدالمتین نے تو باقاعدہ نماز استسقا مسجد میں پڑھائی تھی۔ چھاجوں چھاج مینہ برس رہا تھا، نور فاطمہ کے اندر بھی برسات کا موسم تھا، پچھلے کئی روز سے۔

موسم میں خنکی کے باعث سب گھر والوں نے اپنی چارپائیاں کمروں میں ڈال لی تھیں سوائے نور فاطمہ اور عائشہ کے۔ انہوں نے اپنی چارپائیاں برآمدوں میں بچھائی تھیں۔ وہ کافی دیر سے برآمدے کی بوسیدہ ٹپکتی ہوئی چھت کو پتھرائی آنکھوں سے گھورتی ایک ہی کروٹ پہ تکنے جارہی تھی۔ عائشہ نے چھت کے عین نیچے جہاں سے پانی ٹپک رہا تھا، وہاں پیتل کی بڑی سی دیگچی رکھ دی تھی۔

''اس بوسیدہ چھت کی طرح ہوتی ہے ہم غریبوں کی قسمت، جس سے غم آنسوؤں کی شکل میں ٹپکتے رہتے ہیں۔'' نور کے دل میں پھر سے شکوے شکایتوں کا وحشیانہ رقص شروع ہوگیا تھا، اس کی آنکھوں سے گرم پانی بہنے لگا تھا۔

''گھٹ گھٹ کر جیو...... ہر خواہش کے لیے ترسو اور پھر بس اندھیری قبر میں اتر جاؤ۔'' اس کے چشم تصور میں پھر سے نیناں کی شادی کا ہنگامہ ابھر آیا تھا۔ شہزادیوں جیسی تھی شادی۔ ہر خواہش، ہر ارمان اس نے پورا کیا تھا، کون سی چیز نہیں تھی اس کے پاس۔ دل کھول کر چوہدری اور چوہدرانی نے پیسہ خرچ کیا تھا، اتنی دھوم سے شادی کی تھی کہ سارے گاؤں نے دیکھی اور سسرال بھی کہاں ہے، اسلام آباد جیسے خوب صورت شہر میں۔

''کتنا روشن نصیب تھا نیناں کا......''

''پتا نہیں بندوں میں کچھ کا نصیب اتنا روشن اور چمک دار کیوں ہوتا ہے جیسے روشن ستارے۔'' نور کے اندر ہوک اٹھی تھی، وہ سسک کر رہ گئی تھی مگر بے آواز۔

''اور ایک میرا نصیب ہے، بالکل اس اندھیری رات جیسا، جس میں نہ چاند کی روشنی ہے اور نہ ستاروں کی چمک۔'' اس کے اعصاب پہ تاریکی پنجے گاڑنے لگی تھی۔ کافی دیر روتے رہنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگی تھیں اور کنپٹیاں درد سے پھٹنے لگی تھیں، مزید جاگنے کی ہمت جواب دینے لگی تو اس پر غنودگی طاری ہوگئی۔

''جاگ رہی ہو؟'' سلائی کے کپڑے نپٹا کر اور عشاء کی نماز پڑھ کر عائشہ اب فارغ ہوئی تھی، اسے نور سے ضروری بات کرنا تھی، دن بھر وہ موقع تلاشتی رہی مگر کام میں مل نہ سکا تھا۔

''ہوں۔'' آنکھیں موندے نور غنودگی میں بس یہی کہہ سکی، اس میں اب اتنی بھی سکت نہ تھی کہ کروٹ بدل کر ماں کی چارپائی کی طرف رخ کر لیتی اور اس کی دو چار باتیں سن لیتی۔

''تمہارا رشتہ آیا ہے۔'' عائشہ کے لہجے میں انتہا کی خوشی تھی۔

''اوں۔'' نور نے نیند کے غلبے کے باعث شاید بات بھی ٹھیک طرح سے نہ سنی تھی، اگر سنی ہوتی تو یوں لاتعلق ہو کر رخ پھیرے نہ پڑی رہتی۔

صحن میں لگے املی اور نیم کے پیڑوں میں ہوا سرسرانے لگی، تو عائشہ کی نظریں بے اختیار آسمان کی جانب اٹھ گئی تھیں، آسمان کو بدلیوں نے پھر سے گھیرے میں لے کر بارش کا اشارہ دے دیا تھا۔

''عشرت پروین کے بیٹے عبداللہ کا۔'' آسمان سے نگاہیں ہٹا کر عائشہ نے بات مکمل کی، مگر اب نور کی جانب سے ہلکی سی بھی، ہوں، ہاں، کی آواز نہ سنائی دی، جبکہ عائشہ بے دھیانی میں بولے جارہی تھیں، یہ سوچے بنا کہ وہ جاگ رہی ہے یا سوگئی۔

''وہی عشرت پروین جو تمہیں نیناں کی شادی میں ملی تھیں، جو تمہارے ابا سے علاج کروانے آئی تھیں پاکپتن کے قصبے ''ملکہ ہانس'' کے رہنے والے ہیں، خوشحال گھرانہ ہے۔ شریف لوگ ہیں لڑکا بھی سعادت مند...... تمہارے ابا کو یہ رشتہ بہت پسند آیا ہے۔'' عائشہ کے لہجے میں بلا کا سکون و اطمینان تھا، ان کی مسکراتی آنکھیں ابھی بھی آسمان پہ جمی تھیں،

یوں کہ جیسے آسمان والے کا شکر ادا کر رہی ہوں کہ اتنا اچھا شاندار رشتہ جھولی میں ڈال دیا ہے۔

''وہ اس جمعے رسم کرنے آنا چاہتے ہیں۔''

بادلوں میں ہلکی سی گڑگڑاہٹ ہونے لگی تھی، ہوا میں بھی تیزی آ گئی تھی اور بجلی بھی چمکی کہ لمحہ بھر کے لیے صحن اور برآمدے میں روشنی ہو گئی تھی۔ آثار بتا رہے تھے کہ مینہ دوبارہ برسنے والا ہے۔

''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟'' پائنتی پہ پڑی چادر اٹھانے کے لیے عائشہ اٹھیں تو ایک نگاہ ساکت پڑی چادر میں لپٹی نور پہ ڈالی۔

''سو گئی ہو؟'' جواب ندارد۔

پہلے پہل تو عائشہ سمجھ رہی تھیں کہ لڑکی ذات ہے، اپنے بیاہ کا ذکر سن کر شرم کے مارے چپ ہے، مگر اب احساس ہوا کہ اس نے تو کچھ سرے سے سنا ہی نہیں، وہ اکیلے ہی اتنی دیر سے بولے جا رہی تھیں آسمان سے پانی برسنے لگا تھا، رحمتوں اور برکتوں والا پانی۔ دل ہی دل میں بیٹی کے اچھے نصیب کی دعا کرتی وہ بھی نیند میں چلی گئیں۔ اس سوچ کے ساتھ کہ صبح بیٹی کی رائے اور مرضی معلوم کریں گی۔

☆☆☆

صبح بہت اجلی اور روشن تھی، درختوں کے نکھرے ہوئے پتوں پہ شفاف بوندیں دھیرے دھیرے لرز رہی تھیں۔

''مجھے نہیں کرنی یہ شادی۔'' اتنا اچھا رشتہ خود چل کر ان کے دروازے پہ آیا تھا، عبدالمتین اور عائشہ تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے اور ایک نور تھی کہ منہ پھاڑ کر ایک دم سے انکار کر دیا تھا کہ جیسے کسی ''لولے لنگڑے'' کا رشتہ آ گیا ہو اور ماں باپ بوجھ سمجھ کر بس اتار رہے ہیں۔

''کیوں کیا خرابی ہے اس رشتے میں۔'' عائشہ الجھ گئی تھیں۔

نور کے مطابق لاکھوں خرابیاں تھی اس رشتے میں لڑکا لینڈ لارڈ نہیں تھا، جیسا نیناں کا شوہر تھا..... رشتہ عام سے گاؤں سے آیا تھا، جبکہ اس کی خواہش تھی کہ اسلام آباد جیسے شاندار شہر کا ہوتا۔

نور نے خوب، بے باکی کے ساتھ ماں کے سامنے بہت سے اعتراضات رکھ دیے، مگر عائشہ نے اس کے ہر اعتراض کو نظر انداز کرتے اسے خاموش ہونے پہ مجبور کر دیا، وہ روتی دھوتی رہ گئی اور عشرت پروین جمعے کو آ کر رسم کر کے عبداللہ کے نام کی انگوٹھی پہنا کر شادی کے دن رکھ کر بھی چلی گئیں، وہ بیمار تھیں، زندگی کا کوئی بھروسہ نہ تھا، سو انہیں جلدی تھی کہ عبداللہ کے فرض کو بھی ادا کر دیں۔ اور عائشہ کے لیے نور کا ہر اعتراض بچگانہ تھا۔

''ہر ایک کا اپنا اپنا نصیب ہوتا ہے۔ اس بات کو جتنی جلدی سمجھ جاؤ گی بہتر ہو گا۔'' نئی زندگی کا آغاز کرنے والی بیٹی کو ماں کی یہ نصیحت تھی۔

پورے گاؤں میں یہ خبر پھیلنے کی دیر تھی کہ مولوی عبدالمتین کی بیٹی کے دن رکھ دیے گئے ہیں۔ پورا گاؤں یوں جوش سے اس خوشی میں شامل ہونے کو اُمڈ آیا کہ جیسے نور فاطمہ، عبدالمتین کی نہیں۔ سارے گاؤں کی بیٹی ہو۔ چوہدری خاور نے کھلے دل سے چاول، چینی کی بوریاں اور گھی کے کنستر شادی کے کھانے کے لیے روانہ کیے۔ کوئی کمہار تھا تو ضرورت کے برتن ہی اٹھا کر لے آیا۔ کپڑے کا کام کرنے والا درجن بھر جوڑے ریشمی اور سلکی اٹھا لایا۔

''مولوی صاحب، یہ میری طرف سے دھی رانی کے لیے رضائیاں!'' کوئی اپنی استطاعت کے مطابق لحاف اور رضائیاں ہی لے آیا۔

''عائشہ بہن..... یہ کھیس اور چادریں میری طرف سے.....!'' کسی نے عمدہ اور نفیس چادروں کا تحفہ پیش کیا۔

''عائشہ..... یہ ناک کی کیل اور انگوٹھی میری طرف سے!'' سنارن سے اچھے عزت و احترام والے تعلقات تھے سو وہ خوشی میں سونے کی انگوٹھی اور ناک کی کیل لے آئی تھی۔

غرض کہ ہر کوئی اپنی توفیق کے مطابق مولوی عبدالمتین کی بیٹی کے لیے ضرورت کی ہر چیز لایا تھا۔

''کتنی نصیبوں والی ہے میری بیٹی......!'' صحن جہیز کے سامان سے بھرا ہوا تھا۔ ویسے تو عبداللہ نے صاف منع کر دیا تھا کہ جہیز کی کوئی ضرورت نہیں مگر پھر بھی عبدالمتین بیٹی کو خالی ہاتھ رخصت کرنے کے حق میں بالکل نہ تھے...... عبدالمتین جہیز کا سامان دیکھ کر خوشی سے نہال ہوئے جا رہے تھے۔ شادی کی سب تیاریاں مکمل تھیں۔ سب کچھ اس سہولت سے ہو گیا تھا کہ عائشہ اور عبدالمتین کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ تو لاکھوں بار رب تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے تھے۔ جبکہ نور فاطمہ کے دل کی یہ حالت تھی کہ اس خوشی کے موقعے پہ بھی خود کو رو رو کے نڈھال کر دیا تھا۔ باقی کسر نیناں نے پوری کر دی تھی۔

''نی اڑیئے اپنی کی پھیتی سی تینوں ویاں دی......؟'' وہ چند روز کے لیے گاؤں آئی تھی۔

شادی کے بعد تو اس کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے تھے۔ وہ تو بالکل ''شہری میم'' بن گئی...... جو اونچی ہیل والی جوتی پہن کر ہر وقت ''ٹک ٹک'' کرتی رہتی تھی۔ جدید فیشنی موبائل ہاتھ سے بھی بڑے سائز کا پکڑ کر وہ ادائیں دکھائی کہ حد نہیں تھی نیناں کے بقول اس کے شوہر کے ایک دوست نے شادی کی تصویروں اور مووی میں نور فاطمہ کو دیکھ لیا تھا بس وہ تو ایسا اس کے حسن و جمال پر فدا ہوا کہ رشتہ لے کر آنا چاہتا تھا۔ وہ بہت امیر کبیر تھا۔ نہ جانے کتنی زمینوں اور ملوں کا مالک تھا۔

نیناں کی باتوں نے اس کے دل و دماغ کو ایسا متنفر کیا کہ وہ پھر سے پٹری سے اتر گئی پہلے تو شکوے شکایتیں اللہ سے تھیں اب ماں باپ سے بھی گلہ ہونے لگا تھا۔ نور فاطمہ کو لگا کہ اس کے ماں باپ بوجھ کی طرح اسے اتار رہے تھے۔ سارے گاؤں کی خیرات سے جہیز بنایا گیا تھا اور جہیز بھی کسی کام کا نہیں تھا۔ ''جہیز کم اور کاٹھ کباڑ کا سامان زیادہ لگ رہا ہے۔

''ساری زندگی نذر نیاز کے کھانے کھا کر لوگوں کے کپڑوں کی بچی کترنوں کو جوڑ کر کپڑے پہننے والوں کا نصیب اب بھی وہی فقیرانہ ہی رہا!''

منفی سوچوں نے نور فاطمہ کو ادھ موا کر رکھا تھا۔

نیناں کے بیش قیمت جہیز سے اپنے جہیز کا موازنہ کرتے وہ اپنے نصیب کی خوشی کو صحیح طور پر محسوس بھی نہ کر پائی تھی۔ نیناں نے جس رشتے کا ذکر کیا تھا وہ تو کسی کیل کی طرح نور فاطمہ کے کلیجے میں چبھ گیا تھا۔

''کنا چنگا ہوندا دونوں سہیلیاں اسلام آباد وچ رہندی!''

ایک اور سنہرا خواب دکھا کر وہ خود تو اپنی چمکتی دمکتی گاڑی میں اسلام آباد روانہ ہو گئی۔ جو اسے منہ دکھائی میں ملی تھی۔ جبکہ نور فاطمہ کے دل و دماغ کو اتنا منتشر کر گئی کہ گاؤں سوچان کی گلیوں بازاروں میں خاک اڑاتی خود کو فقیرنی سے بھی بدتر سمجھ رہی تھی۔ اس کی ذہنی حالت ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ بچپن سے کیے گئے اللہ کی ذات سے سارے شکوے مزید بڑھ گئے تھے۔

☆☆☆

''بجو...... تمہارا جوڑا کتنا پیارا ہے!'' ساری بہنیں اس کے شادی کے لہنگے کو بہت سراہ رہی تھیں۔ عائشہ کی ایک دور پار کی کزن نے محبت و چاہت میں اپنی طرف سے یہ لہنگا تحفتاً بھیجا تھا۔ سنہری تاروں اور موتیوں سے مزین وہ خوب صورتی میں اپنی مثال آپ تھا۔ جو دیکھ رہا تھا۔ نور فاطمہ کی قسمت پہ رشک کر رہا تھا۔

''فکر نہ کرو...... جب تم لوگوں کی باری آئے گی۔ تو اسی طرح ''مانگ تانگ'' کے ایک سے بڑھ کر ایک چیز مل جائے گی!''

شادی میں دو ہفتے رہ گئے تھے ویسے تو سب تیاری مکمل ہو گئی تھی مگر نور فاطمہ کی خواہشات امنگوں اور آرزوؤں کے مطابق تو کچھ نہ ہوا تھا۔

''یہ کوئی شادی ہے!'' وہ بہنوں کے سامنے کئی دنوں سے زہر اگل رہی تھی۔

''نہ ڈھولک، نہ رسم مہندی۔ نہ کوئی گیت گائے......!'' نور فاطمہ کی نگاہوں میں ابھی تک نیناں کی شاندار شادی کی رسومات سمائی ..نور

فاطمہ کی شکایتیں اور شکوے عائشہ کے کانوں تک بھی پہنچ رہے تھے...... پہلی بیٹی کی شادی کی خوشی تھی سو عائشہ خود کو ڈانٹ ڈپٹ سے روکے ہوئے تھیں۔ مگر اب ان کی برداشت ختم ہو گئی تھی۔

''نور حد ہوتی ہے ناشکرے پن کی۔'' سب کچھ آسانی اور سہولت سے ہو گیا تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی حاجت نہ پیش آئی تھی اور نہ ہی قرض مانگنا پڑا تھا۔ ضرورت کی ہر شے اللہ نے عطا کی تھی۔ جسے نور خیرات گردان رہی تھی۔

''میں بھی خلاف تھی تمہاری اور نیناں کی دوستی کے۔''

عائشہ کو شروع سے ہی دونوں کی دوستی پسند نہ تھی۔ ان کے مطابق دوستی برابر کے لوگوں میں ہی اچھی لگتی ہے۔ نیناں اور نور کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نیناں بہت آزاد خیال تھی۔ عائشہ کو یہی ڈر تھا کہ نیناں، کہیں نور فاطمہ کو بھی اپنے رنگ میں نہ ڈھال لے...... عائشہ کی سختیوں اور روک ٹوک نے بظاہر تو کچھ اثر نہ لینے دیا مگر ذہنی لحاظ سے نیناں کی باتوں نے نور فاطمہ کو خاصا منتشر کر دیا تھا احساس کمتری میں گھر کر وہ ناشکری بن گئی تھی۔

''نور اپنی سوچ کو بدل لو...... میں نہ سنوں کہ تم اپنی ناشکریوں کی وجہ سے آئندہ آنے والی زندگی میں خوشیوں سے محروم رہ جاؤ یا اپنا گھر خراب کر لو۔''

یہ ایک ماں کے اندیشے تھے۔ خدشات تھے جو اسے ہمہ وقت بے چین و مضطرب رکھتے تھے۔ وہ جانتی تھیں کہ نور حاسد فطرت نہیں تھی، بس اپنی محرومیوں اور حالات نے اسے ناشکرا بنا دیا تھا۔ عادت نے اسے حقیقی خوشیوں سے محروم کر دیا تھا۔ اس کے مطابق ہر خوشی دولت سے جڑی تھی۔ اس لیے نور اپنی شادی پہ حقیقی خوشی محسوس نہیں کر پا رہی تھی۔ اسے تو بس یہی لگ رہا تھا کہ اس کے سب خواب ادھورے رہ گئے تھے۔ بہت سی تمنائیں لاحاصل رہ گئیں۔ عائشہ نے بیٹی کی ناشکری اور بے چینی کو برداشت کر لیا تھا مگر سسرال کے حوالے سے سخت تنبیہ کر ڈالی تھی۔

''اپنی ناشکری اور بے چینی کو قابو میں رکھو...... اپنے سے اوپر والوں کو دیکھنے کے بجائے اپنے سے نیچے والوں کو دیکھو تو شاید تمہارے دماغ سے فتور نکل جائے!'' عائشہ بے حد صابر شاکر عورت تھیں۔ سو بیٹی سے بھی یہی امید تھی کہ وہ بھی اپنی نئی زندگی میں اپنے نصیب پہ راضی رہے۔

☆☆☆

نور فاطمہ رخصت ہو کر اس نئے قصبے ''ملکہ ہانس'' (پاکپتن) آ گئی تھی۔ وہ قصبہ جس کی مٹی میں محبت گندھی ہوتی ہے۔ وہ زمین جو سونا اگلتی ہے۔ جا بجا بکھرے ہوئے مکئی کے لہلہاتے کھیت کھلیان دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ ہر سو سونا بکھرا ہے۔ اور جب ان پر سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو .... سارا علاقہ اشرفیوں سے بنا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ وہ قصبہ ہے جہاں وارث شاہ نے ''ہیر'' لکھی تھی۔ اس کی فضا میں ''ہیر'' کی خوشبو رچی بسی تھی۔

گو کہ یہ نیا مسکن نور کی امنگوں اور آرزوؤں کے مطابق تو نہ تھا۔ وہ نیناں کے شہر اسلام آباد جیسا شاندار نہ تھا۔ نہ سہولیات ویسی جدید تھیں مگر وہ دلی طور پر راضی اور مطمئن ہو گئی تھی۔ اس کی بڑی وجہ شاید ماں کی نصیحتیں تھیں جنہوں نے دل پر اثر کیا تھا کہ وہ بے اطمینانی کی زد میں نہیں آیا تھا۔

عبداللہ کے گھر میں اس کا بڑا بھائی ہاشم اور اس کی بیوی سکینہ بھی اپنے بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ سکینہ ایک چلتر اور گھاگ عورت تھی جس نے ساس کی بیماری کا فائدہ اٹھا کر گھر پہ اپنی ''راجدھانی'' قائم کر لی تھی۔ اس وقت وہ ہی سارے گھر کی ''پردھان'' بنی ہوئی تھی۔ ہر حکم اسی کا چلتا تھا۔ یہاں تک کہ عبداللہ بھی بہت سے معاملات میں بھابھی کی اجازت کا محتاج تھا۔

نور فاطمہ نے محسوس کیا تھا کہ سکینہ بھابھی کا رویہ اس کے ساتھ بہت توہین آمیز اور حقارت و نفرت والا تھا۔ یوں کہ جیسے انہیں نور کی آمد اس گھر میں بالکل نہ بھائی ہو۔

☆☆☆

''اچھا تو تم ہو نور، جس نے ہمارے دیور کو اپنا

دیوانہ بنالیا تھا!''

عبداللہ کو نور پہلی نظر میں بھا گئی تھی۔ ورنہ اسے تو کوئی لڑکی ہی نہیں بھاتی تھی۔ نہ ہی کوئی دل میں اترتی تھی۔ عشرت پروین عبداللہ کو لڑکیاں دکھا دکھا کر تھک گئی تھیں۔ مگر عبداللہ کی نا، ہاں میں نہیں بدلتی تھی۔

''بھئی حسن تو وقتی ہوتا ہے یہاں جوانی ڈھلی اور ختم......!'' سکینہ اسے یہ جتانا چاہ رہی تھی کہ عبداللہ نے بڑے گھاٹے کا سودا کیا ہے۔

سکینہ کی باتوں نے نور کے دل کو عبداللہ کی طرف سے عجیب سے اندیشوں میں مبتلا کر دیا تھا۔

کچھ عبداللہ کی عادات بھی نور ابھی سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ بہت کم گو تھا۔ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار زیادہ نہیں کرتا تھا اس لیے بہت سی باتیں ناقابل فہم تھیں۔ وہ پورا ہفتہ کام کے سلسلے میں قصبے سے باہر رہتا تھا۔ جمعے کی شام کو لوٹتا تو ان دو ایک دنوں میں نور کے ساتھ بہت کم بات چیت ہوتی تھی۔ اس نے کبھی نور کی خوب صورتی کی تعریف نہ کی تھی۔ یوں جیسے اسے نور کا حسن دکھائی نہیں دیتا تھا۔

سکینہ بھابھی کی باتوں نے اسے عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کر دیا تھا۔ عبداللہ کے حوالے سے دل میں بہت سے خدشات بیٹھ گئے تھے۔ جبکہ عشرت پروین کا رویہ نور کے ساتھ بہت مشفقانہ تھا۔

''نور تم تو مجھے پہلی نظر میں ہی عبداللہ کے لیے پسند آ گئی تھیں۔'' عشرت پروین اکثر ہی ان الفاظ میں اپنی محبت اور چاہت کا اظہار کرتی تھیں۔ نور بھی بے لوث ہو کر ان کی خدمت کرتی تھی۔ وہ ٹانگوں کے عارضے میں مبتلا ہو کر بالکل بستر پر پڑ گئی تھیں۔ مگر نور ان کا ہر ممکن خیال رکھتی تھی۔ دونوں ساس بہو کے محبتوں کے مظاہرے سکینہ کو سیخ پا کر دیتے تھے۔

''ویسے نور تمہارے گاؤں سوچان میں تو کھانا پکانے کے لیے لکڑیاں جلانا پڑتی ہیں نا؟'' اس قصبے ملکہ ہاؤس میں سوئی گیس کی سہولت میسر تھی نور بھی زندگی میں پہلی بار سوئی گیس کا چولہا استعمال کر رہی تھی۔ بلکہ میکے جا کر ماں اور بہنوں کے سامنے خوشی سے اظہار کیا تھا۔

''اماں...... یہاں بٹن دباؤ اور یہ بڑی بڑی آگ والے دو چولہے ایک ساتھ جل جاتے ہیں۔'' وہ اتنی خوش ہوتی کہ عائشہ کے دل میں ڈھیروں سکون اتر جاتا کہ وہ اپنے سسرال میں راضی ہے۔

''اپنی مرضی سے جلاؤ۔ اپنی مرضی سے بند کرو...... نہ دھواں نہ کالک!''

البتہ سکینہ کی حاسد فطرت نور کو خوش دیکھ کر خوش نہ تھی۔ اسی لیے وہ اکثر احساس دلاتی رہتی تھی کہ تم ایک معمولی گھرانے کی بے حد معمولی سی بیٹی ہو۔

''توبہ توبہ...... لکڑیوں والا چولہا تو نرا عذاب ہے۔ سر منہ کالا ہاتھ پیر کالے تمہارے تو مزے ہو گئے دیورانی جی!'' سکینہ کا طنزیہ رویہ اور حقارت آمیز سلوک کبھی کبھار تو نور کو الجھا کر رکھ دیتا تھا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی تھی کہ آخر سکینہ کو اس سے کس بات کا بیر کا ہے۔ وہ کبھی عبداللہ کے سامنے دبے لفظوں سے اس بات کا ذکر بھی کرتی تو وہ یہ کہہ کر اسے خاموش کروا دیتا۔

''نور! وہ ہماری بڑی ہیں۔ ہمارے لیے قابل احترام ہیں۔ بڑوں کا احترام کرتے ہیں ان کے منہ نہیں لگا کرتے!'' عبداللہ بے حد صلح جو طبیعت کا مالک تھا۔ اس کے دل میں بھائی اور بھابھی کا بے حد احترام تھا۔ یہی وہ نور سے بھی چاہتا تھا۔ وہ نور کو یہی بات اکثر سمجھاتا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کر دیا کرو۔ اس سے گھر میں بدمزگی پھیلتی ہے۔

''دیورانی صاحبہ، یہاں اس علاقے میں پانی کا بل بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ ذرا ہاتھ ہولا رکھا کرو!'' وہ عبداللہ اور عشرت پروین کے کپڑے دھو رہی تھی جب سکینہ بھابھی اسے دیکھ کر طنز کرنا نہ بھولیں۔ آتے جاتے وہ اسے یہ جتاتی کہ تمہارے گاؤں میں تو نل نہیں بلکہ ہینڈ پمپ ہوتے ہیں۔ سکینہ کا رویہ کبھی اسے اتنا دلبرداشتہ کرتا کہ وہ رو پڑتی۔ اسے اپنی حیثیت کا شدت سے احساس ہوتا تو دکھ آنسوؤں کی شکل اختیار کر لیتا۔

☆☆☆

سکینہ کا تعلق ایک خوشحال گھرانے سے تھا اور سکینہ

میں اس بات کا فخر و غرور بھی تھا۔ اس کی چال ڈھال، انداز گفتگو سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ وہ نور کو اکثر کوئی نہ کوئی بات لے کر ذلیل و حقیر ہونے کا طعنہ دیتی تھی۔ نور ذہنی طور پر بہت پریشان رہنے لگی تھی۔
پہلے نیناں اور اب یہ سکینہ بھابھی۔ اسے پھر سے ناشکرا اور بے صبرا بنانا چاہتی تھیں۔ اس دوران نیناں اس کے گھر آئی تھی۔ بقول اس کے اپنی عزیز اور اکلوتی دوست کے بغیر اداس ہوگئی تھی۔ نیناں نے آتے ہی چند گھنٹوں میں اس کی شادی شدہ زندگی کا وہ حوصلہ شکن تبصرہ کیا کہ وہ دلی طور پر نڈھال ہوگئی۔
نیناں کے مطابق عبدالمتین اور عائشہ نے اپنی بیٹی نکمے اور عام سے لوگوں میں دے دی تھی۔ سارا دن وہ نوکرانی بن کر کام کرتی تھی۔ سکینہ بھابھی نے بہت چالاکی سے گھر بھر کے بہت سے کام نور کے حوالے کر دیے تھے۔ وہ تھکن سے چور ہو جاتی۔ اوپر سے سکینہ بھابھی کا حقارت آمیز رویہ اسے مزید توڑ دیتا۔
"نور مجھے تیری ساس بڑی میسنی اور گھنی عورت لگتی ہے۔ لگتا ہے۔ تجھے پسند ہی اس لیے کیا ہے کہ اپنی خدمت کروا سکے۔" یہ نیناں کا خیال تھا مگر نور اس سے متفق نہ تھی وہ ساس کے حوالے سے کسی بدگمانی کا شکار نہ تھی۔ وہ تو اسے بالکل بیٹیوں کی طرح چاہتی تھیں۔ عبداللہ کے حوالے سے بھی نیناں کا تبصرہ کافی تنقیدی تھا۔ لو بھلا یہ کیا زندگی ہوئی۔ میاں صاحب کو بیوی سے زیادہ اپنے کام کی فکر ہے۔ پورا ہفتہ شہر سے باہر رہے اور دو دن کے لیے آ کر پھر کام دھندے کے لیے روانہ ہو جاتا۔
"کس قدر بے رونق اور روکھی پھیکی زندگی ہے تم دونوں کی!" نیناں کے لہجے میں اپنی پرسکون زندگی کے حوالے سے فخر بھی تھا اور اپنے انتخاب پر ناز بھی۔
"کوئی حال نہیں تیرا نور..... شادی کے بعد بھی نہ طرز زندگی بدلا اور نہ ہی معیار زندگی!" نیناں نے اپنی شادی شدہ زندگی کے قصے بہت غرور سے بیان کیے تھے۔
"بھئی میں تو ملکہ اور رانیوں کی طرح رہتی ہوں۔ ساس، سسر، بلکہ شوہر تک مٹھی میں ہے۔ نندوں پہ بھی حکم چلتا ہے۔ ذاتی گاڑی، دھن دولت کیا نہیں ہے۔" نیناں نے آسودگی سے قہقہہ لگایا تھا۔
وقت بدل گیا تھا حالات بھی بدل گئے تھے مگر نیناں کا نصیب وہی روشن اور اعلیٰ رہا تھا۔ اور اس کا وہی محروم اور سسکتا نصیب۔ نیناں کو دیکھتے ہوئے اس نے دل میں چپکے سے سوچا تھا۔
اپنی شاندار گاڑی کی نمائش کرتے ہوئے نیناں نے گاڑی کی چابی انگلی پہ گھمائی تھی۔ نور نے احساس کمتری سے مغلوب ہو کر اپنی انگوٹھی والی انگلی دوپٹے میں چھپائی تھی کہ اسے کیا نہ دکھائی میں ملا تھا۔ معمولی سی سونے کی انگوٹھی۔ نیناں کی باتوں نے ظاہر کیا تھا کہ قسمت نے ایک بار پھر سے نور کے ساتھ مذاق ہی کیا تھا۔
"ایک پنڈ سے اٹھا کر دوجے پنڈ میں پھینک دیا۔"
رخصت ہوتے وقت نیناں نے اپنے شوہر کے دوست عاصم کا ذکر چھیڑ دیا تھا جو نور سے شادی کا خواہش مند تھا۔
"ابھی بھی تیرا پوچھتا ہے۔ سچ اگر تیری شادی اس سے ہو جاتی تو چاند اور سورج کی جوڑی ہوتی۔"
باتیں بہت اثر رکھتی ہیں۔ خاص طور پر ان لوگوں کے دلوں پہ یہ باتیں جادو کا اثر رکھتی ہیں۔ جو پہلے ہی کمزور ہوں۔ نیناں کی باتوں کا جادو چل گیا تھا۔ دل پھر سے وسوسوں کی زد میں آ کر بہت کچھ غلط سوچ کر اپنے نصیب کو کوسنے لگا تھا۔
"میرا نصیب تو ہمیشہ سے ہی "کھوٹا" تھا اور "کھوٹا" ہی رہے گا۔" نیناں کی باتوں نے ماں کا پڑھایا سبق پھر سے دھندلا دیا تھا۔

☆☆☆

دن اداسیوں کی زد میں گزرنے لگے تھے۔ گھر کے کاموں سے فراغت کے بعد نور کا زیادہ وقت عشرت پروین کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ وہ بہت زیادہ بیمار ہوگئی تھیں۔ پہلے لاٹھی کے سہارے چلتی تھیں مگر اب

تو اس کی بھی ہمت نہ رہی تھی۔ قدم اٹھانا دشوار ہو گیا تھا۔

''تکلیف زیادہ ہے اماں جی!'' گرم پانی میں نمک ملا کر عشرت پروین کی ٹانگوں کی ٹکور کرنے کے بعد اب گرم تیل سے مالش کر رہی تھی۔ یہ اس کا رات کا معمول تھا۔ ویسے بھی عبداللہ کا حکم تھا کہ اس کی ماں کا ہر ممکن خیال رکھنا اور خدمت کرنا۔ جیسے اپنی ماں سے محبت کرتی ہو ویسے ہی میری ماں سے بھی محبت کرنا...... اور نور تو پہلے ہی ساس کی دل و جان سے خدمت کرتی تھی۔

''اب تو میری ٹانگیں بالکل بیکار ہونے لگی ہیں!'' نور کے خیال اور خدمت سے تھوڑا سا سکون ملتا تو چہرے پر چند لمحوں کے لیے اس کا عکس دکھائی دیتا۔ ورنہ درد کی شدت سے وہ تڑپ جاتی تھیں۔ ان کی تکلیف پر نور بہت زیادہ گھبرا جاتی تھی۔

مرض اتنا بڑھ گیا تھا کہ ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ ''ایک ٹانگ کٹوانی پڑے گی ورنہ زہر پورے بدن میں پھیل سکتا ہے۔'' حکیم عبدالمتین سے علاج کے بعد وہ کافی بہتر ہو گئی تھیں۔ جس کا گواہ عبداللہ بھی تھا۔ عشرت پروین کی بگڑتی حالت تشویش ناک تھی۔

''آپ اب کس کی دوا لے رہی ہیں؟'' نور کا خیال تھا کہ شاید معالج بدل گیا ہے تبھی دوا بھی بدل گئی ہے۔

''تمہارے ابا کی!''

''مگر......!'' نور ابھی حیرت میں مبتلا تھی کہ سکینہ بھابھی دوا لے کر آ گئیں۔ باقی ساری ذمہ داری نور کے سر پر تھی مگر دوا کھلانے کی ذمے داری سکینہ نے اپنے ہاتھوں میں رکھی تھی۔ وہ اسے دوا کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتی تھی۔

''سکینہ بھابھی، ابا کی دکان سے دوا کون لے کر آتا ہے؟'' نور جب سے یہاں آئی تھی اس نے ایک بار بھی عشرت پروین کو دوا کے لیے گاؤں سو چان جاتے نہیں دیکھا تھا۔

''گو دامو یہ کام کرنے والا لڑکا!'' سکینہ بھابھی کے چہرے پر واضح ناگواری چھائی تھی انہیں نور کا سوال پسند نہیں آیا تھا۔ سکینہ بھابھی کے مطابق عشرت پروین چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی ہیں تو عبدالمتین کی ہدایت کے مطابق دوا منگوالی جاتی ہے یہ کہانی سکینہ بھابھی نے سنائی تھی۔ جبکہ نور اچھی طرح سے جانتی تھی کہ عبدالمتین کبھی بھی ایسے دوا نہیں دیتے تھے۔ وہ ہر ماہ مریض کی حالت کا اندازہ کر کے دوا دیتے تھے۔

''لائیے مجھے وہ دوا دکھائیے!'' نا جانے کیوں نور کا دل کسی گڑبڑ کی طرف اشارہ کرنے لگا تھا۔ وہ دوا دیکھ کر ایک بار اپنی تسلی کرنا چاہتی تھی کہ دوا لینے کے باوجود مرض کیوں شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اس نے رات بھر عشرت پروین کو دوا کھانے کے بعد تڑپتے بلکتے ہی دیکھا تھا۔

''وہ دوا ہی بھلا کیا جو سکون کے بجائے تکلیف دے!'' یہ عبدالمتین کے الفاظ تھے ان کی پہلی خوراک سے ہی مریض کو قرار آ جاتا تھا۔ جس کی گواہ نور بھی تھی مگر عشرت کی حالت تو ایسی ہوتی تھی جیسے جان نزع کے عذاب سے گزر رہی ہوں۔

''ماں جی ان سے کہہ دیں کہ مجھے دوا دکھا دیں۔ مجھے تسلی ہو جائے گی!''

نور جانتی تھی کہ وہ یہ معرکہ اکیلے سر نہ کر سکے گی۔ سکینہ بھابھی جیسی چلتر عورت آسانی سے آمادہ نہیں ہوں گی۔

''کہا نا کہ تمہارے ابا کی دی ہوئی دوا ہے۔ پھر اس بات کی بے اعتباری ہے!'' سکینہ بھابھی دل کا چور چھپانے کے لیے بدلحاظی پر اتر آئی تھیں۔

''جھوٹا اور دھوکے باز جس کی چوری پکڑی جائے وہ ہمیشہ بدلحاظی اور بدتمیزی سے دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرتا ہے!'' یہ عائشہ اکثر کہتی تھیں۔ جس کا عملی مظاہرہ نور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔

سکینہ بھابھی جانتی تھیں کہ نور حکیم کی بیٹی تھی اور حکمت کی سوجھ بوجھ بھی رکھتی تھی۔ ابھی کچھ دنوں پہلے سکینہ کو زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا تھا تو نور نے ہی اس کا زہر اتارا تھا۔ عبداللہ کے سر میں چند روز پہلے بے

تحاشا درد تھا..... نور کے ٹوٹکوں سے افاقہ ہوا تھا۔ محلے کی اکثر عورتیں نور سے مشورہ لینے آیا کرتی تھیں۔ وہ مسیحا عبدالمتین کی بیٹی تھی سو "دست مسیحائی" رکھتی تھی۔

"میری نور کو حکمت کی گہری سوجھ بوجھ ہے!"

عشرت پروین یہ دیکھ کر نہال ہو جایا کرتی تھیں۔ انہیں اپنے انتخاب پہ فخر ہونے لگتا تھا۔

"دکھا دو سکینہ..... اس کی تسلی ہو جائے گی!"

اب تو جیسے سکینہ کی جان پہ بن گئی۔ ان کے پاس دوسرا راستہ کوئی نہ تھا۔ اسی اثنا میں نور کے کمرے میں فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ عبداللہ شہر سے باہر ہوا کرتا تھا اور وہ اکثر فون کیا کرتا تھا نور کو لگا کہ اس وقت بھی عبداللہ کا فون ہے اور اس کا فائدہ اٹھاتے سکینہ ہمیشہ کی طرح دوا کھلانے میں کامیاب ہو گئی۔"

☆☆☆

"آپ نور فاطمہ ہیں.....؟"

"آپ کون.....؟"

"عاصم ملک.....!"

"کون عاصم.....!"

"نیناں نے آپ سے میرا ذکر کیا ہوگا۔ اس کے شوہر کا دوست ہوں!" تعارف اتنا مکمل تھا کہ مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ نور کو فوراً پتا چل گیا تھا کہ یہ موصوف کون ہیں اور یقیناً اسے نمبر بھی نیناں ہی نے دیا تھا۔ نور کو نیناں پر سخت غصہ آرہا تھا کہ ایک غیر مرد کو اس کا نمبر دے دیا تھا۔

"دیکھیے عاصم صاحب میں شادی شدہ ہوں۔ نیناں نے آپ کو یہ نہیں بتایا؟" نور قدرے تیکھے انداز میں گویا ہوئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ نیناں سے خوب جھگڑا کرے کہ کیوں ایک "نامحرم" شخص کو اس کا نمبر دیا تھا۔

"مس نور! میں جانتا ہوں مگر میں کیا کروں۔ آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ اتنا خوب صورت اور حسین چہرہ میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا!" عاصم نے بڑی بے باکی سے اپنے جذبات کا اظہار کیا تو نور اپنی جگہ لرز کر رہ گئی۔ وہ بے حد حسین تھی مگر آج سے پہلے اسے کسی نے ان الفاظ میں احساس نہیں دلایا تھا۔ یہاں تک کہ عبداللہ نے بھی اس انداز میں اظہار نہیں کیا تھا۔

ابھی نا جانے کتنی دیر وہ عاصم ملک کی فسوں خیز باتوں میں گم رہتی۔ کہ اچانک عبداللہ کی آمد پر اسے فون بند کرنا پڑا۔ مگر عاصم کی گمبھیر آواز کی بازگشت اس کی سماعتوں میں گونجتی رہی۔ اس کا ایک ایک لفظ کسی "آسیب" کی طرح نور کے پیچھے لگ گیا تھا۔

"آسیب بھی اسی وجود کو اپنا مسکن بناتے ہیں۔ جن کو اپنے لیے سازگار پاتے ہیں۔"

☆☆☆

"آپ بات کو سمجھ کیوں نہیں رہے کہ میں شادی شدہ ہوں۔" عاصم مستقل مزاجی کے ساتھ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گیا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر فون کرنے لگا تھا۔ نور نظر انداز کرتے ہوئے بھی دھیان دینے پہ مجبور ہو گئی تھی۔ شاید شعوری یا لاشعوری طور پر۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا میں صرف آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔" عاصم پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

چند روز پہلے نور نے نیناں سے اس بات پر خوب جھگڑا کیا تھا کہ کیوں ایک غیر شخص کو میرا نمبر دیا ہے۔ اور نیناں ازل کی ڈھیٹ تھی۔ شرمندہ ہونے کے بجائے ہنسنے لگی۔

"پگلی آج کل ایسی دوستیاں عام ہیں۔ میرے بھی کئی دوست ہیں!" اس کا جواب بے باکیوں کا آئینہ دار تھا۔

عاصم کی باتوں کا اثر تھا یا نیناں کی دوستی کا غلط رنگ جو نور پر چڑھنے لگا تھا۔ دل کے کسی گوشے میں کوئی چور چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ شاید دنیا والوں کی نظروں سے چھپ کر۔ جو اسے عاصم کی میٹھی میٹھی باتیں اچھی لگنے لگی تھیں۔ نور فاطمہ، عائشہ کا پڑھایا سبق بھولنے لگی تھی۔

"باتیں ہی کرتا ہے کون سا مجھے کھا جائے گا!" نیناں کی تسلیوں نے دل کو اور شیر کر دیا تھا اب وہ عاصم کی باتوں پر دھیان بھی دینے لگی تھی۔

جو عمل چوری چوری، چپکے چپکے کیا جائے اس کے بارے میں خیال ہوتا ہے کہ وہ عمل دنیا والوں کی نظروں

سے چھپا ہوا ہے۔ سات پردوں میں ہے مگر یہ محض بھول ہوتی ہے چوری ایک نہ ایک دن کھل جاتی ہے۔

انہی سوچوں میں گم وہ کافی دیر سے جاگ رہی تھی۔ دل کے چور اور ضمیر کا زبردست جھگڑا چل رہا تھا۔ غلط اور صحیح کی بحث زوروں پہ تھی۔ دونوں ہی اپنے اپنے موقف پر ڈٹے تھے۔ نور کو اس جنگ میں اپنا آپ جکڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اسی پل ٹھک، ٹھک کی آواز پر چونکی تھی۔ گھر کے سب افراد سو رہے تھے۔ یہاں تک کہ زمینوں پہ کام کرنے والے لڑکے بھی گودام میں غفلت کی نیند سو رہے تھے۔ چند روز پہلے بھی اسے ایسی آوازیں سنائی دیں۔ مگر وہ شدید غنودگی کے عالم میں اٹھ کر باہر نہ آسکی تھی مگر آج وہ جاگ رہی تھی اور مکمل حواسوں میں تھی۔

وہ باہر نکل آئی۔ باہر مکمل اندھیرا تھا۔ کمروں کے آگے برآمدہ اور اس کے آگے کشادہ مٹی کا صحن تھا جہاں مکمل سکوت تھا۔ مگر اس سکوت کو چیرتی وقفے وقفے سے یہ آواز آرہی تھی۔ کون تھا؟ لمحہ بھر کے لیے نور کو خیال آیا کہ کہیں چور تو نہیں جو رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر اپنی خفیہ سرگرمی میں مصروف تھا۔ رفتہ رفتہ آواز میں تیزی آرہی تھی۔ آواز صحن کے آخری کونے میں موجود چھوٹے سے اسٹور سے آرہی تھی۔ نور کے قدم اسی جانب بڑھ گئے۔ سامنے کا منظر اسے دم بخود کر گیا سکینہ بھابھی پسینے میں شرابور ننگے فرش پر بیٹھی ہاون دستے میں کچھ کوٹ رہی تھیں۔

''وہ میرے پیٹ میں درد ہو رہا تھا تو ہاضمے کے لیے چٹنی بنانے آئی تھی!'' نور کو دیکھ کر سکینہ بھابھی گھبرا کر بولی تھیں مگر اسے ان کی وضاحت بس اک بہانہ لگی تھی وہ بھی بے حد بھونڈا سا۔

''تو مجھے کہہ دیا ہوتا۔'' نور کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک ٹوٹکے اور نسخے تھے جس کا تجربہ سکینہ بھابھی کو ہو چکا تھا مگر آج ان کی ہر حرکت پر اسرار تھی۔ اس سے پہلے کہ نور مزید کچھ کہتی۔ انہوں نے وہ دوا لفافے میں ڈالی جس کو وہ چٹنی کہہ رہی تھیں اور نظریں چراتے ہوئے باہر نکل گئیں۔ نور حیران پریشان اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔

جب دماغ نے کچھ کام کیا تو وہ بجلی کی تیزی سے ہاون دستے کی جانب لپکی جس میں ابھی وہ سفوف نما چیز موجود تھی۔ نور نے انگلی پر لگا کر وہ چیز سونگھی اور نوک زبان پہ لگایا تو اگلے لمحے ہی تھوک دیا۔

نور کو جڑی بوٹیوں کی بے حد پہچان تھی اور وہ ان کے فوائد و نقصان سے خوب واقف تھی۔

صبح اس واقعے کو لے کر گھر میں ایک طوفان برپا تھا۔ نور کے مطابق سکینہ بھابھی عشرت پروین کو ایسی جڑی بوٹیوں کی دوا تیار کر کے دیتی تھیں جو زہریلی تھیں جن کے استعمال سے پہلے مریض معذور ہو کر بستر سے لگ جاتا اور پھر رفتہ رفتہ موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ نور کے مطابق عشرت پروین کا مرض انہی جڑی بوٹیوں کی وجہ سے بگڑا تھا۔ سکینہ بھابھی نے اس بات کو الزام قرار دیتے ہوئے خود کو پیٹ پیٹ کر ہلکان کر لیا تھا۔ پہلے وہ نور کے ساتھ خوب زبان درازی کرتی رہیں۔ جھوٹی قسمیں کھاتی رہیں۔ اپنا دفاع خود کرتی رہیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ نور کی باتوں میں وزن ہے تو اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

''اللہ مجھے برباد کر دے اگر میں نے ماں جی کو کوئی زہریلی دوا کھلائی ہو۔'' صورت حال انتہائی سنگین ہو گئی تھی۔ گھر کا ہر فرد الجھ کر رہ گیا تھا۔ کہ کون سچ بول رہا ہے اور کون جھوٹ۔ جب بات زیادہ بگڑنے لگی تو عبداللہ بھابھی کی حمایت میں میدان میں اتر آیا۔ نور اسے یقین دلاتی رہ گئی مگر عبداللہ نے اس جھگڑے کو دیورانی جیٹھانی کا جھگڑا قرار دے کر طیش کے عالم میں نور پر ہاتھ بھی اٹھا لیا اور اسے میکے چھوڑ آیا۔

''جب آپ کی بیٹی کا دماغ ٹھکانے آجائے گا تو میں اسے لینے آجاؤں گا!''

عبداللہ کے مطابق نور نے بے بنیاد اور بغیر ثبوت کے سکینہ بھابھی پر الزام لگا کر گھر کا ماحول خراب کیا ہے جب تک وہ اس الزام کو واپس لے کر بھابھی سے معافی نہیں مانگے گی وہ گھر واپس نہیں آسکتی۔

☆☆☆

سوگواریت لیے زندگی کے ایام بے رنگ و بے کیف گزرنے لگے تھے۔ نور نے اس واقعے کے بعد زبان پہ قفل خاموشی لگالیا۔ گاؤں سوچان کے گھر گھر میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ نور کو سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا ہے۔

عبدالمتین اور عائشہ اصل صورت حال سے ناواقف تھے اس بات کو بے حد ذلت محسوس کر رہے تھے۔

''بیٹیاں تو سسرال میں ماں باپ کا مان ہوا کرتی ہیں۔''

عبدالمتین بے حد غمگین تھے۔ وہ جو نور کو بے پناہ چاہتے تھے۔ نور کی حمایت میں عائشہ کی بات کو بھی نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ جس پر عائشہ اکثر شکوہ کرتی تھیں۔

''آپ نے نور کو بے جا لاڈ پیار کر کے بگاڑ دیا ہے۔''

آج انہیں احساس ہو رہا تھا کہ واقعی انہوں نے نور کو بگاڑ دیا ہے کہ وہ سسرال میں جھگڑا کر کے آ گئی ہے۔ عائشہ بھی اٹھتے بیٹھتے نور کو کوستی رہتی تھیں۔

نور سر جھکائے آنسو ضبط کیے ہر ایک کی سنتی رہی مگر کسی بات کی وضاحت نہ کی تھی۔ جب انسان سچا ہو اور اسے لوگ جھوٹا قرار دیں تو وہ غم سے نڈھال ہو جاتا ہے پھر کسی کے سامنے وضاحت پیش کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ اسے عبداللہ کے رویے نے بے حد دکھ پہنچایا تھا۔ اس نے اس کی بات کا یقین نہ کیا تھا اور نہ ہی حمایت کی تھی۔ بلکہ اسے ''جھوٹا'' کہہ کر اس پر ہاتھ بھی اٹھایا تھا۔

خاموشی کی سیاہ چادر پہنے وہ گھٹنوں پہ سر رکھے اپنے نصیبوں کو رو رہی تھی کہ کچھ الفاظ اس کی سماعت میں اترے تو وہ یکدم سکتے کی کیفیت سے باہر نکل آئی۔

''چوہدری صاحب کی بیٹی کو طلاق ہو گئی ہے!'' یہ گاؤں کی کوئی عورت تھی جو عائشہ سے باتیں کر رہی تھی۔

نور کو گاؤں سوچان آئے ہوئے مہینہ ہو گیا تھا مگر اس دوران ایک بار بھی نیناں سے رابطہ نہ ہو سکا تھا۔ اب یہ خبر سننے کی دیر تھی کہ نور خود کو نیناں کی حویلی جانے سے روک نہ پائی۔

نیناں کو اس کے شوہر عباس نے طلاق دے دی تھی اور اس بری طرح سے مار پیٹ کی تھی کہ اس کے دماغ پہ چوٹ آئی تھی۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ نیناں اپنی یادداشت کھو بیٹھی تھی...... نور کے لیے یہ سب کچھ بہت حیران کن تھا۔ کیونکہ نیناں تو اپنے گھر میں بے حد خوش تھی۔ وہ تو سسرال میں راج کر رہی تھی۔ وہ تو ہمیشہ سے قسمت کی ''دھنی'' تھی کہ ہر ایک کو اپنے قابو میں کر لیتی تھی۔ پھر یہ اچانک طلاق تک معاملہ کیوں پہنچا تھا۔ نیناں نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑی تھی زرد رنگت، آنکھوں کے گرد حلقے وہ صدیوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ بدن ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔

چوہدرانی کا رو رو کر برا حال تھا۔ ان کے مطابق نیناں کا شوہر شرابی، جواری اور ایک بدکردار انسان تھا۔ جس پر اکثر دونوں کا جھگڑا رہتا تھا۔

''عاصم تو خود بدمعاش آدمی تھا۔ میری نیناں کا تو کسی کے ساتھ چکر نہیں تھا وہ تو پاک دامن ہے!''

چوہدرانی کے منہ سے یہ الفاظ سن کر نور فاطمہ پتھر بن گئی تھی۔ نیناں کے شوہر نے اس پر الزام لگایا تھا کہ وہ ایک ''بدکردار'' عورت ہے اور اس نے چپکے چپکے اس کے کئی دوستوں سے دوستی کر لی تھی اور غلط راستوں پہ چل پڑی تھی۔ اسی وجہ سے اس نے نیناں کو طلاق دے دی۔

کون سچا تھا اور کون جھوٹا۔ کسی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی چوہدری اور چوہدرانی کسی کو صحیح بات پتا چلنے دے رہے تھے، ان کے مطابق ان کی بیٹی معصوم، مظلوم، بھولی اور پاک دامن بھی...... جبکہ اس کا شوہر عیاش مرد تھا، نور فاطمہ خود اس بات کی گواہ تھی کہ نیناں نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ اس کی کئی مردوں سے دوستیاں ہیں اور ایسی دوستیاں تو آج کل عام ہیں اور عاصم ملک تو نیناں کے توسط سے نور کے پیچھے پڑا تھا، ہاں البتہ یہ انکشاف نور پہ اب ہوا تھا کہ وہ بیک وقت دونوں سہیلیوں سے ''کھیل'' رہا تھا، یہ سوچ کر نور کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔

''اگر اس ''خفیہ کھیل'' کے بارے میں عبداللہ کو پتا چل جاتا تو......؟''

''اگر عبدالمتین اور عائشہ تک اس کی خبر پہنچ جاتی

تو......؟"

"عشرت پروین کو علم ہو جاتا تو......؟"

بہت سے سوالات دل و دماغ کی اندھیری گلیوں میں وحشیانہ رقص کرنے لگے تو نور اس تصور سے بھی اندر ہی اندر لرز کر رہ گئی۔

"بس جی سارا کھیڈ نصیباں دا ہے۔"

یہ گاؤں کی کسی عورت کے دکھ بھرے الفاظ تھے، جو نور کی سماعتوں سے آندھی کی طرح ٹکرائے تھے، بظاہر اونچے نصیبوں والی نظر آنے والی نیناں کس بری طرح سے عرش سے فرش پہ پٹخ دی گئی تھی۔ آج وہ اس حال میں تھی کہ نہ مردوں میں تھی اور نہ ہی زندوں میں......

اس کی دولت جس پہ وہ اتراتی تھی اور جس کی نمود و نمائش نور کو ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا رکھتی تھی، آج وہ اس کے کسی کام کی نہ تھی، ڈاکٹروں نے اسے لاعلاج قرار دے دیا تھا، اس کے نصیب کی اونچائی اور اس کے اونچے برجوں والی حویلی کو دیکھ کر نور ہمیشہ حسرت و یاس میں مبتلا رہتی تھی اللہ سے شکوے شکایتیں کیا کرتی تھی، آج نیناں کی حالت دیکھ کر گاؤں کی ہر عورت تو کیا نور بھی کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھی۔

"میرا نصیب تو رب نے خاص سیاہی سے رکھا ہے۔ میرا نصیب تو آسمان جتنا اونچا ہے۔" چشم تصور میں نیناں کے قہقہے تھے۔

☆☆☆

حویلی کے کشادہ صحن کے وسط میں لگے آم کے گھنے درخت سے بندھے جھولے پہ بیٹھی قہقہے لگاتی اور پوری طاقت کے ساتھ زور زور سے جھولے لیتی۔ یوں نظر آتی تھی کہ جیسے آسمان کی وسعتوں کو چھونے کی کوشش کر رہی ہے، اس کے قہقہوں میں عجیب سا فخر و غرور نمایاں ہوا کرتا تھا اور پیچھے کھڑی نور فاطمہ اپنی حیثیت اپنی پستی پہ دل ہی دل میں جل کڑھ رہی ہوتی تھی اور اپنے نصیبوں کو کوس رہی ہوتی تھی کہ کاش وہ بھی کسی امیر باپ کی بیٹی ہوتی، زمینوں، جائیدادوں والے باپ کی پھر وہ بھی گردن اکڑا کر یوں نیناں کی طرح فخر والی زندگی گزار رہی ہوتی۔

عاصم نامی شخص اس کے پیچھے بھی پڑ گیا تھا مگر اللہ نے اس کا پردہ رکھ لیا تھا۔ جبکہ نیناں کا پردہ فاش ہو گیا تھا۔ وہ شرم کے مارے اندر ہی اندر گڑنے لگی تھی کہ نیناں کے پیچھے چل کر غلط راستوں پہ آ نکلی تھی۔ وہ راستے جن کی کوئی منزل نہ تھی۔ وہ تو ماں باپ کی دعائیں تھیں کہ اللہ نے اس کی پردہ پوشی کر لی۔ وہ نقصان سے پہلے ہی سنبھل گئی تھی۔ عبداللہ سمیت کسی کو بھی علم نہیں ہوا تھا کہ اس نے بھی ایک غیر شخص کی باتیں سنی تھیں۔ جو بے باکی سے اس کے حسن کے قصیدے پڑھتا تھا۔

عائشہ نے ہمیشہ اس کی دوستی کی مخالفت کی تھی۔ نیناں اور ان کے ماحول، عادات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مگر وہ آج دل میں اقرار کر رہی تھی کہ ماں ٹھیک کہتی تھی۔ ماں باپ اپنی اولاد کو گھٹن نہیں بلکہ تربیت دیتے۔ ان کے اچھے برے کی فکر کرتے ہیں کہ کل کو اولاد کسی مشکل میں نہ گرفتار ہو......تاکہ وہ اپنے لیے اور ماں باپ کے لیے کسی آزمائش کا باعث نہ بنے۔ نیناں ایک آزاد خیال لڑکی تھی ماں باپ کی غلط تربیت نے اسے بے راہ روی کا شکار کر دیا تھا۔

نصیبوں کے اس سارے "کھیل" پہ غور و فکر کرتی نور عجیب کیفیت سے گزر رہی تھی۔ شاید وہ "شکر" کی کیفیت تھی۔ مگر ابھی وہ اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔ اسی پل دروازے پہ دستک ہوئی۔ یہ دستک عام نوعیت کی نہ تھی۔ نور کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکا تھا۔

عبداللہ اور عشرت پروین اسے لینے آئے تھے۔ بہت سی حقیقتیں ان پر واضح ہو گئی تھیں۔ ہاشم نے سکینہ کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ واقعی عشرت پروین کو مارنا چاہتی تھی......تاکہ سارے گھر پر اس حکمرانی ہو۔ عشرت پروین کو راستے سے ہٹانے کی یہی چال سمجھ میں آئی تھی کہ بیماری کے لیے دوا کھلائی جائے تاکہ مریض رفتہ رفتہ خود ہی موت کے منہ میں چلا جائے گا اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ عبدالحسین سے علاج کے بعد عشرت پروین کی حالت بہتر ہونے

لگی تو سکینہ ہوشیار ہوگئی۔ اس نے چپکے سے عبدالمتین کی دوا بند کردی اور کسی سے پوچھ کر وہ زہریلی دوا تیار کرنے لگی۔ یہ بھی کہانی جھوٹی تھی کہ عبدالمتین نے کہا ہے کہ دوا کسی لڑکے کو بھیج کر منگوالیا کرو۔

نور کو سکینہ اس لیے پسند نہیں کرتی تھی کہ عبداللہ کے لیے اپنی چھوٹی بہن کو لانا مقصود تھا۔ جب عبداللہ کی زندگی میں نور شامل ہوگئی تو سکینہ نے نور کے ساتھ بدسلوکی شروع کردی تاکہ وہ خود ہی گھربار چھوڑ کر چلی جائے۔ سکینہ دونوں منصوبوں پر بہت چالاکی سے کام کر رہی تھی مگر نور کی مداخلت نے اس کا ہر منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ نصیب کی ایسی مار پڑی کہ طلاق کا طوق اس کے گلے میں ڈال دیا گیا۔

”عائشہ بہن! میں اپنی نور کو لینے آئی ہوں۔ اس کے بغیر تو میرے گھر میں اجالا ہی نہیں......“ عشرت پروین کے لہجے میں محبت کی شیرینی گھلی تھی۔ عائشہ دل ہی دل میں شکر ادا کررہی تھیں کہ بیٹی کا گھر برباد ہونے سے بچ گیا۔

عائشہ اور عبدالمتین کو جب اصل بات پتا چلی تو ان کے دل سے نور کے لیے بدگمانی دور ہوگئی۔ بلکہ عائشہ کو اپنی تربیت اور عبدالمتین کو اپنی محبت پر فخر ہورہا تھا۔ ان کی بیٹی نے سسرال میں بھی ان کا مان رکھا تھا۔ بلکہ عشرت پروین کی جان بچائی تھی اور سکینہ کا اصل چہرہ سب کے سامنے آگیا تھا۔ عبداللہ نے عالم طیش میں نور کو گھر سے تو نکال دیا مگر دھیان اس کے آنسوؤں میں الجھا رہ گیا۔ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ اتنے عرصے میں وہ اتنا جان گیا تھا کہ نور بے حد سمجھدار اور نیک لڑکی تھی۔ دل کی گواہی پر وہ اتنا بے تاب ہوا کہ وہ دوا کسی ماہر معالج کو دکھائی جو اپنے علم میں بہت ماہر تھا، نور نے بالکل درست کہا تھا وہ دوا زہریلی تھی۔

”نور! تم میری محبت نہیں...... میرا عشق ہو۔ تمہارے بغیر تو میں جینے کا تصور نہیں کرسکتا......“ عبداللہ نے پہلی بار اپنے جذبات کی یوں ترجمانی کی تھی کہ نور اپنی جگہ حیران رہ گئی تھی وہ تو اندر اندر عبداللہ کے روکھے رویے سے بہت دکھی تھی۔ عبداللہ کی خاموشی نے نور کے دل کو بدگمان کردیا تھا۔ اس صورت حال میں سکینہ نے بھی نور کے دل کو برا کرنا چاہا تھا کہ تم خالص عشرت پروین کی پسند ہو۔ عبداللہ کو تم میں دلچسپی ہوتی تو وہ ایسا رویہ کیوں کرتا۔

”میرا شوہر تو میرا دیوانہ ہے!“ نیناں کی شوخیوں پر نور کا دل مغموم ہوجاتا تھا۔

”عبداللہ پورا ہفتہ گھر سے باہر رہتا ہے کہیں اور تو دل نہیں لگالیا!“ یہ سکینہ بھابھی کی باتیں تھیں جن سے وہ مسلسل نور کو عبداللہ سے دور کررہی تھیں۔ عبداللہ کی طرف سے اندیشے اور وسوسے اتنے بڑھے کہ نہ جانے کس کمزور لمحے میں اس کا رجحان عاصم کی طرف ہوگیا۔ مگر قدرت نے اسے کسی بڑی غلطی اور کوتاہی سے پہلے ہی بچالیا تھا۔ عائشہ ہمیشہ کہا کرتی تھیں نور نصیب سے شکوہ نہیں کرتے۔ بس اللہ کی رضا میں راضی رہتے اور شکر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ جو بچپن سے اپنے نصیب پر نوحہ کناں تھی آج شکر ادا کررہی تھی کہ وہ مہرباں ہستی تو ہمیشہ سے مہربان تھی یہ انسان ہی ناشکری کرتا ہے اور اپنے نصیب کا رونا روتا رہتا ہے۔ جبکہ بظاہر تو نیناں اور سکینہ بہت اونچے نصیب کی لگتی تھیں۔ مگر آج احساس ہوا کہ وہ دونوں تو صرف نور کو پریشان کرتی تھیں اور نور ان کی باتوں پر خوامخواہ رو رو کر ہلکان ہوجاتی اور خدا سے شکوہ کناں ہوتی۔

آج نیناں اور سکینہ کا راز فاش ہوگیا تھا۔ وہ دونوں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی تھیں۔ عاصم والا معاملہ بھی نیناں کی دوستی کا ایک تحفہ تھا۔ جسے نور نے اپنی بے وقوفی میں نیناں کا خلوص سمجھا تھا۔ بلکہ نصیب تو نور کا روشن اور چمک دار تھا۔

پہلی بار زندگی میں وہ اللہ کے حضور پورے خلوص سے سجدہ شکر ادا کررہی تھی۔ عبداللہ کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے وہ عشق کی سرزمین ”ملکہ ہانس“ کی بڑھ گئی۔ آج دل میں اللہ سے شکوے نہیں بس شکر ہی شکر تھا۔



زینب نور

بدلے گا زمانہ

''اف..... مہنگائی تو اس قدر ہو گئی ہے کہ دام پوچھ کر ہی پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ وزیراعظم صاحب تو مہنگائی والی پتنگ کو گویا کسی سے شرط لگا کر اڑا رہے ہیں اور ہمیں تو یقین واثق ہے کہ جیت جائیں گے۔ ارے کوئی تو ہو ڈور کاٹنے والا۔''

فائزہ بھابھی شاپنگ سے خوب تھکی ہاری لوٹی تھیں۔ ایک تو مہنگائی اوپر سے تھکاوٹ نے ان کے دماغ کو کھولا دیا تھا۔ بڑے بڑے شاپروں سے کپڑے نکالتے ہوئے دل کی بھڑاس بھی خوب نکال رہی تھیں۔ اور وہ تینوں کپڑوں کو الٹ پلٹ کر کے



دیکھ رہی تھیں۔ کپڑے اچھے تھے مگر ایسے نہیں تھے جیسے انہیں چاہیے تھے۔

''واؤ...... یہ دکھائیں بھابھی! یہ سوٹ پیارا ہے۔''صدف نے ہاتھ بڑھا کر شاپر سے آخری سوٹ نکالا۔ تو فائزہ بھابھی نے فوراً جھپٹ لیا۔

''بھئی، یہ تو مجھے پسند آیا تھا اور اپنے لیے ہی لائی ہوں۔ یہ باقی سوٹ پڑے ہیں، ان میں سے دیکھ لو۔ جو بھی پسند آئے۔''

''اس سوٹ کا رنگ اور ڈیزائن تو بالکل بڑی عمر کی خواتین کے پہننے والا ہے بھابھی!'' صبا بھی اپنی رائے دینے لگی۔

''دکھانا ذرا...... کہاں بڑھاپا اترا ہے اس پہ؟'' بھابھی نے اسے گھورا اور بغور جوڑے کو دیکھنے لگیں۔

''بھابھی! تینوں سوٹ پھیکے رنگ کے ہیں اور رنگ بھی وہ جو مجھ پہ بالکل بھی نہیں جچے۔'' صدف نے ناک چڑھائی۔

''اگلی بار تمہاری تصویر ساتھ لے کر جاؤں گی۔''

''جو رنگ جچے گا، وہ لے آؤں گی۔'' بھابھی نے اطمینان سے کہا تو وہ بل کھا کر رہ گئی۔

''اپنے کپڑے لیتے ہوئے بڑا پتا چل جاتا ہے، ڈیزائن اور رنگوں کا۔'' وہ سوچتی پاؤں پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

بھابھی بری تو نہیں تھیں۔ اماں ابا کے یکے بعد دیگرے گزر جانے کے بعد جس طرح انہوں نے ان تینوں بہنوں کو سنبھالا تھا وہ قابل تعریف تھا۔ بلکہ جہاں کسی خواہش کے پورا ہونے میں بھائی آڑے آتے تو بھابھی سامنے ہو جاتیں۔ بس جب ان کے ساتھ لائن میں کھڑی ہوتیں تو ان کی پہلی ترجیح ان کی اپنی ذات ہوتی تھی۔ دوسری لڑکیوں کے برعکس وہ تینوں ہی شاپنگ کی چور تھیں۔ اس لیے بھی کبھی یہ کام وہ بھابھی کے سپرد کر دیتیں۔ مگر بھابھی ڈنڈی مار جاتیں۔

اب بھی صدف اسی بات پہ غصہ کر کے اٹھ آئی تھی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ کچھ دیر بعد وہی صدف ہوگی، وہی بھابھی اور وہی ہنسی مذاق اور قہقہے۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی ہی تھی کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔ اسکرین پہ بلنک ہوتا نام دیکھ کر ذہن سے ساری کثافت اڑن چھو ہو گئی۔

''السلام علیکم!'' کال اٹینڈ کرتے ہی اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام۔ کیسی ہو بھئی؟ کہاں گم رہتی ہو؟ کل سے ایک میسج تک نہیں آیا تمہارا۔'' اسپیکر سے شکوہ کرتی بھاری مردانہ آواز گونجی۔

''الحمدللہ ٹھیک ہوں۔ گھر میں ہی تھی، دراصل بھابھی آج بازار گئی تھیں تو میں سارا دن غنویٰ کے ساتھ مصروف رہی۔ اس لیے موقع ہی نہیں ملا آپ سے بات کرنے کا۔'' صفائی دیتے لہجے میں کہا۔

''ہمم...... اگر بھابھی آج شاپنگ کرنے گئی تھیں تو پھر یقیناً آج تمہارا موڈ اپ سیٹ ہوگا۔'' سامنے والا جیسے اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ اس نے گہری سانس بھری۔

''وہ بھی کیا کریں حسن! مہنگائی نے ضرورتوں کے منہ بند کر رکھے ہیں۔ یہ تو پھر ہماری خواہشیں ہیں۔ اللہ جانے ہمارے حکمران پاکستان کا اور کتنا خون چوسیں گے۔''

''صدف! سب ایسے ہی ہوتے ہیں، جس کو ذرا سا بھی اختیار مل جائے تو وہ سب سے پہلے ''اپنی ذات'' کے بارے میں سوچتا ہے۔ باقی سب لوگ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب فائزہ بھابھی کی ہی مثال لے لو......'' وہ جھنجلا گئی۔

''ایسا نہیں ہونا چاہیے حسن! حکمران کو سب سے پہلے اپنی عوام کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ''حضرت عمرؓ کے پاس اقتدار آیا تو انہوں نے کیا کہا تھا بھلا؟ کہ اگر نہر فرات کے کنارے کوئی بکری بھی

(بھوک کی وجہ سے) مر گئی تو عمر تکل، قیامت کے دن اپنے رب کی عدالت میں جواب دہ ہوگا۔" وہ بھی تو حکمران تھے۔ ہمارے حکمران ان کے نقش قدم پر کیوں نہیں چلتے؟" اس کی سوئی ابھی بھی وہیں اٹکی تھی۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا کہ جو چل رہا ہے وہ ٹھیک ہے۔ جانتا ہوں کہ پاکستان میں ہونے والی ستر فیصد خودکشی کی وجہ معاشی تنگی ہے۔ جو حکمرانوں کی ہی مرہون منت ہے۔ میں تمہیں صرف یہ سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ جس کو ذرا سا بھی اختیار مل جائے، اس کی پہلی ترجیح خود اپنی ذات ہوتی ہے۔ اگر تم اس سیٹ پر آ جاؤ تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم بھی ایسی ہی ہو جاؤ گی۔" اس نے کہا تو وہ فوراً برا مان گئی۔

"جی نہیں...... اگر مجھے صرف چھ ماہ کے لیے بھی اقتدار اور اختیار مل جائے ناں تو دیکھیے گا آپ...... میں پورے پاکستان کا نقشہ بدل دوں گی۔ دیکھیے گا آپ...... نظام بدل دوں گی میں نظام......" اس کے جوش سے کہنے پہ وہ ہنسا۔

"تم جس سیٹ پر ہو اس سیٹ پر رہ کر بھی نظام بدل سکتی ہو۔"

"کیا مطلب؟ اب کیسے بدل سکتی ہوں نظام؟ میرے اختیار میں بھلا کیا ہے اب؟" وہ حیران ہوئی۔

"جب کبھی تمہارے اختیار میں کچھ ہو تو پھر خود کو آزمانا کہ کیا تم انفرادی طور پر اس بات کا ثبوت دے رہی ہو کہ تمہارے نزدیک تمہاری پہلی ترجیح "تمہاری اپنی ذات نہیں" بلکہ کوئی اور ہے...... پھر خود کو بہتر بنانے اور ثابت کرنے کی کوشش کرنا۔"

"اچھا...... میں اکیلی بھلا کیا کرلوں گی؟"

"بہت کچھ...... کیونکہ ہم بدلیں گے تو بدلے گا زمانہ۔" آخر میں اس نے ہلکا پھلکا سا انداز اپنایا تھا۔ چند ثانیے کی خاموشی کے بعد وہ پھر بولا۔

"تمہاری تائی اماں یاد کر رہی تھیں تم لوگوں کو کہ دو دن سے بچیوں نے شکل نہیں دکھائی۔" اس کے لہجے میں بھی شکوہ سا تھا۔ وہ شرمندہ ہوئی۔

"کل آنے کا ارادہ ہے، ان شاء اللہ۔" مدھم آواز سے کہا۔ پھر چند رسمی باتوں کے بعد اس نے کال کاٹ دی۔

☆☆☆

"بھابھی! میں اور صبا تائی امی کی طرف جا رہے ہیں۔" صدف کی اطلاع پر بھابھی نے سر اٹھایا اور مسکرا دیں۔

"ہاں جاؤ۔ پرسوں بھی میں گئی تو یاد کر رہی تھیں تمہیں۔ لگتا ہے تائی امی کو اپنی بہو کچھ زیادہ ہی یاد آنے لگی ہے۔" وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولیں تو صدف بھی مسکرا دی۔

صبا کو ساتھ لیے وہ اگلی گلی میں موجود تائی امی کے گھر آ گئی۔ گیٹ سے داخل ہوتے ہی اس کی نظریں اوپر اٹھیں۔ حسن اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے پا کر فوراً ماتھے تک ہاتھ لے جا کر مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ وہ بھی مسکرا دی۔

تائی امی مل کر بہت خوش ہوئیں۔ سب کا حال احوال پوچھا۔ کچھ دیر تائی امی کے پاس بیٹھنے کے بعد صبا نازیہ کے کمرے میں چلی گئی اور وہ کچن میں ہادیہ کے پاس آ گئی۔

"ڈفر...... پانچ منٹ کے ویٹ کا کہہ کر اتنی دیر سے گھسی ہوئی ہو یہاں۔" صدف نے آتے ہی اسے ایک دھموکا جڑا، وہ بلبلا اٹھی۔

"بس آ ہی رہی تھی افلاطون کی اولاد۔" ہادیہ نے کمر سہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟" اسے ڈونگے میں سے ایک الگ پیالے میں رس ملائی نکال کر فریج میں رکھتے دیکھا تو صدف نے اچنبھے سے پوچھا۔

"بھئی، اپنے لیے نکال کر رکھ رہی ہوں۔ میرے خیال میں یہ رس ملائی کم پڑ جائے گی۔ اس لیے اپنی پہلے ہی نکال لی۔" ہادیہ نے مزے سے

جواب دیا۔
"اگر جو دوسروں کو کم پڑ گئی تو......" اس نے سوال کیا۔
"تو پڑتی رہے، میری بلا سے......" ہادیہ نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

☆☆☆

وہ کپڑے پریس کر کے لاؤنج میں آئی تو صفا جو آج کل پیپرز سے فارغ ہو کر ایک پرائیوٹ اسکول میں ٹیچنگ کا شوق پورا کر رہی تھی۔ ابھی آ کے بیٹھی تھی۔ بھابھی صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے کنپٹیاں دبا رہی تھیں۔
"کیا ہوا بھابھی! سر میں درد ہے" وہ جلدی سے قریب آئی اور تشویش سے پوچھا۔
"ہمم...... کافی دیر سے ہو رہا ہے۔" وہ ہولے سے بولیں۔
"دبادوں؟"
"ارے نہیں چندا! چائے بنا سکتی ہو تو بنا دو۔"
بھابھی نے کہا تو وہ فوراً کچن میں چلی آئی۔ پانی چڑھا کر دودھ والی پتیلی نکالی۔
"اوہ نو...... یہ دودھ تو کم ہے۔" وہ بڑبڑائی۔
دراصل اس کا اپنا دل بھی چاہ رہا تھا چائے پینے کا۔
"چلو دو کپ تو بنیں گے ناں۔" دودھ ناپ کر اسے تسلی ہوئی۔ اسی اثنا میں صفا آن دھمکی۔
"صدف باجی! چائے بنا رہی ہیں تو میرے لیے بھی ایک کپ بنا دینا۔ بچوں کو پڑھا پڑھا کر دماغ پلپلا ہو جاتا ہے قسم سے۔ اتنی تھکاوٹ محسوس ہو رہی ہے۔"
"پیاری ٹیچر جی! دودھ نہیں ہے۔ اس لیے معذرت۔" صدف کی بات پر صفا نے اچک کر پتیلی میں جھانکا۔
"باجی! دو کپ تو بن ہی جائیں گے۔"
"ہاں جی...... دو کپ۔ ایک میرا اور ایک بھابھی کا۔" صدف کے جواب پر وہ پاؤں پٹختی وہاں سے واک آؤٹ کر گئی۔ صدف نے تسلی سے چائے بنائی اور ایک پین کلر کے ساتھ دو کپ ٹرے میں رکھے لاؤنج میں آ گئی۔

☆☆☆

"یہ لیں بھابھی! یہ پین کلر بھی لے لیں اور آرام کر لیں کچھ دیر۔" اس نے محبت سے کہا تو بھابھی نے تشکر سے اسے دیکھا۔ وہ اپنا کپ اٹھا کر صوفے پر آ بیٹھی۔ نظر اچانک صفا کے روٹھے روٹھے چہرے پر پڑی جو ٹی وی کی جانب متوجہ تھی۔ پھر بھی ناراضی کا بھرپور تاثر دے رہی تھی۔
اس نے ایک نظر اپنے کپ پر ڈالی اور دوسری نظر صفا پر۔ پھر اچانک اٹھ کر اس کے سامنے آ گئی۔
"یہ لو چائے۔" صفا نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
"یا الٰہی خیر۔ صدف باجی کب سے یہ قربانیاں دینے لگیں۔"
"پکڑ لو...... یا پی لوں پھر میں؟" صدف کے کہنے پر اس نے جلدی سے کپ پکڑ لیا کہ مبادا وہ بیچ میں ہاتھ پیچھے نہ کر لے کیونکہ اس وقت اسے شدت سے چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ صدف کے صوفے پر بیٹھ جانے کے بعد اس نے کپ لبوں سے لگایا۔
"ویسے یہ اتنی مہربانیاں کس لیے؟" وہ ابھی تک حیران تھی۔
"اس لیے کہ...... ہم بدلیں گے تو بدلے گا زمانہ۔"
صدف نے کہا تو وہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر سر جھٹک کر چائے سے لطف اندوز ہونے لگی۔



مکمل ناول

سرف میں بھیگے کپڑے جلدی سے کھنگال کر پھیلاتے ہوئے وہ بار بار ایک ہی بات سوچ رہی تھی، دھیان کا پرندہ نہ جانے کون سے آسمان پر پرواز کر رہا تھا کہ وہ بالکل بھول ہی گئی کہ امل کا یونی فارم کل سے سرف میں بھیگا ہوا ہے۔ اس وقت تو وہ یونی فارم استری کر رہی ہوتی تھی مگر اب کی بار تو حد ہی ہوگئی۔ کل پیر کا دن تھا۔ امل کو اسکول جانا تھا اور یونی فارم دھونا اسے یاد ہی نہیں رہا۔ اب صبح صبح استری کرنا پڑے گا۔ سونے کے لیے بیڈ پر آتے ہوئے کنول نے سوچا۔

''امل! تم نے اپنا اسکول بیگ تیار کرلیا؟''

''جی مما!'' امل ویڈیو گیم میں مگن تھی۔

''اب یہ گیم آف کرو، صبح جلدی اٹھنا ہے اسکول جانا ہے۔'' چادر کا کونا ٹھیک کرتے ہوئے اس نے امل کو تاکید کی۔

''جی مما! بس ایک منٹ۔''

جب تک کنول نے لائٹ آف کر کے زیرو کا بلب آن کیا، امل نے ویڈیو گیم آف کر کے رکھ دیا تھا۔

''مما!'' نیم تاریکی میں امل نے اسے مخاطب کیا۔

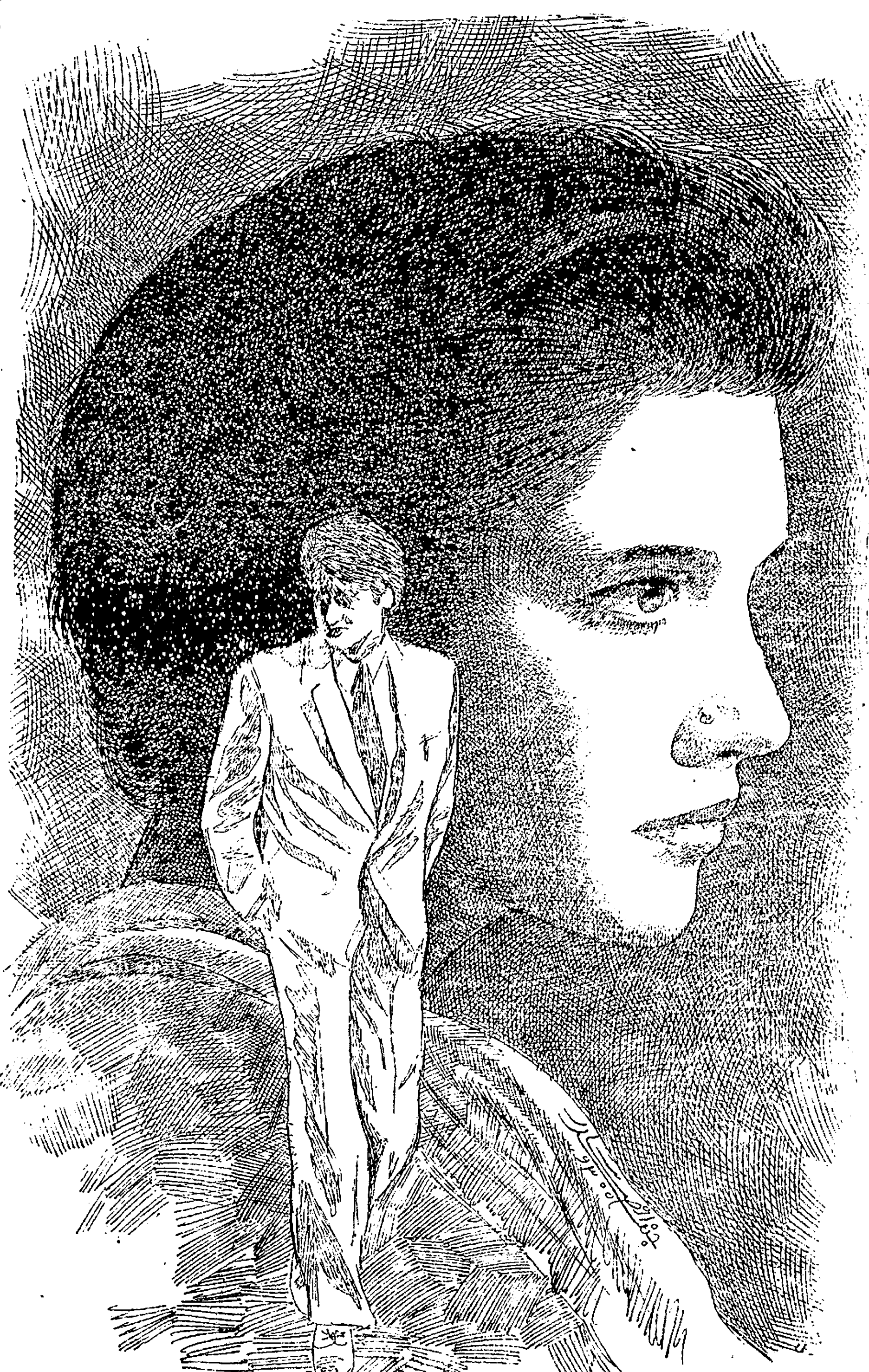
''ہوں!''

دادی جان کہہ رہی تھیں کہ اگلے ہفتے وہ قرآن خوانی کریں گی، پاپا کی برسی ہے نا۔

نعیمہ ناز

آدم و حوا کا ساتھ





''ہاں!'' کنول کے منہ سے ایک آہ نکلی......دو سال یوں گزرے تھے جیسے دو صدیاں گزر گئی ہوں۔ گزرے وقت کے جلتے بجھتے ستارے سے اس کی نظروں کے سامنے سے گزر گئے۔

''چلو اب سو جاؤ، صبح اسکول جانا ہے۔'' آنکھوں میں آئی نمی کو صاف کرتے ہوئے اس نے امل کو تھپکا۔

''آیت الکرسی اور قل پڑھ لیے؟''

''جی......!''

کنول دھیرے دھیرے بیٹی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔ آٹھ سال پہلے وہ اس گھر میں آئی تھی سوچو تو جیسے کل کی سی بات لگتی تھی۔ خالصتاً ارینج میرج، محض تصاویر میں دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا پھر شادی کے موقع پر اور دونوں ایک دوسرے کے اسیر ہو گئے تھے۔

کنول کی موہنی صورت اور خوش اخلاق طبیعت نے عامر سمیت سب کا ہی دل موہ لیا تھا اور عامر کے والہانہ لگاؤ اور شوخ و شریر مزاج نے کنول کی زندگی کو گل و گلزار بنا دیا تھا۔ مگر شادی کے چھٹے سال ایک خوفناک کار ایکسیڈنٹ نے کنول سمیت سب کے ہونٹوں کی ہنسی چھین لی، عامر کی اچانک وفات نے کنول کی زندگی اندھیر کر دی پانچ سالہ امل کو دیکھ دیکھ کر وہ رو بھی رہی تھی اور جی بھی رہی تھی۔

☆☆☆

ڈھائی سو گز کے پلاٹ پہ بنا گھر کنول کے مرحوم سسر نے بیٹوں کی شادی سے پہلے ہی بنوالیا تھا۔ نیچے کے پورشن میں کنول کے جیٹھ جٹھانی اور ساس مقیم تھے۔ اوپر کا پورشن کنول اور عامر کو دے دیا گیا تھا۔

عامر سے چھوٹا فاخر ملائیشیا میں تھا۔ تیسری منزل پہ بنا اس کا پورشن فی الحال خالی تھا۔ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ سال ڈیڑھ سال میں چھٹیوں پر آتا تو نیچے ہی قیام کرتا۔ اس بار وہ ایک سال بعد آ رہا تھا۔

پچھلے برس عامر کی پہلی برسی پر آیا تھا۔ اب دوسرے برس پھر دو ہفتوں کی مختصر چھٹی پر آیا تھا۔

قرآن خوانی کے دن صبح سے ہی مصروفیت کا آغاز ہو گیا تھا۔ کنول کی چاروں شادی شدہ نندیں اپنے بچوں سمیت ایک دن پہلے ہی آ گئی تھیں۔ رات دیر تک سب جاگتے رہے اور عامر کی باتیں یاد کر کر کے، دہرا کے آبدیدہ ہوتے رہے۔

کنول صبح اٹھتے ہی کاموں میں لگ گئی، پچھلے سال کا تجربہ اسے یاد تھا۔ عامر کی پہلی برسی کے موقع پر، وہ صبح سے نیچے ہی تھی بھابھی کے ساتھ ساتھ گھر کے اور کچن کے کام کروائے۔ مہمان ماشاء اللہ کافی تھے۔ چاروں نندوں اور ان کے بچوں کے علاوہ عامر کی ایک پھوپھو، خالہ نانی اور ممانی بھی رکی ہوئی تھیں۔ سب کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا، پھر کچن کی صفائی، اس نے حتی المقدور بھابھی کا ہاتھ بٹایا۔ سہ پہر میں قرآن خوانی شروع ہو گئی۔ وہ سپارہ پڑھ رہی تھی جب بڑی آپا اس سے پوچھنے لگیں۔

''شام کے لیے کیا بنایا ہے تم نے؟''

''شام کے لیے؟'' ایک لمحے کو تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا پھر اسے خیال ہوا کہ شاید وہ رات کے کھانے کا پوچھ رہی ہیں۔

''بریانی کی دیگیں فاخر نے منگوائی ہیں۔ ایک مدرسے کی، ایک یتیم خانے کی اور ایک گھر کے لیے۔'' آہستہ سے مگر تفصیل سے کنول نے جواب دیا۔

''وہ تو مجھے معلوم ہے۔ میں تو ان کھانوں کی بات کر رہی ہوں جو عامر کو پسند تھے، تم نے اس کی پسند کی کوئی ڈش نہیں بنائی؟'' مولوی صاحب کو بھجوانے کے لیے۔''

''اچھا میں بنالوں گی۔'' کنول نے سر ہلایا۔ ایک سپارہ پڑھ کر وہ اٹھ گئی پھر جو وہ کچن میں گھسی تو سارا وقت کھانے اور چولہے کی نذر ہی ہو گیا۔

اب دوسری برسی پر اس نے پہلے ہی سے سب

کچھ پکانے کا فیصلہ کرلیا کیونکہ اگر نہیں بناتی تو اعتراض لازمی کیا جاتا۔ عامر کی پسند کا مٹن پلاؤ، شامی کباب، دہی بڑے، چکن کڑاہی اور میٹھے میں رس ملائی، ایک ایک ڈش بنا کر اس نے فریج میں رکھ دیں۔ تیزی سے ہاتھ چلاتے چلاتے بھی دوپہر ہو گئی۔ نیچے گئی تو ایک بجنے والا تھا۔

"بڑی دیر لگادی، کیا کر رہی تھیں اوپر؟ مہمان تو سارے نیچے آئے ہوئے ہیں۔" چھوٹی آپا نے اپنی بچی کا پیمپر بدلتے ہوئے اعتراض جڑا۔

کنول نے وجہ بتائی تو وہ خاموش ہوگئیں۔

بھابھی کچن میں دوپہر کے کھانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ کنول ان کے ساتھ لگ گئی۔ وہ آلو گوشت کا سالن اور کالی دال چاول بنا رہی تھیں۔ ساس کے لیے پرہیزی کھانا الگ بنایا تھا۔ گھر میں باری باری گوشت اور دال گلا کر جلدی جلدی دونوں نے کھانا تیار کرلیا آخر میں وہ سلاد بنا رہی تھی جب بھابھی نے دوسری تیسری بار پھر تشکر کا اظہار کیا۔

"تم بہت اچھی ہو کنول! حالانکہ عامر کے بعد اب تمہارا کوئی فرض یا ذمے داری تو نہیں بنتی مگر پھر بھی تم ہر موقعے پہ بہت ہیلپ کروادیتی ہو۔" بھابھی نے آلو گوشت کا شوربہ چیک کیا اور اس میں گرم مسالہ اور ہرا دھنیا چھڑکا۔

"کیا فرق پڑتا ہے بھابھی! مصروفیت میں وقت اچھا گزر جاتا ہے ورنہ تو کبھی کبھی وقت جیسے کٹتا ہی نہیں۔" سادگی سے بولتے ہوئے کنول سلاد کی اشیاء مکس کرنے لگی۔

"ہاں، وقت کاٹنا تو یقیناً مشکل ہوتا ہوگا۔" بھابھی نے دل گرفتی کے عالم میں اسے دیکھا۔ بمشکل اٹھارہ سال کی تھی جب وہ شادی ہو کر آئی تھی۔ اس وقت تو اس کا جوبن کچھ اور ہی تھا مگر وقت اور حالات نے کوئی بڑا تغیر یا غیر معمولی تبدیلی اس میں پیدا نہیں کی تھی، اس کے چہرے کی تازگی اور نکھار اب بھی قائم تھا۔

"آگے کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟" دبے لہجے میں انہوں نے سوال کیا۔

"سوچ رہی ہوں، اسکول میں جاب کر لوں، کچھ وقت بھی کٹ جائے گا اور دل بھی بہل جائے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، مگر اس طرح کب تک وقت کاٹو گی اور گزارو گی؟ آگے پوری زندگی پڑی ہے۔" بھابھی اسے جو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں وہ کنول کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

"بھابھی! ابھی تک تو کبھی کبھی یقین بھی نہیں آتا، کبھی ایسا لگتا ہے کہ شام میں اپنے مخصوص ٹائم پر آفس سے آجائیں گے، جب یقین ہی نہیں آتا تو کوئی اور خیال کیسے آئے گا۔" کنول افسردہ ہوگئی۔

''بھئی کھانا تیار ہوگیا؟ ہم بڑوں کا تو خیر کوئی مسئلہ نہیں بچے بھوک سے بلبلا رہے ہیں۔'' بڑی آپا نے اچانک ہی کچن میں اپنی دھواں دھار انٹری دی تھی۔

''کھانا تیار ہے آپا؟'' بھابھی نے دم پہ رکھے چاول چمچے سے الٹ پلٹ کیے اور چولہا بند کر دیا۔

''چلو پھر میں دسترخوان بچھاتی ہوں اور بچوں کو بھیجتی ہوں برتن لگواؤ۔''

کھانا کھا کر پھر وہی کچن کی صفائی، برتن وغیرہ دھو کر رکھے تو سہ پہر ہوگئی تھی۔ محلے سے خواتین اور لڑکیاں آنا شروع ہوگئی تھیں سب سیپارے پڑھنے بیٹھ گئے۔ شام میں کنول وہ ساری ڈشیں اوپر سے نیچے لے آئی جو اس نے تیار کی تھیں۔ اس میں سے مناسب مقدار میں کھانا نکال کر مسجد بھجوایا، باقی سب گھر والوں نے تھوڑا تھوڑا چکھ لیا۔

''ارے یہ کیا بھابھی، ایک ہی کباب ملا اور رس ملائی پہ بھی راشن بندی تھی۔'' رات میں کھانے کے بعد سب سے بڑے بہنوئی نے زوردار ڈکار لیتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''شاکر بھائی، یہ تو بس مسجد میں بھیجنے کے لیے تھوڑی تھوڑی سی چیزیں بنائی تھیں، اس میں سے بچ گئیں تو سب کو چکھا دیں۔'' کنول نے آہستگی سے جواب دیا۔

''ارے بھئی جب بنا ہی رہی تھیں تو کچھ زیادہ ہی بنا لیتیں، تمہارے ہاتھ میں تو بڑا ذائقہ ہے، پیٹ بھر جاتا ہے مگر نیت نہیں بھرتی۔''

برسی کا کھانا، حلق تک ٹھونس کر وہ بڑی ڈھٹائی سے بول رہے تھے، کنول بغیر کچھ کہے وہاں سے ہٹ گئی مگر اس کا دل بوجھل ہو چلا تھا۔ کسی کی زندگی لٹ گئی اور لوگوں کو کھانے پینے کا ایسا ہوکا ہے کہ لحاظ، شرم، احساس، سب بالائے طاق رکھ دیا۔

اسے تو یہ سب پکاتے ہوئے بھی بڑا عجیب لگ رہا تھا، وہ سوچ رہی تھی کہ جانے والوں کو ہماری دعاؤں کی ضرورت ہوتی ہے یا ہمارے پکائے رنگ برنگ کے کھانوں اور شربات کی؟ مگر وہ بھی ایک عام سی انسان تھی، ناگواری اور ناپسندیدگی محسوس کرتے ہوئے بھی محض دنیاداری اور خلق خدا کی زبانوں کے خوف سے اسے یہ سب کرنا پڑا۔

رات کھانے کے بعد بھابھی سب کے لیے چائے بنا رہی تھیں، کنول مگ نکال نکال کر ٹرے میں رکھنے لگی، تقریباً پچیس تیس افراد تھے۔ نیچے کپ کم پڑے، تو وہ اوپر سے اپنے مگ لے آئی۔

''شاکر بھائی کو دیکھا، کیسی دیدہ ہوائی باتیں کر رہے تھے، شروع سے ہی ایسے ہیں، کھانے اور باتیں بنانے میں ماہر۔'' چائے چھانتے ہوئے بھابھی نے شاکر بھائی پہ غائبانہ لعن طعن کی۔

''کس کی زبان پکڑ سکتے ہیں بھابھی؟ اپنا ہی منہ بند کر کے رکھنا پڑتا ہے۔'' کنول کے خوب صورت چہرے پہ اداسی پھیلی ہوئی تھی۔

''کوئی ان سے پوچھے تم برسی میں آئے ہو یا کسی دعوت میں، زبان کے چٹخارے پورے کرنے؟ اللہ بچائے ایسے کھانوں سے، جن میں انسان کے آنسوؤں کی ملاوٹ ہو۔''

بھابھی جلے دل کے پھپھولے اس گھر میں اس کے سامنے پھوڑتی تھیں۔

دو سال پہلے کی پھانس ابھی تک ان کے دل میں گڑی ہوئی تھی۔ ہمارے معاشرے اور لوگوں کے تضادات خوشی اور غمی کے موقع پر بھی کھل کر سامنے آتے ہیں۔ اپنی روزمرہ عام زندگی میں ہم جن باتوں پر ناگواری کا اظہار کرتے ہیں جن معاملات کو برا سمجھتے ہیں، انہیں اس وقت گوارا اور جائز کر لیتے ہیں جب وہ ہمارے اپنے اوپر بیتتی ہیں، اس وقت جرات مندانہ اختلافی قدم اٹھانے کے بجائے ہر کوئی حالات کی رو میں بہہ جاتا ہے، اکثریت ادھر ہی چلتی ہے جدھر کی ہوا ہوتی ہے۔

عامر کی وفات کے وقت بھی یہی ہوا، سب گھر والوں پہ قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ عامر کی تجہیز و تکفین کے انتظامات ہو رہے تھے گھر کے اندر

شتے دار اور محلے دار خواتین بیٹھی سپارے اور گٹھلیاں پڑھ رہی تھیں۔

''کڑوی روٹی تو آذر (بڑے بھائی) کی سسرال سے آئے گی نا؟'' کسی بزرگ خاتون نے شوشا چھوڑا۔ (یہ بھی عجیب رواج ہے کہ سمدھیانے سے کھانا آئے گا مگر صرف بیٹے کی سسرال سے، بیٹی کے نہیں)

''ہاں ہاں، یہ تو سمدھیانے والوں کی ذمے داری ہے، پہلے دن کا کھانا ان ہی کی طرف سے آتا ہے۔'' چھوٹی آپا کی ساس نے جواب دیا پھر مزید بولیں۔

''اللہ بخشے جب حامد کے ابا فوت ہوئے تو کڑوی روٹی یہیں سے گئی تھی۔ نام تو کڑوی روٹی کا ہے، آج کل تو چکن بریانی کی دیگ آتی ہے۔'' ایک اور خاتون نے نسبتاً دھیمی آواز میں سرگوشی کی، بھابھی کے کانوں میں بھی سب آوازیں پڑ رہی تھیں، پھر بڑی آپا کی نند پہلے ہی ان سے پوچھ چکی تھیں یا شاید یاد دلانا اور جتانا مقصود تھا۔

''کڑوی روٹی تو آپ کے گھر سے آئے گی نا؟''

''جی!'' اثبات میں جواب دے تو دیا مگر زندگی کی تلخ حقیقت تھی کہ جوان دیور کی اچانک موت کا غم پس منظر میں چلا گیا، انہیں یہ فکر ہوگئی کہ کسی طرح اپنے چھوٹے بھائی کو پیغام پہنچا دیں کہ ایسے سب کے کھانے کا بندوبست کرنا ہے۔ ماں بیوہ تھیں، ان سے چھوٹا بھائی تھا اور چار بہنیں اور، سفید پوشی کا بھرم قائم تھا بس یہی بہت تھا۔

ظفر سنتے ہی پریشان ہوگیا کہ اتنے افراد، جن کے لیے کم از کم تین دیگیں چاہیے تھیں، وہ کہاں سے لائے؟ بھابھی نے اپنی کمیٹی کے رکھے تیس ہزار روپے اسے دیے۔

''باجی، میں بہت جلد لوٹا دوں گا آپ کو۔'' ظفر بے چارہ شرمندہ ہو رہا تھا۔

''جلدی کی ضرورت نہیں، آرام سے واپس کر دینا۔'' بھابھی نے اپنے پاس سے رقم دے کر میکے کا بھرم رکھا تھا مگر انہیں سسرال والوں سے شکایت تھی کہ وہ چاہتے تو انکار کر سکتے تھے مگر کسی نے منع نہیں کیا نہ ساس نندوں نے، نہ شوہر نے، فاخر اس وقت یہاں تھا نہیں، وہ دو دن بعد ایمرجنسی چھٹی لے کر آسکا تھا۔ وہ ہوتا تو ضرور انکار کرتا، اس کا مزاج اور طبیعت باقی گھر والوں سے ذرا مختلف تھی۔

امل دن بھر کی جاگی اور تھکی ہوئی تھی۔ نیند آئی تو لاؤنج میں ہی قالین پر لڑھک گئی، کنول اوپر جا رہی تھی، اس کے اٹھانے سے پہلے ہی فاخر نے امل کو گود میں اٹھا لیا۔

''آپ رہنے دیں بھابھی! میں لے جاتا ہوں امل کو۔''

''ہاں ہاں، تم پہنچا دو، اب بھابھی بے چاری کہاں اسے لاد کر سیڑھیاں چڑھیں گی۔'' کنول کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سب سے چھوٹی نند بول پڑی۔ جو بہنوں میں سب سے چھوٹی اور فاخر سے بڑی تھی۔

فاخر، امل کو لے کر اوپر آگیا۔

''کہاں لٹانا ہے اسے؟''

''بیڈ پہ لٹا دو، میرے ساتھ ہی سوتی ہے۔''

فاخر امل کو لٹا رہا تھا کہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''چاچو......!''

''جی چاچو کی جان!''

''آپ ہمارے ساتھ سوئیں گے؟''

''اونہوں!'' فاخر نے نفی میں سر ہلایا۔

''امل اپنی مما کے ساتھ سوئے گی یہاں، ہم اپنی مما کے پاس نیچے سوئیں گے۔''

''اپنی مما کے پاس؟ دادی کے پاس، آپ چھوٹے سے بچے ہیں کیا؟'' امل ہنسی۔

''ہاں نا، میں اپنی امی کا چھوٹا سا بیٹا ہوں۔'' فاخر نے اسے گدگدایا۔

''چلو اب آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ، شاباش۔''

''آپ نے پرامس کیا تھا میری ڈرائنگ بک

دیکھیں گے، اتنے پیارے پیارے کلر کیے ہیں میں نے۔'' امل کو اس وقت نہ جانے کیا کیا کچھ یاد آ رہا تھا۔

''امل! چاچو کو کل دکھا دینا ڈرائنگ بک، اب آپ سو جاؤ، چاچو بھی نیچے جا کر سوئیں گے، تھکے ہوئے ہیں۔'' کنول نے ملائمت سے بیٹی کو مخاطب کیا۔

''اچھا مما!'' امل نے فرماں برداری دکھائی اور آنکھیں موندیں۔

''گڈ نائٹ چاچو! گڈ نائٹ مما!''

''گڈ نائٹ!'' فاخر نے جھک کر اس کی پیشانی چومی اور بیڈروم سے باہر نکل گیا۔

نیچے بڑی آپا، کسی کو مخاطب کیے بغیر خود کلامی کر رہی تھیں۔

''بڑی دیر لگا دی فاخر نے؟''

کسی اور کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فاخر آ گیا۔ ماں کی نظریں بلا ارادہ ہی بیٹے کا چہرہ کھوجنے لگیں جو لاپروائی سے صوفے پہ آڑا ترچھا ہو کر لیٹ گیا تھا۔

☆☆☆

کاشی نے کولر سے گلاس میں پانی بھرا اور کھڑے کھڑے پینے لگا۔

''ہائیں، ہائیں، یہ کیا کر رہے ہو کاشی، ایسے پیتے ہیں پانی کھڑے ہو کر؟'' دادی جان دور ہی سے چلائیں۔

''سوری دادی جان!'' کاشی جلدی سے بیٹھ گیا۔ ویسے تو دادی کے سکھائے ہوئے اسباق اسے ازبر تھے مگر اس وقت پیاس کا غلبہ تھا، سب بھول گیا۔ اب اس نے دوبارہ بسم اللہ پڑھی، تین سانس میں پانی پیا اور پی کر اللہ کا شکر ادا کیا۔

کاشی تو پانی پی کر پھر سے گیند اچھالنے لگا، دادی اپنے بیٹے کو لے کر بیٹھ گئیں۔

''زہرا (بڑی آپا) نے کچھ لڑکیوں کی تصویریں دی ہیں، اچھے گھرانوں کی ہیں، تم بھی دیکھ کر اپنی رائے دے دو۔'' انہوں نے تکیے کے نیچے سے لفافہ نکال کر فاخر کی طرف بڑھایا۔

فاخر لفافے سے تصاویر نکال کر دیکھنے لگا۔ چار تصاویر تھیں، ہر تصویر کے پیچھے لڑکی کا نام اور عمر، تعلیم وغیرہ لکھے تھے۔

''شادی لڑکیاں اچھی ہیں۔'' فاخر نے لفافہ انہیں واپس دیا۔

''اب سب سے تو ہو نہیں سکتی میاں صاحب زادے! کوئی ایک بتا دو۔''

''کوئی ایک؟'' فاخر سوچ میں پڑ گیا۔

''ایسا کریں امی! ابھی رہنے دیں، اگلی بار آؤں گا پھر دیکھیں گے۔'' فاخر یکایک سنجیدہ ہو گیا۔

''اگلی بار کیوں، ابھی کیوں نہیں؟'' ماں کی تجربہ کار پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ ''تیس سال کے ہونے والے ہو، میرا عامر یوں ناگہانی دنیا سے نہیں جاتا تو دو سال پہلے ہی تمہارا بیاہ کر دیتی۔''

''کچھ تو کہو، کہیں اور مرضی ہے کیا؟'' فاخر کی خاموشی پہ امی جھنجھلا کر بولیں۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے امی!'' فاخر کی سنجیدگی بدستور برقرار تھی۔

''اچھا!'' امی نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

☆☆☆

فاخر کا گریز بے سبب نہیں تھا۔ وہ ملائشیا واپس چلا گیا اور تقریباً چار ماہ بعد اس نے فون پر بڑی بھابھی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا، انہوں نے فاخر کی ہدایت کے مطابق ساس سے بات کی اور گھر میں ایک چھوٹا سا بھونچال آ گیا، امی نے اپنی چاروں بیٹیوں کو بلا لیا، آذر اور بھابھی بھی اس میٹنگ میں شریک تھے۔

''فاخر کا دماغ خراب ہو گیا ہے، میری سسرال والے سنیں گے تو کیا کہیں گے، ہمیں کوئی ڈھنگ کی لڑکی نہیں ملی شادی کے لیے؟'' بڑی آپا کو سسرال میں اپنی ریپوٹیشن کا بڑا خیال رہتا تھا۔

''اتنی اچھی اچھی لڑکیاں دکھائی تھیں، خود

...ورت بھی تھیں، ایجوکیٹڈ بھی اور کم عمر بھی، حیرت ہے، کنول میں اسے کیا نظر آ گیا، بیوہ ہے پھر ایک بچی کی ماں۔" چھوٹی آپا کے منہ کے زاویے بگڑے ہوئے تھے۔

"اسی لیے دوڑ دوڑ کر اوپر جاتا تھا، ہم تو سمجھتے تھے کہ بھتیجی کی محبت میں جاتا ہے، کیا خبر تھی کہ اپنی معصوم شکل سے یہ گل کھلائیں گی بہو صاحبہ!" امی کو مزید غصہ آ رہا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے امی! کنول ان سب باتوں سے لاعلم ہے، اسے تو معلوم بھی نہیں کہ فاخر کے دل میں کیا ہے۔ نہ ہی فاخر نے اس سے کچھ کہا، وہ صرف کنول کو اور اپنی بھتیجی کو سہارا دینا چاہتا ہے۔" بھابھی کو کنول پہ الزام تراشی برداشت نہیں ہوئی، انہوں نے دیورانی کی صفائی پیش کرتے ہوئے تفصیل سے اصل بات بتائی، مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

"اتنا سہارا تو دیا ہوا ہے اب اور کیا کریں؟ اوپر کا پورا پورشن دیا ہوا ہے آدھا حصہ کرائے پہ دے دیا، وہ کرایہ اسی کو ملتا ہے، فاخر بھی ہر دوسرے تیسرے مہینے ایک موٹی رقم دونوں ماں بیٹی کے لیے بھیج دیتا ہے، آتا ہے تو تب بھی خرچا کرتا ہے دونوں پر، تحفے تحائف الگ لاتا ہے، ہم سب ہی ہر بات کا خیال رکھتے ہیں، کسی شے کی کوئی پریشانی نہیں ہے، کوئی اور سسرال والے ہوتے تو واپس میکے بھیج دیتے، ہم نے نیکی کی، اس کا یہ صلہ دیا ہے؟ لے کے میرے بیٹے کو ہی پھانس لیا۔"

"ایسے الفاظ استعمال مت کریں امی! کنول بھابھی ایسی نہیں ہیں نہ ہی فاخر بھائی ایسے بدنظر ہیں۔ اہل ہماری بھتیجی ہے، اسے باپ کی محبت اور شفقت مل جائے تو کیا برائی ہے۔" سب سے چھوٹی بیٹی نے کلمہ حق کہنے کی جرات کی اور یہ جرات اسے مہنگی پڑ گئی۔ امی اور بڑی آپا باری باری اس پر برس اٹھیں۔

"تمہیں بھی کچھ گھول کر پلا دیا جو اتنا ترس آ رہا ہے؟ اتنی ہی ہمدردی ہے تو اپنے دیور کے لیے لے جاؤ جس کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہو۔"

"دیور کی شادی میں اپنی مرضی سے کیسے کرسکتی ہوں؟" وہ بے چاری گڑبڑا گئی۔

"تو پھر بھائی کے معاملے میں کیوں ٹانگ اڑا رہی ہو، خاموش رہو۔" بڑی آپا نے ڈپٹا۔

"اور اس فاخر کو تو میں اچھی طرح بتاتی ہوں، لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے کہ بیوہ بھاوج سے نکاح کرلیا، ضرور دونوں کے درمیان کوئی نہ کوئی چکر ہوگا۔" امی دور دور کی کوڑی لا رہی تھیں۔

"ویسے دیکھا جائے تو کوئی اتنی بری بات بھی نہیں۔ کنول ایسے کب تک بیٹھی رہے گی، ایک نہ ایک دن تو اپنا گھر بسائے گی ہی، کوئی اور شخص اہل کا سوتیلا باپ بنے گا، نہ جانے کیسا ہو، فاخر سگا چچا ہے، سگے باپ کی جگہ ہے پھر کنول بھی کوئی اتنی بری تو نہیں، کبھی آج تک کوئی لڑائی جھگڑا، کوئی بدتمیزی کی آپ سے اس نے؟" آذر بھی فاخر کی حمایت میں سامنے آ گئے۔

"تو میاں، ہم نے کون سا ناروا سلوک کیا اپنی بہوؤں سے شہزادیوں کی طرح رکھا ہوا تھا۔ سیاہ و سفید کی مالک تھیں، اب تو بیٹا نہیں ہے پھر بھی خوف خدا تو ہے، اتنا خیال رکھتے ہیں اس کا، مگر کچھ بھی ہو، اپنے کنوارے بیٹے کا بیاہ بیوہ سے نہیں کروں گی۔" امی اپنی رٹ پر قائم تھیں۔

"کھانے پینے، سونے جاگنے، اٹھنے بیٹھنے کے معاملات میں تو آپ سنتوں کی خوب پابند ہیں، تو بیوہ سے نکاح بھی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اسے اتنا حقیر تو مت بنائیں۔" آذر بھائی دلی گرفتگی سے گویا ہوئے۔ کنول ان کے لیے چھوٹی بہنوں کی مانند تھی۔ ان کا غم صرف یہ نہیں تھا کہ ان کا جوان بھائی دنیا سے چلا گیا بلکہ وہ کنول کے لیے بھی دکھی تھے، جو زندہ تھی مگر خوشیاں اس سے روٹھی ہوئی تھیں۔

"اب اللہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بیچ میں مت لاؤ، ہم گنہگار انسان پیغمبروں کی برابری کر سکتے ہیں کیا؟" امی جھنجھلا کر بیٹے پر برس پڑیں۔

''برابری کون کرسکتا ہے امی ، میں تو پیروی کرنے کی بات کر رہا ہوں۔'' آذر دھیرے سے بولے۔

''کنول کی جگہ خدانخواستہ اس گھر کی بہن بیٹی ہوتی تو تب بھی یہی سوچ ہوتی سب کی؟'' بھابھی نے بڑی بہادری سے یہ سوال کیا تھا اور انہیں ایسا جواب ملا کہ آئندہ کے لیے انہوں نے کنول کے معاملے میں اپنے لب سی لیے۔

''بی بی، تم دونوں میاں بیوی کو بہت ہمدردی ہے تو اپنے میاں کا نکاح اس بے چاری بیوہ سے کروا دو، اس کا بھی گھر بس جائے گا، تمہیں بھی ثواب ملے گا۔''

☆☆☆

کنول نے اسی اسکول میں جاب کر لی تھی جہاں امل پڑھتی تھی، وہ صبح امل کے ساتھ ہی اس کی وین میں اسکول جاتی اور دوپہر میں واپس آتی پھر گھر اور امل کے کاموں سے ذرا فراغت ملتی تو کچھ دیر سو جاتی، نیچے وہ پہلے بھی کم ہی جاتی تھی، اب اور بھی کم ہو گیا تھا، امل البتہ شام میں نیچے جا کر ضرور کھیلتی تھی۔ گھر میں کیا کھچڑی پک رہی ہے کنول اس سے لاعلم تھی۔

ایک دن بھابھی خود ہی اوپر آئی تھیں۔ انہوں نے فاخر کی خواہش اور اس پر امی سمیت سب کا ردعمل بتایا تو کنول انگشت بدنداں ہو گئی۔

''فاخر بھائی کو یہ کیا سوجھی؟'' فاخر رشتے میں اس سے چھوٹا مگر عمر میں کچھ بڑا ہی تھا، شروع سے وہ، اسے فاخر بھائی کہتی تھی۔

''جو بھی سوجھی، اچھی سوجھی، تمہارا گھر بھی بس جائے گا، سب سے بڑھ کر امل کی محرومی بھی دور ہو جائے گی، باپ کی کمی کو کوئی اور پورا نہیں کرسکتا چاہے کتنا ہی اچھا انسان کیوں نہ ہو۔'' بھابھی نے کنول کو سمجھایا۔

''نہیں بھابھی میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی، میں نے ہمیشہ اسے بھائی ہی سمجھا ہے۔'' کنول نے نفی میں سر ہلایا۔

''تمہارے سمجھنے یا کہنے سے وہ تمہارا بھائی نہیں بن گیا۔'' بھابھی نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''دیکھو، فاخر سے میری اور آذر کی تفصیلی بات ہوئی تھی۔ وہ تمہیں اور امل کو سہارا دینا چاہتا ہے اور اس معاملے میں بہت سنجیدہ ہے امی اور بڑی آپا کے رویوں اور باتوں سے بہت دل برداشتہ ہے۔ آذر کہہ رہے تھے کہ فاخر کے آنے پر وہ تمہارا اور فاخر کا نکاح اپنی سرپرستی میں کردیں گے، اگر تم راضی ہو جاؤ تو، سوائے امی اور بڑی آپا کے سب ہی راضی ہیں۔''

''نہیں بھابھی! ہرگز نہیں، ایک ماں کو ناراض کر کے میں اپنے لیے خوشیاں حاصل نہیں کر سکتی۔'' کنول نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

''اتنی آئیڈیلسٹ مت بنو کنول، کبھی کبھار اپنی خوشیوں کے لیے تھوڑا خودغرض بھی بننا پڑتا ہے، امی اور بڑی آپا بھی تو خودغرضی اور ہٹ دھرمی دکھا رہی ہیں۔ تھوڑی سی تم بھی دکھا دو، کیا فرق پڑتا ہے۔'' بھابھی اسے راضی کرنے کے لیے بھرپور جتن کر رہی تھیں۔

مگر کنول کی ناں، ہاں میں نہ بدلی۔

☆☆☆

پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بج چکی تھی، کنول نے اپنا بیگ اور چیزیں سمیٹیں اور اسٹاف روم میں آ گئی۔ آخری پیریڈ اس کا فری پیریڈ تھا۔ وہ بچوں کی کاپیاں چیک کرنے لگی۔

''مس کنول!'' سر شکیب کی آواز پر اس کا جھکا ہوا سر بےساختہ اٹھا۔

''آپ نے مجھے جواب نہیں دیا میرے سوال کا؟'' کنول کی استفہامیہ نظریں خود پر گڑی دیکھ کر وہ بولے۔

''میں نے کہا تھا، میں سوچ کر جواب دوں گی۔'' کنول نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

''ایک ہفتہ تو ہو گیا ہے، کب تک سوچیں گی؟'' انہوں نے ایک دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ سوال

لیا۔

''شکیب صاحب، فیصلہ کرنا اتنا آسان نہیں، مجھے صرف اپنے لیے نہیں سوچنا، اپنی بیٹی کے لیے بھی سوچنا ہے۔'' کنول بہت سنجیدہ تھی۔

''امل جیسے آپ کی بیٹی ہے ایسے میری بھی بیٹی ہے، میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا، اب بھی کہہ رہا ہوں۔'' وہ اپنے مخصوص دھیمے انداز میں دعویٰ کر رہے تھے۔

کنول سر جھکا کر کھلی کاپی پہ لکھے لفظوں کو دیکھنے لگی، وہ شش و پنج میں تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ شکیب صاحب کی شادی کی پیش کش پر اس نے جتنا زیادہ غور کیا، وہ اتنا ہی الجھتی جا رہی تھی۔ حالانکہ بظاہر کوئی خامی یا کمی نہ تھی۔ شکیب عالم اسی اسکول میں فزکس اور میتھس کے ٹیچر تھے۔ شام سے رات تک وہ اپنا ٹیوشن سینٹر سنبھالتے تھے۔ پینتیس سے چالیس سال کے درمیان عمر تھی دیکھنے اور سننے میں بردبار اور سنجیدہ مزاج تھے۔ پہلی شادی ناکام ہوگئی تھی۔ نو سال کی بیٹی تھی، امل کی ہم عمر اور کلاس فیلو شادی کی ناکامی کا سبب انہوں نے یہ بتایا تھا کہ بیوی شادی سے پہلے کسی اور کو پسند کرتی تھی۔ والدین کے دباؤ میں آ کر شادی کر تو لی مگر نبھاہ نہ سکی، دو سال بمشکل گزارنے کے بعد ایک سال کی بیٹی اور شوہر کو چھوڑ کر چلی گئی۔ مسلسل سوچ بچار کرنے پر بھی کنول کسی نتیجے پر نہیں پہنچ رہی تھی۔

''میں، آپ کو خود جواب دے دوں گی آپ پلیز، دوبارہ مت پوچھیے گا۔'' کنول نے شکیب عالم سے کہا۔

''ٹھیک ہے میں، دوبارہ خود سے نہیں پوچھوں گا مگر آپ پلیز بہت زیادہ انتظار نہیں کروایئے گا۔ چلیں، میں اپنی کلاس لینے جا رہا ہوں۔''

وہ اسٹاف روم سے باہر نکل گئے، کنول کاپیاں چیک کر رہی تھی مگر اب الفاظ نگاہوں کے سامنے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ زندگی کے حقائق بڑے تلخ، بے رحم اور سفاک ہوتے ہیں۔ عامر کی چوتھی برسی گزری تھی پچھلے دنوں اور امل کی نویں سالگرہ بھی، کنول نے اپنی خوشیاں اور خواہشات امل تک محدود رکھنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی اس کوشش میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکی تھی، فطری تقاضوں اور دلی خواہشات پہ بند باندھنا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا، وہ جوگن نہیں تھی، بن بھی نہیں سکتی تھی، ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی، اس عمر میں تو آج کل عموماً لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں اور وہ نو سالہ بیٹی کے ساتھ بیوگی کے چار برس کاٹ چکی تھی۔

فاخر نے جب اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے جذباتی رویہ اختیار کیا اور انکار کر دیا مگر اب شکیب عالم کے دست طلب کو وہ یکدم نہ ٹھکرا سکی۔ وہ اب اس معاملے پر سوچ بچار کر کے فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ بالآخر اس نے بھابھی کو سارا معاملہ بتا کر ان سے مدد اور مشورہ طلب کیا۔

''میں آذر کو بتاتی ہوں، وہ مل کر اپنی رائے دے دیں ٹھیک ہے۔''

''ٹھیک ہے بھابھی!'' کنول نے اثبات میں سر ہلایا۔

آذر بھائی نے تین دن بعد ہی ساری رپورٹ دے دی۔

''موصوف نے ایک غلط بیانی کی ہے۔'' انہوں نے کنول اور بھابھی کو بتایا۔

''کیا؟''

''ان کی ایک نہیں دو شادیاں ناکام ہو چکی ہیں۔ پہلی بیوی سے بھی ایک بیٹی ہے جو اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہے۔ دوسری بیگم سے بھی ایک بچی ہے جو وہ باپ کے پاس ہی چھوڑ گئی۔''

''اتنا بڑا جھوٹ؟'' کنول کو حیرانی بھی ہوئی اور افسوس بھی، جھوٹ چھپا نہیں رہتا، ایک نہ ایک دن کھل ہی جاتا ہے پھر بھی لوگ جھوٹ کی کھوکھلی بنیاد پر معاملات کی عمارت استوار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کنول نے انکار کر دیا تھا مگر شکیب صاحب بری طرح پیچھے پڑ گئے تھے۔ پہلے تو اپنی غلط بیانی کے لیے

معافی مانگتے رہے مگر جب کنول نے بالکل ہی بے رخی اور لاتعلقی اختیار کی تو دھمکیوں پہ اتر آئے۔

''آپ نے اتنا عرصہ مجھے آسرا دیا اور پھر انکار کر دیا اس کا خمیازہ تو بھگتنا پڑے گا آپ کو۔'' شکیب صاحب کا لہجہ تو دھیما ہی تھا اور مگر آنکھوں اور چہرے پہ خشونت تھی۔

''دماغ ٹھیک ہے آپ کا؟ میں نے آپ کو کب اور کیا آسرا دیا ہے؟ جواب دینے کے لیے وقت مانگا تھا اور آپ نے جو اتنا بڑا جھوٹ بولا؟ اس کے بعد کون آپ کو مثبت جواب دے گا؟'' کنول نے بھی تیز اور درشت لہجے میں جواب دیا۔

اور وہاں سے ہٹ گئی مگر نہ جانے کیوں اسے اپنے اور اپنی بچی کے لیے بہت خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ شکیب عالم نے آتے جاتے چند بار انتقام لینے کی دھمکی دی تھی۔ کنول نے ارادہ کیا کہ امل کو اس اسکول سے نکال لے اور خود بھی یہ نوکری چھوڑ دے مگر آذر بھائی نے اسے روک دیا۔

''تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس شخص کا بندوبست تو میں کر دوں گا۔ انہوں نے خدا جانے کیا کیا کہ کچھ دنوں بعد شکیب عالم خود ہی نوکری چھوڑ گیا۔

☆☆☆

دستانے پہنے ہاتھوں سے کنول نے اوون کا دروازہ کھولا اور کیک باہر نکالا۔ گرم گرم تازہ اور خوشبودار کیک تیار تھا، اس نے چاکلیٹ کرش کر کے اوپر سے چھڑک دی، امل کا فیورٹ پزا اور چکن روسٹ وہ پہلے ہی تیار کر چکی تھی۔ امل نے کمرہ خود سجایا تھا رنگ برنگے ربن سے ''ہیپی برتھ ڈے'' لکھا تھا اور سالگرہ مبارک کے غبارے لٹکائے ہوئے تھے۔

سالگرہ کے کیک پر 11 نمبر کی دو موم بتیاں لگا کر کنول نے انہیں جلا دیا۔ امل نے پھونک مار کر موم بتیاں بجھائیں اور کیک کاٹا کنول نے ہر سال کی طرح اس بار بھی اسے وش کر کے پیار کیا اور کیک کھلایا۔

کنول نے ٹرے میں کیک چکن اور پزا کے کچھ ٹکڑے رکھ کر خوان پوش سے ڈھانپا اور امل کو دیا۔

''جاؤ، دادی جان کو دے آؤ۔'' دادی گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتی تھیں۔

''امل جلد ہی خالی ٹرے لے کر واپس آ گئی اور اپنی اور کنول کی سیلفیاں لینے لگی۔''

''مما، آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔'' امل نے بے ساختہ اظہار کیا۔

''اچھا، اپنی بیٹی سے بھی زیادہ؟'' کنول نے پیار سے بیٹی کو دیکھا۔

''جی ہاں، مجھ سے بھی زیادہ۔'' امل ہنسی۔

''ایسے ہی تیار رہا کریں ناں، کتنی اچھی لگتی ہیں، دیکھیں؟'' امل نے سامنے لگے دیوار گیر آئینے کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں اس کا عکس نظر آ رہا تھا۔

ہلکی سی کڑھائی کا شوخ گلابی رنگ کا سوٹ اس پر بہت کھل رہا تھا۔ گلابی ہی لپ اسٹک اور آنکھوں کے ہلکے سے میک اپ نے اس کے صبیح چہرے کی دلکشی اور بڑھا دی تھی کانوں میں چھوٹے چھوٹے سے آویزے اور گوری سڈول کلائی میں گلابی چوڑیاں مخروطی انگلی میں گولڈ کی انگوٹھی، امل نے زبردستی ضد کر کے اسے سب پہنایا تھا۔

عامر کی وفات کے بعد اس نے سنگھار اور آرائشی سامان ایک جگہ اکٹھا کر کے لاک میں رکھ دیا تھا کچھ پہننے اوڑھنے اور سنگھار کو خود اس کا دل بھی نہیں چاہتا تھا، اگر کبھی کسی تقریب میں معمولی سی آرائش کر بھی لیتی تو کچھ نہ کچھ سننے کو مل جاتا۔ اس نے دلبرداشتہ ہو کر بالکل ہی سادہ رہنا شروع کر دیا، بیوہ کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔ (حاملہ ہونے کی صورت میں بچے کی ولادت تک عدت ہے) جس کے بعد عورت کے سنگھار اور دوبارہ نکاح پر کوئی قدغن نہیں مگر ہمارے معاشرے کا عمومی رویہ یہ ہے کہ عدت کے بعد بھی بیوہ کا سنگھار یا آرائش و زیبائش کرنا برا اور ممنوع سمجھا جاتا ہے۔ عورتوں کی چہ چہ

کرتی زبانوں سے کبھی تو کنول بہت ہی افسردہ ہو جاتی تھی۔ پہلے بھابھی کے ساتھ باتیں کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی تھی مگر جب سے آذر بھائی بیوی بچوں سمیت کینیڈا شفٹ ہوئے تھے، اب یہ آسرا بھی گیا کبھی کبھار ان سے بات ہو جاتی تھی بس، نیچے امی کے پاس بڑی آپا آ گئی تھیں۔ سال دو سال میں فاخر بھی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ چکر لگا لیتا تھا۔

زندگی کے دن نرم گرم گزر رہے تھے مگر اب اکثر کنول پریشان رہنے لگی تھی۔ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتی تو ایک بھیانک خلا نظر آتا اور بس، اُل بڑی ہوتی جا رہی تھی، اٹھان اچھی تھی، اپنے پاپا کی طرح لمبے قد اور بدن کی مالک۔

گیارہ برس کی تھی مگر اپنی عمر سے ایک دو سال بڑی ہی لگتی، کنول کی آزمائش ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی، اس کی طرف دست طلب بڑھے تو سہی مگر کسی کو اس کے گھر سے زیادہ دلچسپی تھی اور کسی کو بیٹی کا وجود گوارا نہ تھا، اور کنول کو ایسا لگنے لگا تھا جیسے دنیا اچھے لوگوں سے خالی ہوتی جا رہی ہے، پھر اچانک ہی ایک روز اسد آ گیا۔ اسد منیر اس کے سگے چچازاد اور پچھلے بیس سال سے شکاگو میں مقیم انہیں اچانک اپنے ہاں دیکھ کر کنول کو خوشگوار حیرت ہوئی۔

''سطوت باجی ساتھ نہ ہوتیں تو میں آپ کو پہچانتی بھی نہیں، آپ کتنے بدل گئے ہیں؟'' کنول اپنے دو قریبی رشتوں کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔

''ہاں، تھوڑا گنجا ہو گیا ہوں اور تھوڑا موٹا بھی۔''

''تھوڑے نہیں بہت...... یاد ہے پہلے آپ کتنے اسمارٹ اور ہینڈسم ہوا کرتے تھے، خاندان بھر میں آصف رضا میر کے نام سے مشہور تھے۔'' کنول کو یک لخت گزرا وقت اور گزرے لوگ یاد آئے۔

''آصف رضا میر بھی موٹا ہو گیا ہے لڑکی! تم سناؤ، کیسی ہو اور کیسی گزر رہی ہے لائف؟'' وہ بڑے مزے سے صوفے پہ پھیل کر بیٹھا تھا۔

''بس گزر رہی ہے۔'' کنول کے لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

''تمہاری بیٹی ماشاء اللہ بہت خوب صورت ہے، بالکل تم پر گئی ہے۔'' ماحول کو بوجھل دیکھ کر سطوت باجی نے موضوع بدل دیا۔

شام کی چائے کے ساتھ کنول نے بہت زیادہ اہتمام نہیں کیا تھا کہ وہ مہمانوں کے لیے ڈنر تیار کر رہی تھی، سطوت باجی نہ نہ کرتی رہیں مگر اس نے فٹافٹ یخنی چڑھا دی اور باقی چیزوں کو تیاری کرنے لگی، ساتھ ساتھ دونوں سے باتیں بھی چلتی رہیں اس کا کچن اوپن تھا لاؤنج کے ایک سرے پہ واقع تھا۔ وہیں سطوت باجی اور اسد بھائی بیٹھے تھے۔

اسد بھائی، آپ اکیلے آئے ہیں، بیگم بچے ساتھ نہیں آئے؟'' دہی اور مسالہ چکن میں لگاتے ہوئے کنول نے سوال کیا۔

''بچے تو ساتھ آئے ہیں...... بیگم نہیں آئیں۔''

''کیوں؟ انہیں بھی ساتھ لے آتے، ایک بار تو آئی تھیں نا آپ کے ساتھ۔''

''دراصل وہ اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ ہنی مون پر گئی ہوئی ہے، اس لیے یہاں نہیں آ سکی۔'' اسد نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا اور پھر کنول کا ہونق چہرہ دیکھ کر زوردار قہقہہ لگایا۔

''سیدھی طرح نہیں بتا سکتے، اس میں بھی مذاق؟'' سطوت باجی نے بھائی کو ڈپٹا پھر کنول کی طرف متوجہ ہو کر سنجیدگی سے بتانے لگیں۔

''چھ ماہ پہلے اسد اور اس کی بیوی کا ڈائیورس ہو گیا ہے۔''

''شادی کے اتنے برسوں بعد؟'' کنول کے منہ سے بے ساختہ نکلا جو ساتھ ہی وہ پچھتائی بھی کہ کسی کے انتہائی ذاتی معاملے میں اس طرح دخل نہیں دینا چاہیے، مگر اسد نے ایک اور قہقہہ لگا کر اس سوال کا جواب دیا۔

''دراصل شادی کی پندرہویں سالگرہ پہ اسے علم ہوا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے میچ نہیں کرتے اور سولھویں سالگرہ آنے سے پہلے اس نے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ میں نے آج تک اس کی کوئی فرمائش

نہیں ٹالی تھی۔ سو یہ بھی پوری کر دی۔'' اسد نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔

''پندرہ برسوں میں میری بیوی کو تو مجھ سے محبت نہیں ہوئی مگر میرے بچوں کو ضرور ہو گئی تھی لہٰذا دونوں میرے پاس ہی ہیں۔'' اس نے مزید بتایا مگر انداز اب بھی وہی مزاحیہ ہی تھا اور جب تک کھانا تیار ہوا اور کھایا گیا وہ اسی طرح اپنی باتوں سے سب کو ہنسنے مسکرانے پر مجبور کرتا رہا۔

☆☆☆

''اہل بٹیا، کل کون آیا تھا تمہارے گھر؟'' دادی نے اہل کو چاکلیٹ تھمائی اور ہمیشہ کی طرح اس سے اس کے گھر آنے والے مہمانوں کی رپورٹ لی۔

وہ ہمیشہ باخبر رہتی تھیں کہ کنول کے پاس اوپر کون کون آتا ہے یا وہ کہاں کہاں جاتی ہے، فون پہ یا ویسے کس کس سے کیا کیا بات کرتی ہے؟ وہ ایک ایک بات کرید کرید کر اہل سے پوچھتی تھیں، بڑی آپا بھی درمیان میں لقمے دیتی جاتیں اور اہل انتہائی فرماں بردار پوتی کا کردار ادا کرتے ہوئے ان کے سارے سوالوں کے تفصیلی جوابات دیتی۔ اس وقت بھی وہ اپنی پسندیدہ چاکلیٹ کھاتے ہوئے دادی اور پھپھو کو ایک ایک تفصیل بتا رہی تھی۔

''ہوں۔'' انہوں نے ایک معنی خیز ہنکارا ابھرا۔

سطوت آپا اگلی بار آئیں تو اسد کا پروپوزل اس کے لیے لائیں۔ ان کے ساتھ اسد اور اس کے دونوں بچے بھی ساتھ تھے۔ وہ لوگ نیچے اہل کی دادی اور پھپھو سے بھی مل کر گئے تھے۔ کنول نے ابھی پروپوزل کا جواب بھی نہیں دیا تھا مگر اہل کے ذریعے نیچے خبر پہنچ چکی تھی۔ اس کی طلبی ہو گئی۔

''میں نے سنا ہے تمہاری کزن رشتہ لے کر آئی ہے تمہارے لیے؟'' بڑی آپا نے بات کا آغاز کیا۔

''جی!'' کنول اب تک ان سے دبتی بھی تھی اور لحاظ بھی کرتی تھی۔

''اب تو تمہیں اہل کی فکر کرنی چاہیے، دو چار سال میں دیکھنا کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی، ماشاء اللہ عامر جیسی اٹھان ہے، بیٹی کی شادی کرو گی یا اپنا بیاہ رچاؤ گی۔''

''مجھے سب سے زیادہ اہل کی ہی فکر ہے، اسی لیے میں نے آج تک جلد بازی میں کوئی الٹا سیدھا فیصلہ نہیں کیا۔ اب بھی میں جو فیصلہ کروں گی، سوچ سمجھ کر کروں گی۔'' کنول نے رسان سے جواب دیا۔

''بھئی تم جو بھی فیصلہ کرو پہلے میری ایک بات کان کھول کر سن لو تمہیں جس سے شادی کرنی ہے کرو، اہل یہیں رہے گی ہمارے پاس، میں اسے سوتیلے باپ کے حوالے نہیں کروں گی۔ آج کل کسی کا کوئی بھروسا ہے کیا؟ تمہارا وہ رشتے دار خود تو ہے ہی مسٹنڈا، ساتھ ساتھ روہلندرے بیٹے بھی ہیں، میں اپنی پوتی کو اپنے پاس رکھوں گی۔ میرے عامر کی نشانی ہے۔ کچھ ہو گیا خدانخواستہ تو وہ تو قیامت میں میرا گریبان پکڑے گا۔'' دبنگ لہجے میں بولتے بولتے امی جذباتی ہو گئیں۔

''اسد بھائی ایسے نہیں ہیں، نہ ہی ان کے بچے......'' کنول نے کمزور سا دفاع کرنے کی کوشش کی مگر بڑی آپا نے بات کاٹ دی۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو، امریکہ میں رہتے ہیں وہ لوگ، جہاں کا پہلے ہی آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے، وہاں رہنے والوں کا کیا بھروسا؟''

''میں، اپنا اور اہل کا برا بھلا خوب سمجھتی ہوں، آپ لوگ فکر مند نہ ہوں۔'' نہ چاہتے ہوئے کنول کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

اس کا بیوہ ہونا قدرت کی طرف سے تھا مگر بیوگی کی مستقل زندگی بسر کرنے پر اسے زبردستی مجبور کیا جا رہا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اگر آپ کی اپنی بہن یا بیٹی بیوہ ہو جاتی تو اس وقت آپ کی سوچ اور رویہ کیا ہوتا؟ مگر وہ کچھ کہنے کے بجائے کھڑی ہو گئی۔ اسے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے اور مرضی کا فیصلہ کرنے کا حق تھا اور وہ اب اس حق کو استعمال کرنے والی تھی، کسی کی بھی پروا کیے بغیر، مگر اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے مقابل اس کی بیٹی کو ہی لا کھڑا کیا

جائے گا۔

☆☆☆

''امل بیٹا! اپنے کپڑے الماری میں رکھو۔'' کنول نے دھلے ہوئے کپڑے تہہ کرتے ہوئے امل کو ہدایت کی۔

''امی! یہ اسد انکل روز روز کیوں آجاتے ہیں؟ مجھے اچھے نہیں لگتے۔'' امل کی جھنجلائی آواز پر کنول نے تعجب سے اسے دیکھا۔

''کیا ہوا امل، ناپسند کیوں ہیں انکل؟'' کنول نے بہت محتاط ہو کر سوال کیا۔

''اور ان کے بیٹے تو اور بھی برے لگتے ہیں، موٹے مسٹنڈے سے، بلاوجہ فری ہوتے رہتے ہیں۔'' امل نے ماں کے سوال کا جواب دینے کے بجائے مزید ناگواری کا اظہار کیا اور کنول اس کا لہجہ اور الفاظ سن کر چونک گئی۔

''تم سے دادی نے کچھ کہا ہے؟''

''جی!'' امل نے اثبات میں سر ہلایا۔

''وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ اسد انکل سے شادی کر کے ان کے ساتھ چلی جائیں گی۔ اسی لیے تو وہ مجھے اچھے نہیں لگتے، آپ مجھے یہیں چھوڑ دیں گی مما؟''

''میں تمہیں کہیں نہیں چھوڑوں گی مما کی جان! جہاں بھی رہوں گی، تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گی۔'' کنول نے مضطرب سے لہجے میں بولتے ہوئے بیٹی کو دیکھا۔

''مگر اسٹیپ فادر بالکل بھی اچھے نہیں ہوتے، بہت بری بری حرکتیں کرتے ہیں۔ میں نے ڈرامے میں دیکھا تھا۔''

''کون سے ڈرامے میں؟'' کنول چونکی۔

''دادی نے دکھایا تھا۔'' امل نے لاپروائی سے بتایا اور کنول ششدر رہ گئی پھر بھی اس نے امل کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''اسد انکل ایسے نہیں ہیں بیٹا دنیا کے سارے لوگ برے نہیں ہوتے، کچھ لوگ اچھے بھی ہوتے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے انکل ایسے نہ ہوں لیکن ان کے بیٹے اگر برے نکلے تو؟ اتنے آزاد ماحول میں تو رہتے ہیں وہ۔'' امل کے منہ میں جو زبان فٹ کی گئی تھی وہ اسی کا استعمال کر رہی تھی۔ کنول اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''اور کیا کہہ رہی تھیں دادی؟'' خود پہ ضبط کرتے ہوئے کنول نے سوال کیا۔

''وہ کہہ رہی تھیں کہ جو عورتیں دوسری شادی کرتی ہیں انہیں شوہر مل جاتا ہے مگر ان کے بچوں کو باپ نہیں ملتا۔'' امل نے رٹو طوطے کی طرح دادی کی بات بھی دہرادی۔

''یا اللہ، کون سی دشمنی نبھا رہی ہیں یہ عورتیں مجھ سے۔'' رنج اور بے بسی کے مارے کنول کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

☆☆☆

''چونکہ میں ایک بیوہ ہوں، وہ بھی ایک بیٹی کی ماں تو اب مجھ پہ لازم ہے کہ میں اپنی ساری خواہشات اور خوابوں کا گلا گھونٹ دوں۔ سوتیلے باپ اور سوتیلے رشتے کو ایک گالی بنا دیا گیا ہے، اس میں قصوروار وہ بھی ہیں جو کسی رشتے اور کسی فرد کی حرمت کا پاس نہیں رکھتے بس اپنی ہوس اور نفس کے غلام رہتے ہیں اور رہی سہی کسر ذرائع ابلاغ نے پوری کر دی ہے۔ حقیقت نگاری کے نام پر سب ہی کچھ عریاں کر دیا ہے اب اگر کوئی قابل اعتبار ہو بھی تو اس پر اعتبار کرنا مشکل ہوتا ہے۔'' سطوت آپا کو اپنے حال سے آگاہ کرتے ہوئے کنول کی آنکھیں نم تھیں۔

''میری بیٹی کا پتا نہیں کب سے برین واش کیا جا رہا ہے، میری دوسری شادی اور سوتیلے باپ کے حوالے سے اتنا زہر گھول دیا ہے اس کے دماغ میں کہ وہ کسی طور میری بات سننے اور سمجھنے پر آمادہ نہیں ہے۔''

کنول کی باتیں سن کر سطوت آپا نے ایک گہری سانس لی۔

''میری یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم ابھی تک اپنی ساس اور نند کے انڈر پریشر کیوں ہو؟ اپنی مرضی کی

زندگی گزارنا تمہارا حق ہے۔ خود مختاری اور آزادی کے ساتھ فیصلہ کرنا، یہ بھی تمہارا حق ہے۔ یہ لوگ کیوں تم پر اتنے حاوی ہو رہے ہیں؟" سطوت آپا حیران تھیں۔

"دراصل عامر کی وفات کے بعد میرے سسرال والوں نے مجھے بہت سپورٹ کیا۔ عامر کے ترکے میں ان کی امی کا حصہ تھا، وہ انہوں نے میرے اور اہل کے نام کر دیا میرے پورشن میں مزید رقم لگا کر ایک حصہ کرائے پر دے دیا۔ مجھے کبھی مالی مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میرے جیٹھ اور دیور نے کبھی کسی شے کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ میں سب کی احسان مند تھی۔ میں نے اہل کو اس کے ددھیالی رشتوں سے جوڑے رکھنے کی کوشش کی، اسی لیے میں نے یہاں سے کبھی کہیں اور شفٹ ہونے کی بھی کوشش نہیں کی، کچھ اس لیے بھی کہ ہمارے معاشرے میں اکیلی عورت پہ بہتان اور الزام تراشی سب سے آسان کام ہے۔ لیکن مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ ان لوگوں کے احسانوں کا بدلہ چکانے کے نتیجے میں میری زندگی اور میری اولاد، میرے اپنے اختیار سے باہر ہو جائے گی۔"

کنول کی حالت اس تھکے ہوئے پرندے جیسی تھی جو مزید پرواز کے لیے اپنے پر پھیلانے کی سکت بھی نہ رکھتا ہو اور زمین پر گرنا بھی نہ چاہتا ہو۔

"پھر؟ اب کیا سوچا ہے تم نے، اسد بمشکل دو ہفتوں تک ہے یہاں، اسے واپس جانا ہے، تم کوشش کر کے اہل کو راضی کرو، باقی لوگوں کا کوئی اتنا مسئلہ نہیں، کوئی کچھ بھی بولے، بولنے دو، آنے والے جمعہ، ہفتہ یا اتوار جس دن بھی تم چاہو، نکاح کر لیتے ہیں۔"

"میں سوچ کر بتاتی ہوں۔"

"کنول! اب سوچنے کا نہیں عمل کا وقت ہے۔ سوچ سوچ کر تم نے اتنے برس نکال دیے، دو چار سال اور یونہی گزر گئے تو اپنے لیے نہیں اہل کے لیے سوچنا پڑے گا، ابھی وقت تمہاری مٹھی میں ہے، فائدہ اٹھاؤ اس سے۔"

سطوت آپا اسے بتا رہی تھیں اور کنول خود بھی یہ سب باتیں سمجھتی تھی مگر خدا جانے کیا چیز تھی جو آڑے آ رہی تھی، اس کی بیٹی، اس کی ساس یا اس کی تقدیر؟

کچھ تو تھا جو یہ موقع اور یہ وقت بھی ریت کی مانند ہاتھوں سے پھسل گیا۔ اہل نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر کنول کسی سے بھی شادی کرے گی تو وہ اپنی دادی کے پاس رہے گی اور بیٹی کے بغیر تو ایک پل بھی گزارنا اس کے لیے سوہان روح تھا۔

"تم یہ غلط کر رہی ہو کنول! ابھی تمہاری بیٹی اتنی بڑی نہیں ہے کہ اپنے فیصلے پر زبردستی تم سے عمل کروائے، تم سختی سے کام لو، کچھ عرصے کی بات ہے وہ تمہارے قابو میں آ جائے گی، تم یوں بے بس ہو کر ہتھیار کیوں ڈال رہی ہو؟"

سطوت آپا اسی خلوص اور خیر خواہی کے ساتھ اسے سمجھا رہی تھیں جیسے کبھی کنول کی جٹھانی سمجھایا کرتی تھیں مگر کنول کے اندر اعتماد اور جرات کا فقدان تھا، کچھ بیٹی کی محبت نے اسے بہت کمزور بنا دیا تھا، وہ بار بار یہی سوچ رہی تھی کہ اگر اہل نے اس نکاح کے بعد واقعی اسے چھوڑ دیا تو کیا ہوگا؟

"آپ سمجھ نہیں رہیں آپا! میں اہل کی آنکھوں میں بغاوت اور بے گانگی دیکھ رہی ہوں، جو مجھ سے بالکل بھی برداشت نہیں ہو رہی۔"

کنول نے بے بسی سے اپنے ہاتھ پھیلائے، جن کی لکیروں میں اس کے لیے جانے کیا رقم تھا، خوشیوں کی نوید یا فقط امید اور انتظار۔

"ٹھیک ہے، تمہارے پاس آج رات تک کا وقت ہے، ایک بار پھر اچھی طرح غور کر لو، قسمت بار بار انسان کے دروازے پہ دستک نہیں دیتی، تھوڑی سی جرات اور ہمت سے کام لو تو تم اپنی بیٹی کو بھی قابو کر سکتی ہو اور دوسرے لوگوں کو بھی، اپنی زندگی کی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں مت دو خود فیصلہ کرو، اگر آج بارہ بجے تک تمہارا فون نہیں آیا تو میں سمجھوں گی تمہاری

طرف سے نہ ہے۔"

سطوت آپا چلی گئیں اور ان کے جانے کے بعد کنول جلے پیر کی بلی کی مانند ادھر سے ادھر چکر کاٹتی رہی، سوچتی رہی ہر بات، ہر پہلو پہ غور کرتی رہی۔

میکے میں بھی تو کوئی ایسا نہ تھا جس سے مشورہ یا مدد لی جا سکے۔ لے دے کے ایک بھائی، بھاوج تھے جنہیں اس کے معاملات سے زیادہ اس بات سے دلچسپی تھی کہ کنول اپنے کرائے داروں کو نکال کر انہیں گھر میں رکھ لے، کنول کے لیے یہ ممکن نہیں تھا، ان کے آئے دن کے تقاضوں سے گھبرا کر اس نے وہاں جانا ہی بہت کم کر دیا تھا ٹہل ٹہل کر اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں اور سوچ سوچ کر دماغ شل ہو گیا، بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا اور فون کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

☆☆☆

رولر نکال کر گھنگھریالے بال سیٹ کرنے میں ہی کافی وقت لگ گیا تھا، پھر اس سے پہلے میک اپ کا مرحلہ، ایک ایک نقش سجانے سنوارنے میں ٹھیک ٹھاک وقت لگایا تھا۔ تبھی تو جب وہ فرحین کے بھائی کے ولیمے میں پہنچی تو فرحین کی ستائشی نظریں اس پر ٹک گئیں۔

"اتنی خوب صورت نہ لگ رہی ہوتیں تو ابھی بھگا دیتی، ولیمہ آدھا ختم ہونے کے بعد آ رہی ہو۔" فرحین نے گلے لگتے ہوئے شکوہ کیا۔

"اچھا، دلہن والوں کے آنے سے پہلے ہی تم نے آدھا ولیمہ نپٹا دیا؟" امل نے اپنی خوب صورت آنکھیں ہال میں چاروں طرف دوڑائیں جہاں بہت کم مہمان نظر آ رہے تھے۔

"جب ہی تو آدھا نپٹایا ہے ورنہ پوری تقریب ختم ہو جاتی۔" فرحین بے ساختہ ہنسی، پھر اس کی نگاہ کنول پر پڑی۔

"چلو، آنٹی کو سلام کر لوں، ویسے تم نے اتنے کونے میں کیوں بٹھایا ہے انہیں۔"

خود ہی بیٹھی ہیں۔" امل اور فرحین باتیں کرتے کرتے کنول کے قریب پہنچ گئیں۔

"آنٹی! آپ ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔" سلام اور خیر خیریت کے بعد فرحین نے بے ساختہ کنول کی تعریف کی، حالانکہ اس نے تیاری کے لیے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا پھر بھی اس کا صبیح و ملیح چہرہ اور نازک سراپا اسے بہت دلکش اور پروقار دکھا رہا تھا۔

"تھینک یو بیٹا!" کنول مسکرا دی۔

"میری مما بالکل مجھ پر گئی ہیں۔" امل نے فرضی کالر اکڑایا۔

"شکر ہے شکل میں ہی گئی ہیں، عقل میں نہیں گئیں۔" فرحین اور امل کی آپس میں دوستی بہت اور بے تکلفی بے حد تھی۔

"ہا، عقل میں اپنی پیاری سہیلی پر چلی گئی میں۔" امل نے ایک سرد آہ بھری۔

"سچ میں امل، آنٹی، تمہاری امی کم بڑی بہن زیادہ لگتی ہیں۔"

"مما کی شادی بہت چھوٹی عمر میں ہوئی تھی، جب میں پیدا ہوئی تو وہ صرف اٹھارہ سال کی تھیں۔" امل نے انکشاف کیا۔

"تبھی تو، ابھی تک اتنی ینگ اور فریش لگتی ہیں۔"

"میں چھوٹی سی تھی جب پاپا کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ مما نے اکیلے سب کچھ کیا، مجھے اتنا بڑا کر دیا۔ آئی ایم پراؤڈ آف ہر۔" امل ان ہی باتوں کو دہرا رہی تھی جو وہ پہلے بھی کئی بار فرحین کو بتا چکی تھی۔

گرے سوٹ میں ملبوس مرد کی پرسنالٹی بے حد متاثر کن تھی۔ کلین شیو تھی تب ہی چہرے کے کھڑے نقوش نمایاں تھے۔ گندمی رنگت نے کشش میں اضافہ کر دیا تھا۔ سر پر بال گھنے تھے جنہیں طریقے سے سنوارا گیا تھا۔ پتا نہیں کون سے چٹکلے چھوڑے جا رہے تھے کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہنسی کا فوارہ بلند ہو جاتا اور ہموار سفید دانت چمک اٹھتے۔

ان کے ساتھ جو خاتون تھیں، انہیں خاتون کہنا ذرا زیادتی تھی کہ سراپا لڑکیوں والا ہی تھا۔ چھریرا بدن، گورا چمکتا ہوا خوب صورت چہرہ اور لمبے بالوں کی موٹی سی چوٹی آگے کو ڈالی ہوئی تھی۔ کچھ دیر سے ہنستے ہنستے ان کا چہرہ بھی گلابی ہو رہا تھا۔ ان دونوں کے ہمراہ تیسرا فرد ایک نوعمر لڑکا تھا، بمشکل اکیس بائیس سال کا۔ چہرے مہرے میں وہ گہرے سوٹ میں ملبوس مرد سے مشابہت رکھتا تھا۔ خصوصاً اس کی چمکتی آنکھیں اور ہنسنے کا انداز۔ رائل بلیو کرتا شلوار اور واسکٹ میں اس کا چھ فٹ قد اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کا ہیئر اسٹائل لڑکوں کے جدید فیشن کے مطابق تھا۔ ان تینوں کو دور سے دیکھنے پر ایک خوش باش فیملی کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ اکیلی بیٹھی ہوئی کنول کی بلا ارادہ نگاہیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس فیملی پر مرکوز ہو ہی جاتیں۔ چند لمحوں بعد وہ نگاہیں ہٹا لیتی۔

اب تو اس کے سارے خواب، خیالات امل سے اور اس کی خوشیوں سے وابستہ تھے مگر پھر بھی کبھی کبھی دل میں احساس محرومی جاگ اٹھتا تھا، جب بھی وہ کسی خوش و خرم فیملی کو آپس میں ہنستا بولتا دیکھتی تو ایک لمحے کو اسے عامر کا خیال ضرور آتا۔

اگر عامر حیات ہوتا تو زندگی کتنی مختلف اور بھرپور ہوتی۔ کنول کو آج پھر عامر کا خیال آ رہا تھا۔ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اس نے اپنا سر جھٹکا اور امل کو دیکھنے لگی جو اسی طرف آ رہی تھی۔

''کیا ہوا، تمہاری سہیلیاں ابھی تک نہیں آئیں؟'' امل اس کے پاس بیٹھی تو کنول نے مسکرا کر سوال کیا۔

''سب آ گئی ہیں۔ ان ہی سے باتیں کر کے آ رہی ہوں۔ میں نے سوچا کہ آپ اکیلی بیٹھی بور ہو رہی ہوں گی۔ اس لیے میں آپ کے پاس آ گئی۔''

''میری بوریت کی فکر مت کرو، تم اپنی سہیلیوں کے ساتھ انجوائے کرو۔''

''شیور؟''

''یس۔'' کنول نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ایسا کرو مجھے ایک گلاس پانی لا دو پہلے، پھر چلی جانا۔''

امل گلاس میں پانی لا رہی تھی۔ قریبی میز کے پاس سے گزری، وہاں رکھی کرسی اچانک ہی پیچھے، دئی اور اس پر بیٹھا فرد کھڑا ہوا مگر اس سے پہلے جو کرسی اس نے پیچھے کی وہ امل کے پیر سے یوں ٹکرائی کہ وہ گرتے گرتے بچی مگر پانی کا گلاس نہ بچ سکا۔ ہاتھ سے چھوٹ کر سیدھا پیر پر گرا، امل کے کپڑے، پیر، سینڈل گیلے ہوئے سو ہوئے مگر پیر پر چوٹ بھی زور سے لگی تھی۔

''اف اللہ۔'' وہ بے ساختہ چیخی۔ کنول قریبی ٹیبل پر تھی۔ تیزی سے وہاں پہنچی، تب تک امل کرسی پر بیٹھی جوتے سے پیر نکالے اسے دبا رہی تھی۔ کانچ کے ٹکڑے نیچے گرے ہوئے تھے۔ کانچ پیر میں نہیں چبھا تھا۔ بس گلاس ڈائریکٹ پیر پر گرنے کی وجہ سے تھوڑا سا درد ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا؟ چوٹ تو نہیں لگی؟'' کنول بوکھلا کر امل سے پوچھ بھی رہی تھی اور اس کے پاؤں کا معائنہ بھی کر رہی تھی۔ ادھر ثانیہ عادل اپنے بیٹے کو ڈانٹنے میں مصروف تھیں۔ بیچ بیچ میں وہ امل سے بھی معذرت کرتی جا رہی تھیں۔

''یہ بے وقوف لڑکا شروع سے ہی ایسا ہے، لاپروا۔ مجال ہے جو ادھر اُدھر دیکھ کر کوئی کام کرے۔ گھر میں سب سے زیادہ برتن اور ڈیکوریشن پیسز اسی نے توڑے ہیں۔''

''اچھا۔'' امل نے ایک نظر اپنے ''مجرم'' پر ڈالی جو بے چارہ شرمندگی، خجالت اور برہمی کا مشترکہ پوسٹر چہرے پر سجائے کھڑا تھا۔

''رہنے دیں آنٹی! اب اتنا بھی نہ ڈانٹیں۔ آنسو نہ نکل آئیں کہیں۔'' امل کی نہ جانے کیوں ہنسی نکل گئی۔

ذہاب نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

''بدتمیز، چڑیل، کہیں کی۔'' (مگر چڑیلیں اتنی

پیاری تو نہیں ہوتیں) اندر سے کسی نے دہائی دی۔
"آپ بیٹھیں مما! میں آپ کے لیے پانی لاتی ہوں۔" اہل کھڑی ہونے لگی۔
"نہیں، نہیں۔ تم بیٹھو۔" کنول اور ثانیہ بیک وقت بولیں۔
"ذہاب لے آئے گا۔" ثانیہ نے بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے حکم کی تعمیل میں دوڑ پڑا۔ یہاں کھڑے کھڑے تو شرمندگی ہی ہو رہی تھی۔
"میں اپنی مما کا کام خود کرتی ہوں۔" اہل سنجیدگی سے بولتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ ذہاب کے چہرے اور آنکھوں کی برہمی اس نے محسوس کر لی تھی۔
ذہاب پانی کا گلاس بھر چکا تھا۔ اہل نے دوسرا گلاس لے کر ڈسپنسر کے نیچے لگایا۔
"ہائی داوے، میں کوئی لڑکی نہیں ہوں جو بات بات پہ آنسو بہاتا پھروں۔" ذہاب نے سخت بھنائے ہوئے لہجے میں اب اہل کو جواب دیا تھا۔
"ایکسکیوزمی۔" اہل سیدھی ہوئی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ "اب لڑکیاں بھی بہت بہادر ہوگئی ہیں۔ بات بات پہ آنسو بہانا چھوڑ دیا ہے۔"
"اچھا۔ ہر چینل کے، ہر ڈرامے میں، ہر عورت اور ہر لڑکی کو آنسو بہاتے ہی دکھایا جاتا ہے۔" ذہاب نے اپنی ممی کے پسندیدہ ڈراموں کا حوالہ دیتے ہوئے مبالغہ آرائی کی انتہا کر دی۔
"ڈرامے اور اصل زندگی میں فرق ہوتا ہے۔" ایک شانِ بے نیازی سے بولتے ہوئے اس نے گلاس اٹھایا اور چل پڑی۔
"مثلاً کیا فرق ہوتا ہے؟" اس کے پیچھے چلتے ہوئے ذہاب اس کے برابر آ گیا۔
"میں یہاں تقریب اٹینڈ کرنے آئی ہوں، لیکچر دینے نہیں۔"
"یہ لیں آنٹی! یہ لیں مما۔" دونوں نے تقریباً ایک ساتھ پانی کا گلاس کنول کے آگے رکھا۔
"لاؤ ذہاب! ایک گلاس مجھے دے دو۔" اتنی دیر سے خاموش بیٹھے عادل احسن نے کنول کی مشکل آسان کی جو دونوں گلاسوں کو بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

"عادل!" رات گئے تقریب سے واپسی کے بعد ثانیہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنا میک اپ صاف کر رہی تھیں۔ شوہر کو مخاطب کیا تو وہ متوجہ ہوئے اور موبائل ایک طرف رکھ دیا۔
"وہ بچی کتنی پیاری تھی نا جو آج تقریب میں ملی تھی، اہل۔ نام بھی بہت پیارا ہے، ہے نا۔"
"بیگم صاحبہ! جب سے آپ اپنے بیٹے کے لیے بہو دیکھ رہی ہیں، آپ کو ہر لڑکی پیاری لگتی ہے غالباً یہ بھی چوتھی پانچویں لڑکی ہے جسے آپ پیاری کہہ رہی ہیں۔" عادل مسکرائے۔
"مگر آپ کے بیٹے کو تو کوئی پسند ہی نہیں آتی۔ ہر بار ٹال جاتا ہے مگر میں نے فیصلہ کر لیا ہے اس بار اہل کو فائنل کر لوں گی۔" انہوں نے ٹشو سے چہرہ صاف کیا۔
"صاحب زادے سے تو مشورہ کر لیں۔"
"رہنے دیں، چار پانچ بار کر چکی ہوں مشورہ۔ ہر بار انوکھا ہی جواب سننے کو ملا ہے۔ میں نے نمبر لے لیا تھا کنول سے۔" ساتھ ہی ساتھ انہوں نے انکشاف کیا۔
"ماشاء اللہ بڑی کوئیک سروس ہے آپ کی، ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا ارادہ ہے کیا؟" وہ کہنی کے بل نیم دراز ہوئے۔
"بس یوں ہی سمجھ لیجیے۔" چہرہ صاف کر کے وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئیں۔
ذہاب کے سامنے انہوں نے اہل کا نام لیا تو اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔
"وہ......بدتمیز لڑکی؟"
"اچھا، تم سے کیا بدتمیزی کی ہے اس بے چاری نے۔" ماں نے اسے گھور کے دیکھا۔
"بہت بولتی ہے۔"

''اچھی بات ہے، میرے سونے گھر میں کچھ تو رونق ہوگی۔''

''اس کے پاس ہر بات کا جواب ہوتا ہے امی! بہت حاضر جواب لڑکی ہے۔''

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے، کم سے کم تمہیں تو قابو میں رکھے گی۔'' امی پر اس کے اعتراضات کا الٹا ہی اثر ہو رہا تھا۔

''ویسے میاں صاحب زادے! امل کے متعلق اتنی معلومات آپ کو کیسے حاصل ہوگئیں؟'' عادل احسن نے اپنے بیٹے کو غور سے دیکھا۔

''پانچ منٹ بات ہوئی تھی۔''

''پانچ منٹ میں اتنا کچھ جان لیا؟''

''اتنی پہچان ہے انسانوں کی ابا حضور۔'' ذہاب مسکرایا۔ زیادہ لاڈ دکھاتا تو عادل کو ابا حضور کہہ کر مخاطب کرتا۔

''اتنی پہچان ہے انسانوں کی، پھر بھی اعتراض کر رہے ہو؟'' ابا حضور نے سوال اٹھایا۔

''آپ کو پتا نہیں کیا نظر آ گیا اس لڑکی میں۔ مجھے تو نہیں اچھی لگی وہ۔'' ذہاب نے ناک سکیڑی۔

''بات یہ ہے بیٹا جی! ہمیں آپ کی طرح انسانوں کی پہچان تو اتنی نہیں مگر اپنے بیٹے کی پہچان ضرور ہے اور ہمارا وجدان کہتا ہے کہ ہم سے پہلے اور ہم سے زیادہ وہ لڑکی ہمارے بیٹے کو پسند آ گئی ہے۔'' عادل احسن نے سنجیدگی سے کہا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' ذہاب تیزی سے سیدھا ہوا۔

''جو تمہارے کان سن رہے ہیں۔'' امی نے اس کا کان پکڑا۔

''سیدھی طرح ہاں کرو گے یا کھینچوں تمہارے کان؟''

''اف، امی حضور!'' ذہاب بلبلایا۔

''جو لڑکی آنے سے پہلے ہی میرے کان کھنچوا رہی ہے، وہ آنے کے بعد کیا غضب ڈھائے گی؟''

''غضب تو خیر کیا ڈھائے گی، سیدھا کر دے گی تمہیں۔'' بیٹے کی گت بنتی دیکھ کر وہ مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆

سلائس پہ مکھن لگاتے ہوئے ہاتھ ایک دم رکے اور منہ حیرت سے کھل گیا۔ کنول نے بات ہی ایسی کی تھی۔

''پروپوزل؟ یعنی کہ رشتہ...... یعنی کہ شادی؟''

''ابھی صرف رشتہ اور منگنی...... شادی تمہارے گریجویشن کے بعد اور شادی کے بعد پڑھنا چاہو تو پڑھ لینا۔ ان کی طرف سے کوئی پابندی نہیں۔'' کنول نے متانت اور تفصیل سے بیٹی کو جواب دیا۔

''مگر مجھے ابھی نہ کوئی منگنی کرنی ہے، نہ شادی۔ ابھی میں نے صرف انٹر کیا ہے، ماسٹرز تو کرنے دیں کم از کم۔'' امل بے چاری اس نئی افتاد پر حیران پریشان، ناشتا کرنا بھی بھول گئی۔

''اچھے رشتے روز روز نہیں ملتے۔ ذہاب کے والدین بہت اچھی نیچر کے ہیں۔ اچھے شریک حیات کے ساتھ اچھی سسرال کا ملنا بھی خوش نصیبی ہے۔'' کنول اپنے تجربات کی روشنی میں اسے سمجھا رہی تھی۔

''انکل اور آنٹی تو اچھے ہیں مگر وہ لڑکا بہت اکڑو ہے۔'' امل کو وہ برہمی اور خفگی یاد آئی جو ذہاب کے چہرے پر دیکھی تھی۔

''کوئی نہیں، اچھا بھلا مہذب اور ڈیسنٹ لڑکا ہے۔ اتنی تمیز سے بات کرتا ہے۔'' کنول نے بیٹی کی بات کی نفی کی۔

''اچھا؟ آپ سے ہی کی ہوگی تمیز تہذیب سے بات، مجھ سے تو......'' امل منہ ہی منہ میں بڑبڑا کے رہ گئی۔

''تم ناشتا کرو، فکر مت کرو۔ اللہ جو کرے گا بہتر ہی کرے گا۔'' کنول اس کی بڑبڑاہٹ سے نہ جانے کیا سمجھی، اسے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگی۔

''اللہ تو اچھا ہی کرتا ہے پر بندے؟'' امل کے تصور میں بار بار ذہاب کا سڑیل چہرہ (اپنی دانست

ہیں) آرہا تھا۔

بعد کے مراحل یوں جلدی جلدی طے ہو رہے تھے کہ ثانیہ عادل واقعی ہتھیلی پہ سرسوں جمانے میں منہمک ہوں۔ تقریباً روز ہی وہ چلی آتیں۔ منگنی کا جوڑا پسند کروانے، کبھی انگوٹھی کا ڈیزائن، کبھی جیولری، جوتیاں، امل کے ساتھ ساتھ وہ کنول کو بھی گھسیٹ لیتیں۔ "بھئی آپ اکیلی گھر پر کیا کریں گی، سب کی پسند شامل ہو تو اچھا رہتا ہے۔" کنول تو ان کے خلوص اور محبت کے آگے زیر ہو گئی تھی۔ پوری شاپنگ کے دوران روزانہ شوفر کے فرائض ذہاب ہی انجام دے رہا تھا۔ امل اس کی موجودگی میں کچھ ریزروسی رہتی۔ ثانیہ اس کی پسند ناپسند کے بارے میں سوال کرتیں اور وہ "جیسے آپ کی مرضی"، "جی اچھی ہے، لے لیں" قسم کے جملے دہرائی رہتی۔ اسی تناؤ اور کشمکش میں ذہاب نے بھی اپنی خریداری کر لی تھی۔

"دیکھو تو امل! یہ سوٹ اچھا لگ رہا ہے نا ذہاب کے لیے۔ بہت جچے گا۔" ثانیہ، امل کو متوجہ کر رہی تھیں۔

"جی، اچھا ہے۔" امل نے نیم توجہی سے سوٹ دیکھا (مجھے کیا معلوم لڑکوں کے کلر اور فیشن سینس کے بارے میں)۔

"ٹھیک ہے ذہاب! یہی لے لو۔" امی نے فیصلہ صادر کیا۔

"مجھے اچھا نہیں لگ رہا، دوسرا دیکھتا ہوں۔" ذہاب سنجیدگی سے کہتا ہوا آگے بڑھ گیا (محترمہ کو کوئی انٹرسٹ ہی نہیں شاپنگ میں۔ پتا نہیں مما کیوں ساتھ ساتھ لیے پھرتی ہیں) وہ جزبز ہو رہا تھا اور اس وقت اور زیادہ ہوا جب فوڈ کورٹ میں امی جان، کنول کو لے کر وہاں سے اٹھ گئیں۔

"بھئی، آج شاپنگ کا آخری دن ہے۔ تین دن بعد منگنی ہے۔ اب تم دونوں باتیں کرو، ایک دوسرے کو تھوڑا جان لو۔"

وہ خود تو دوسری میز پر بیٹھ گئیں۔ امل خائف ہو گئی، ذہاب کا مستقل تنا ہوا سنجیدہ چہرہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ادھر ذہاب کو امل کی مستقل خاموشی کھل رہی تھی۔

"پتا نہیں کیا بات ہے؟" دونوں کے دلوں میں ایک ہی خدشہ تھا۔

چند لمحے خاموشی کے دونوں کے درمیان سے گزر گئے۔

"آپ اس رشتے پہ راضی ہیں؟" بیک وقت دونوں کے منہ سے ایک ہی سوال نکلا تھا اور پھر امل جھینپ کر مسکرا دی اور ذہاب حیرانی سے۔

"پہلے میں جواب دوں یا آپ دیں گی؟" ذہاب نے بہت تہذیب سے سوال کیا تھا۔

"آپ بتا دیں۔" امل نے دھیرے سے مگر اسی شائستگی سے جواب دیا۔

"دراصل امی کو آپ بہت پسند آئی تھیں، بابا کو بھی اور امی اکثر میری شاپنگ کر لیتی ہیں۔ وہ جو کچھ بھی میرے لیے لاتی ہیں، مجھے اس وقت پسند آئے نہ آئے، وقت کے ساتھ ساتھ وہ پسند بھی بن جاتی ہیں بلکہ بہت عزیز ہو جاتی ہیں۔" ذہاب نے سچائی اور سادگی کے ساتھ اپنی وضاحت کر دی۔ اب وہ امل کو سننے کا منتظر تھا۔

"میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ مما کو آپ بھی اچھے لگے اور انکل آنٹی بھی۔ تو مجھے لگتا ہے کہ بڑوں کا فیصلہ ٹھیک ہی ہوتا ہے۔"

"پھر آپ اتنی خاموش خاموش کیوں ہیں؟" ذہاب نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔

"آپ اتنے سنجیدہ سنجیدہ کیوں ہیں؟"

"مجھے لگا شاید آپ کی مرضی نہیں ہے اس رشتے میں۔" ذہاب نے اعتراف کیا۔

"مجھے بھی یہی لگا تھا آپ کے بارے میں۔"

"اوہ!" ذہاب نے لب سکوڑے۔

"چلیں کسی معاملے میں تو ہمارے خیالات ایک جیسے ہیں۔ ہو سکتا ہے آگے اور معاملات میں بھی ہماری فیلنگز ایک جیسی ہو جائیں، کیوں؟" اپنی چمکتی ہوئی آنکھیں اس نے امل پر مرکوز کیں۔

''شاید۔'' اہل کا لہجہ مبہم تھا۔
''آئس کریم کھائی ہو؟'' وہ آپ سے تم پر آ گیا۔
''بہت۔''
''اس کا مطلب ہے ہمارے فریزر میں آئس کریم کبھی نہیں بچے گی۔''
''کیوں؟''
''کیونکہ میں بھی بہت کھاتا ہوں۔'' وہ بے ساختہ بولا تھا اور دونوں ایک ساتھ ہنسے اور ایک ساتھ ہی دونوں کو کچھ محسوس ہوا اور دونوں ہی اپنی فیلنگز چھپانے کے لیے ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔

☆☆☆

کھانے کے بعد اہل نے کافی بنائی اور دو مگ بھر کے کنول کے پاس لے آئی۔
''مما! کافی۔'' اس نے مگ بڑھایا۔
''تھینک یو بیٹا۔'' کنول نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرائی۔
''آپ کن کاموں میں الجھی رہتی ہیں۔'' اہل نے ماں کے سامنے جیولری دیکھی۔ کنول کی شادی کے زیورات تھے، آئے دن انہیں نکال کر حساب کتاب لگاتی رہتی کہ انہیں تڑوا کر نئے ڈیزائن کی چیزیں بنوائے یا انہیں اجلوا کر ایسے ہی دے دے۔ بھاری زیور تھا، ڈیزائن بھی اچھا تھا، اہل سے پوچھتی تو وہ آپ کی مرضی کہہ کر ایک طرف ہو جاتی۔
''یہی دیکھ رہی تھی کہ جیولری کا کیا کروں؟ تم تو سب کچھ میری مرضی پہ چھوڑ دیتی ہو۔'' کنول زیورات کے ڈبے بند کرنے لگی۔
''کتنی جلدی دو سال گزر گئے، پتا بھی نہیں چلا۔''
''جی۔'' اہل نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے منہ نیچے جھکا لیا۔ یہ تو کوئی ذہاب سے پوچھے جو فون پر دہائیاں دیتا پھرتا تھا۔ یہ دو سال ہیں یا دو صدیاں، محبت میں وقت کیوں نہیں گزرتا؟ ایسا لگتا ہے، ٹھہر گیا ہے، رک گیا ہے اپنی جگہ۔ وہ اپنی بے تابیوں کا اظہار کرتا اور اہل کو ہنسی آ جاتی۔ اس وقت بھی اس نے اپنی بے ساختہ امڈ آنے والی ہنسی کو بمشکل قابو کیا۔

☆☆☆

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ خاص طور پر ذہاب کے والدین نے دل کھول کر اپنے ارمان پورے کیے۔ بہو گھر لانے کے بعد بھی خوشی کے مارے ان کے قدم زمین پر ٹکتے ہی نہیں تھے۔
''کیسا سناٹا ہو گیا ہے گھر میں۔'' ذہاب اور اہل کے ہنی مون پر جانے کے بعد ثانیہ بولائی بولائی سی گھر میں پھر رہی تھیں۔
''ہم تو موجود ہیں بیگم صاحبہ! آپ کا دل بہلانے کے لیے۔'' عادل نے ایپرن گلے میں ڈال کر کچن کا رخ کیا۔ چھٹی کے دن اکثر وہ اسی طرح گھر میں رونق لگاتے تھے۔
''کیا کھانا پسند کریں گی مادام! دنیا کا بہترین شیف آپ کی خدمت میں موجود ہے۔'' ایک ہاتھ پھیلا کر وہ مزاحیہ انداز میں مخاطب ہوئے۔
''عادل! کبھی کبھی میں ایک بات سوچتی ہوں۔'' ثانیہ نے سنجیدگی سے انہیں مخاطب کیا۔
''جی۔'' عادل کرسی پر بیٹھ گئے۔
''اہل کی رخصتی کے بعد کنول کتنی اکیلی ہو گئی ہے بے چاری۔ میں نے کہا تھا اس سے کہ کسی اچھے انسان کی رفاقت قبول کر لینی چاہیے۔ شادی کے بعد بچے اپنی دلچسپیوں اور ذمے داریوں میں مگن ہو جاتے ہیں۔ اہل کتنا وقت دے سکے گی؟ مجھے تو بڑا ترس آتا ہے کبھی کنول کو دیکھ کر۔ اتنی حسین، جوان اور قسمت دیکھو تو......'' ثانیہ نے تاسف سے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔ موبائل بج رہا تھا۔ عادل نے اٹھا کر ثانیہ کی طرف بڑھایا۔
''لیجیے، آپ کے بیٹے بہو آن لائن ہیں۔ پہلی بہو دیکھی ہے جو اپنے ہنی مون پر بھی صبح شام ساس کو کال کرتی رہتی ہے۔'' عادل نے عادت کے مطابق چٹکلہ چھوڑا۔
''نظر مت لگائیں، میری اتنی اچھی بہو کو۔''

ثانیہ نے ان سے فون لیا اور بیٹے بہو سے بات کرنے لگیں۔
"تم نے تو میری امی پر قبضہ جمالیا۔" فون بند کرنے کے بعد ذہاب، امل کو چھیڑ رہا تھا۔
"صرف امی پہ؟" امل نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا۔
"ارے بیٹے کو تو قابو کرلیا ہے تم نے، ضرور کوئی جادو ٹونا کیا ہے تم نے مجھ پر۔" ذہاب یک لخت انتہائی سنجیدہ ہوگیا۔
"تم نے بھی تو سفلی کرایا ہے مجھ پر۔ کچھ اور دکھائی دیتا ہے نہ سجھائی، سوائے......" امل نے مسکراتے ہوئے اقرار ادھورا چھوڑا۔
"سوائے؟" ذہاب سراپا سماعت بن گیا۔
"سوائے اس آئس کریم کے، جو سامنے نظر آرہی ہے۔" امل کھلکھلاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔
"واپسی سے پہلے یہ ادھورا اقرار پورا کروا کے رہوں گا۔" ذہاب نے منہ پہ دھمکی آمیز انداز میں ہاتھ پھیرا۔

☆☆☆

"اتنا مزا آیا مما، کیا بتاؤں۔" ہنی مون سے واپسی کے بعد امل ایک دو دن کے لیے میکے آئی تھی۔ کنول کو سارا احوال سناتے ہوئے ہر تھوڑی دیر بعد اس کا ٹاپ مصرعہ یہی تھا۔
"اللہ میری بیٹی کو اسی طرح خوش و خرم رکھے، آمین۔" کنول نے امل کا چمکتا چہرہ اور دمکتا وجود دیکھا تو بے اختیار دل سے دعا نکلی۔ وہ اس وقت امل کا پسندیدہ پاستا اور کوکونٹ کیک بنا رہی تھی اور بیٹی کی چہکار سنتی جا رہی تھی۔
"امی! آپ بالکل اکیلی ہوگئی ہیں۔ آپ کے بارے میں سوچتی ہوں تو گلٹی فیل ہوتا ہے۔ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔" امل نے اچانک ہی ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اس کا لہجہ تاسف اور محبت سے بوجھل تھا۔
"بے وقوف لڑکی! شادی تو ایک نہ ایک دن کرنی ہی تھی۔ اچھا ہوا نا ابھی سے اپنے گھر بار کی ہوگئیں۔ اچھے لوگ مل گئے۔ رہی بات میری تنہائی کی تو فکر مت کرو، اسکول جوائن کرلیا ہے، قریب میں ہی ہے۔ آدھا دن تو بچوں کے ساتھ گزر جاتا ہے۔ شام میں بھی کچھ بچے آجاتے ہیں سپارہ اور ٹیوشن پڑھنے۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ پھر نیچے بڑی آپا ہیں، ان کے پاس چلی جاتی ہوں۔ کبھی وہ اوپر آجاتی ہیں۔ امی (ساس) کے انتقال کے بعد وہ بے چاری بھی بالکل اکیلی ہوگئی ہیں اور پھر تم بھی تو روز ہی چکر لگالیتی ہو۔"
امل کی بے یقین نگاہوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کنول نے پیار سے اس کا رخسار چھوا۔
"کتنا اچھا ہوتا اگر پاپا زندہ ہوتے تو؟" امل کے لہجے میں حسرت تھی۔
"اللہ کی مرضی یہی تھی اور...... وقت تو گزر ہی جاتا ہے۔" کنول نے رخ موڑتے ہوئے دھیمے سے جواب دیا۔
رات کھانے پر ذہاب بھی موجود تھا۔ ڈنر کے بعد وہ دونوں چلے گئے۔ کنول نے کام نپٹا کر عشاء کی نماز پڑھی اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔ امل کی شادی کے بعد تنہائی کا احساس اور بھی سوا ہوگیا تھا مگر اب وہ پہلے کی طرح رات رات بھر کروٹیں نہیں بدلتی تھی۔ دن بھر خود کو مصروف رکھ کر اتنا تھکا لیتی تھی کہ رات کو نیند آنکھوں تک آنے میں زیادہ نہیں ستاتی تھی۔ مگر آج نیند آنے سے پہلے کچھ یادیں، کچھ خیال بے ساختہ ہی دوڑے چلے آئے۔ امل کی خوشی، اس کی ہنسی، محبتوں کی بارش میں بھیگتا اس کا پور پور...... کنول کو اس کا ماضی، اس کا اپنا آپ یاد دلا رہا تھا۔ کبھی اس کی ہنسی بھی جھرنے کی طرح بہتی اور بہتی ہی چلی جاتی تھی۔
چاہتوں کی پھوار میں وہ بھیگتی اور بھیگتی ہی چلی جاتی تھی پھر امل نے آکر زندگی کی چاندنی اور بھی روشن کردی تھی مگر یہ بہار بس کچھ ہی سالوں کی تھی۔ اندھیروں نے آکر پھر ایسے ڈیرے ڈالے کہ اب تو آنکھیں ان تاریکیوں سے ہی مانوس ہوگئی تھیں مگر آج

امل کو دیکھ کر ماضی کی تصاویر بار بار سامنے آرہی تھیں۔

☆☆☆

"یا اللہ! کسی دکھ کا سایہ بھی میری بچی پہ نہ ڈالے گا۔"

انجانے خوف و خدشات سے ڈرا اس کا دل ہر ہر لمحے امل کے لیے دعا گو رہتا تھا۔ اپنی طرف تو اس کا دھیان کم ہی جاتا تھا۔ اس کی زندگی کا محور اور مقصد بس امل تھی اور اس کی خوشیوں کی دعا، خود کو کنول نے جیسے فراموش کر ڈالا تھا مگر ثانیہ عادل کے دل میں کنول کے لیے خیر خواہی کا جو چراغ روشن تھا وہ اتنی آسانی سے کنول کو اور اس کی بے رنگ زندگی کو فراموش کرنے نہیں دے رہا تھا۔

ثانیہ ہر ممکن کوشش کر رہی تھی کہ کنول کی زندگی سے تنہائی کا اندھیرا دور ہو جائے اور خوشیوں کے خوش رنگ پھول کھل جائیں۔

☆☆☆

آفس سے آتے ہی سب سے پہلا کام وہ نہا کر کپڑے بدلنے کا کرتا تھا۔ آج بھی معمول کے مطابق آفس سے آنے کے بعد نہا دھو کر نکلا تو امل کا چہرہ دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ گو کہ وہ تمام تر لوازمات کے ساتھ تیار تھی پھر بھی اس کا چہرہ دیکھ کر ذہاب کو غیر معمولی پن کا احساس ہو رہا تھا۔

"بہت خوب صورت لگ رہی ہو اور...... کچھ پریشان بھی۔" گیلے بال تولیے سے خشک کرتے ہوئے ذہاب امل کے برابر بیٹھ گیا۔

"امی کو کیا ہو گیا ہے ذہاب؟ عجیب عجیب باتیں کر رہی ہیں؟" امل شروع ہو گئی۔

"کیا ہوا؟ ساس صاحبہ نے بہو صاحبہ کو کچھ کہہ دیا؟"

"نہیں بھئی، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"پھر کیسی بات ہے؟"

"تمہارے کوئی انکل ہیں زبیر انکل؟"

"زبیر انکل...... ہاں، امی کے فرسٹ کزن ہیں۔ مگر بات کیا ہے؟"

"ان کا پروپوزل لائی ہیں مما کے لیے اور مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ میں، اپنی مما کو راضی کروں۔"

"تم اکیلی ہو، ہم دونوں مل کر مما کو راضی کرتے ہیں۔ اس سے اچھی کیا بات ہے، ان کا گھر بس جائے گا اور......" ذہاب اپنی بیگم کی دلی کیفیت اور خیالات سے لاعلم اپنی ہی ہانک رہا تھا۔

"آپ کا دماغ ٹھیک ہے ذہاب! نانی بننے جارہی ہیں وہ، اس عمر میں شادی کرتی اچھی لگیں گی؟ لوگ کیا کہیں گے، ہنسیں گے ہم پر۔ نہیں بھئی، میں دنیا والوں کی باتیں سن سکتی ہوں نہ انہیں فیس کر سکتی ہوں۔"

امل کے دل و دماغ میں وہی اسباق تازہ اور زندہ تھے جو بچپن میں دادی اور پھپھو نے پڑھائے تھے۔ وہ ان ہی خیالات پر قائم تھی۔ چودہ جماعتوں کی تعلیم بند کمرے کے باہر ہی بارش کی طرح برستی رہی۔ جہل اور دقیانوسیت کے قفل توڑ کر اندر داخل نہیں ہو سکی۔ اس کی باتوں اور قطعی لہجے پر ذہاب حیران ہو رہا تھا۔

"تم اتنی کنزرویٹو کیوں ہو رہی ہو؟ اپنی عمر کے بہترین سال آنٹی نے تمہارے لیے کھپا دیے، اب کچھ روشنیوں اور خوشیوں پر ان کا بھی کوئی حق ہے یا نہیں؟" وہ تاسف سے اپنی بیگم کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا، مگر امل کچھ سمجھنے پر تیار نہیں تھی۔

"تم پلیز امی کو بتا دو کہ مما کے متعلق نہ اس طرح کی کوئی بات کریں، نہ کوششیں۔" امل کا لہجہ بے زاری لیے ہوئے تھا۔

"تم اپنا فیصلہ سنا رہی ہو، کبھی اپنی مما کی مرضی جاننے کی کوشش کی تم نے؟"

"پوچھ کے دیکھ لو، وہ انکار ہی کریں گی۔" ذہاب کے بحث کرنے پر امل جزبز ہو رہی تھی۔

"اس لیے کہ انہوں نے ہمیشہ تمہاری خوشی اور مرضی کو مقدم رکھا اور اپنے لیے سوچنا چھوڑ دیا۔" ذہاب کا تجزیہ حقیقت اور سچ پر مبنی تھا مگر امل چڑ گئی۔

"یہ قسمت کے معاملات ہیں، خدا کی مرضی تھی۔ جو ہوا، آپ تو اس طرح بات کر رہے ہیں جیسے مجھے بلیم کر رہے ہوں۔"

"اللہ کا حکم اور اس کی مرضی پوری ہو چکی تھی ال! اس کے بعد راستے بنائے جاسکتے تھے مگر الٹا ایک دیوار چن لی گئی اور اسے اتنا محترم سمجھ لیا گیا کہ ڈھانے کا خیال بھی گناہ سمجھا گیا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم کتابیں پڑھنے کے شوقین ہو مگر پریکٹیکل لائف میں کتابی فلسفے کام نہیں آتے۔" ال مزید بحث سے بچنے کے لیے وہاں سے اٹھ ہی گئی۔

☆☆☆

اسٹڈی کی کھلی کھڑکی سے دھوپ روشنی اندر آرہی تھی مگر آنکھوں میں ابھی تک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر انہوں نے آنکھیں موند لیں۔ بند آنکھوں کے پردے پر ایک شبیہہ لہرائی اور اجالا ہی اجالا ہو گیا۔

"بہت بے ایمانی کی تم نے ثانیہ! کوئی ایسے بھی کرتا ہے بھلا؟ پل بھر بھی نہیں لگا ہاتھ چھڑانے میں۔"

عادل نے بند مٹھی کھولی۔ ان ہاتھوں پر وہ لمس اب بھی تازہ تھا حالانکہ مہینہ گزر چکا تھا۔ دن اور رات ایک کے بعد ایک آرہے تھے اور جا رہے تھے مگر یقین نہیں آرہا تھا کہ اس دن ثانیہ نے عادل کو چائے کا مگ تھمایا، اس کی کسی شوخی پہ مسکرائی اور مسکراتے مسکراتے ہی اچانک چکرائی اور گر پڑی۔ فوری طور پر تو کسی کی کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ قریبی کلینک لے کر گئے تو انہوں نے اسپتال بھیج دیا۔ جہاں فوراً ٹیسٹ ہوئے اور جب تک برین ہیمبرج کی رپورٹ آئی۔

ثانیہ اس دنیا سے جا چکی تھی۔ عادل، ذہاب اور ال تینوں ہی سکتے کے عالم میں تھے۔ دو گھنٹے پہلے تک دونوں ساس بہو نے مل کر کھانا پکایا اور سب نے مل کر کھایا۔ پھر انہوں نے چائے بنائی' ال پورے دنوں سے تھی۔ وہ بہت خیال رکھ رہی تھی اس کا۔

چائے بنا کر پہلے ذہاب کو، پھر عادل کو دی اور اس کے بعد......

کل اس کی آنکھ نے کیا زندہ گفتگو کی تھی
گماں بھی نہ تھا کہ یہ شخص مرنے والا ہے

عادل نے بند آنکھیں کھولیں اور آنکھیں مسلنے لگے۔ عجیب سی چبھن ہو رہی تھی۔

"بابا......!" ذہاب اندر آیا۔ "کھانا کھا لیں۔"

"کھانا...... ابھی تو ناشتا کیا تھا یار!" عادل ایک پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر لے آئے۔

ثانیہ کے بعد بیٹا اور بہو ان کا بہت خیال رکھتے تھے اور عادل اپنی اداسی تنہائی اور دکھ کو ایک طرف کر کے ان کے سامنے جھوٹا سچا مسکرا ہی لیتے تھے۔

"اس ابھی کو چھ گھنٹے گزر چکے ہیں، چلیں اٹھیں۔"

"اچھا، تم چلو۔ میں آرہا ہوں۔" وہ کسل مندی سے اٹھے۔ روزانہ آفس سے آنے کے بعد اور چھٹی کے دن، وقت گزرتا ہی نہیں تھا۔ وہ کتابوں میں پناہ ڈھونڈ لیتے پھر ذہاب اور ال بھی ہر ممکن حد تک انہیں کمپنی دیتے تھے مگر بات یہ تھی کہ اب وہ بولنے سے زیادہ سننے کو ترجیح دینے لگے۔

ان کی شوخیاں اور باتیں بھی جیسے ثانیہ اپنے ساتھ سمیٹ لے گئی تھیں۔ عادل کو کبھی اپنا آپ اتنا خالی خالی لگتا کہ وہ خوف زدہ سے ہو جاتے۔ پھر گھر میں ایک ننھی پری کی قلقاریاں گونجنے لگیں۔

بہت دنوں بعد وہ دل سے خوش ہوئے اور مسکراتے تھے مگر اس خوشی کے ساتھ ایک کسک بھی جڑی ہوئی تھی جو انہیں ہی نہیں ال اور ذہاب کو بھی تھی۔ کاش کہ ثانیہ بھی اس خوشی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتیں۔ ال اور ذہاب نے بچی کا نام ثانیہ رکھا تھا۔ ننھی ثانیہ کی آمد سے گھر کی فضا پر چھائی اداسی کی چادر تڑخ گئی تھی۔ عادل کے اکیلے پن کو بھی اس چھوٹے سے وجود نے بانٹ لیا تھا۔ اس کی کشش کنول کو بھی آئے دن اور بھی روزانہ ہی یہاں گھسیٹ لاتی تھی۔ ایک معصوم سی مسکراہٹ دونوں گھرانوں اور سب کے دلوں میں دور تک پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

ریسٹورنٹ کی اوپری منزل میں، جس میز پر وہ بیٹھے تھے وہاں سے روشنیوں کے شہر کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ نیچے سڑکوں پر بھاگتا دوڑتا ٹریفک اور لوگوں کا اژدہام۔ ذہاب کی نظریں کافی دیر سے ایک ہی جگہ ٹکی ہوئی تھیں۔ امل بہت دیر سے اسے دیکھ رہی تھی اور اسے اب محسوس ہوا کہ ذہاب کچھ دیکھ نہیں بلکہ سوچ رہا ہے۔ اس کی نگاہیں کہیں اور تھیں اور دماغ کہیں اور...... آج کئی مہینوں بعد وہ دونوں کھانا کھانے باہر آئے تھے۔ ثانیہ اپنی نانی کے پاس تھی۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' امل نے میز پر رکھا اس کا ہاتھ دھیرے سے چھوا۔

''میں، بابا کے متعلق سوچ رہا تھا۔'' ذہاب نے ایک گہری سانس لی اور گردن موڑ کر امل کی طرف متوجہ ہوا

''بابا بہت اکیلے اور خاموش ہو گئے ہیں۔ بچپن سے لے کر امی کے انتقال تک میں نے کبھی انہیں اتنا دل شکستہ نہیں دیکھا۔ بہت ہنسنے بولنے، چہکنے والے شخص تھے وہ۔ مجھ سے ان کا یہ روپ برداشت نہیں ہو رہا۔'' ذہاب کے چہرے سے فکرمندی چھلک رہی تھی۔

''امی کے انتقال کو ابھی ایک سال ہی ہوا ہے ذہاب! اچانک دھچکا لگا تھا، سنبھلنے میں وقت تو لگے گا۔ دھیرے دھیرے ٹھیک ہو جائیں گے وہ، وقت ہر زخم پر مرہم رکھتا چلا جاتا ہے۔'' امل نے اسے تسلی دی۔

''میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔''

''کیا؟''

''جوانی کی نسبت اس عمر میں شریک حیات کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ میں نے بابا سے کہا ہے کہ وہ نکاح کر لیں۔''

''وہ راضی ہو گئے؟'' امل نے آنکھیں پھاڑیں۔

''ابھی تو نہیں ہوئے، مگر ہو جائیں گے۔ میں انہیں راضی کر لوں گا، تم......'' ذہاب نے ایک نظر امل کو دیکھا۔

''تم اپنی مما کو راضی کر سکتی ہو؟'' وہ فقط ایک لمحے کے لیے ہچکچایا پھر روانی سے بول پڑا۔

''کیا؟ تمہارا دماغ ٹھیک ہے ذہاب؟'' امل کو چند لمحے لگے تھے اس کی بات سمجھنے میں اور پھر امل کا ردعمل حسب توقع ہی تھا۔

''میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے امل! تم بھی اپنا ذہن کشادہ کرو، خود کو ان کی جگہ رکھ کر سوچو۔''

''تم پاگل ہو گئے ہو ذہاب! تمہیں بابا کے لیے جو کچھ کرنا ہے کرو۔ میں کسی معاملے میں دخل نہیں دوں گی مگر میرے اور میری مما کے پیچھے مت پڑو۔'' امل کا غصہ اس کے چہرے اور اس کے لفظوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

''مجھے حیرت ہے امل! تم اپنی ماں سے زیادہ دنیا والوں کی اور ان کی باتوں کی پروا کرتی ہو۔ کسی کا گھر اور دل آباد ہو جائے، اس سے بڑی نیکی کیا ہو گی؟''

''ذہاب پلیز، اسٹاپ اٹ۔ تم نے اس موضوع پر مزید بات کی تو میں اٹھ کر چلی جاؤں گی۔'' امل نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

''تم ذہنی طور پر ابھی تک بچی ہو۔'' ذہاب منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ وہ فی الحال خاموش ہو گیا تھا مگر دل ہی دل میں اس نے کچھ تہیہ کر لیا تھا۔

اور دو دن بعد ہی وہ آفس سے سیدھا کنول کے پاس آ گیا۔

''ایک بات کہوں مما!'' ذہاب نے کباب کا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا۔

''بڑے فارمل ہو رہے ہو۔'' کنول مسکرائی۔

''ہونا پڑتا ہے، یہ بتایئے آپ مجھے بیٹا صرف کہتی ہیں یا دل سے سمجھتی بھی ہیں؟''

''تمہیں لگتا ہے کہ یہ سوال کرنا چاہیے۔'' کنول نے الٹا اس سے سوال کیا۔

''نہیں، کرنا تو نہیں چاہیے۔ آپ کے خلوص

اور محبت پر کوئی شک تو نہیں ہے مجھے۔" ذہاب نے کباب کا آخری ٹکڑا بھی اٹھایا۔
"پھر؟" کنول اب کچھ الجھ رہی تھی۔
"بات یہ ہے کہ..... امی کے بعد بابا بہت اکیلے ہو گئے ہیں۔ انہیں شریک حیات کی ضرورت ہے اور میرے گھر میں، میری امی کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا، سوائے آپ کے۔" ذہاب نے بہت بہادر بن کر اپنی بات مکمل کر لی تھی۔
"تم جانتے ہو کیا کہہ رہے ہو؟" کنول کی آنکھیں اور آواز مارے حیرانی کے پھٹ سی گئیں۔
"اچھی طرح جانتا ہوں۔"
"ذہاب! اس موضوع کو آج یہیں دفن کر دو، آئندہ ایسی بات منہ سے نکالنا بھی نہیں۔ جو عزت بنی ہوئی ہے اسے بنے رہنے دو۔"
"آپ کیوں خود پہ اتنا ظلم کر رہی ہیں۔"
"کوئی ظلم نہیں کر رہی میں اپنے ساتھ۔ خوش اور مطمئن ہوں اپنی زندگی سے۔ اب عمر کے اس موڑ پر لوگوں کو اپنی ذات سے ایک تماشا فراہم نہیں کرنا چاہتی۔"
"لوگ کون ہوتے ہیں؟ ہم اور آپ ہی تو ہوتے ہیں اور ہم اپنے ہر معاملے میں لوگوں کی پروا کرتے رہیں تو ٹھیک سے جی سکیں نہ مر سکیں۔"
"میں چائے لاتی ہوں۔" کنول کوئی جواب دیے بغیر کچن کی طرف مڑ گئی۔
"بہت مشکل لگ رہا ہے یہ پہاڑ سر کرنا۔" ذہاب سوچ رہا تھا۔ بابا کو راضی کرنا اور کنول کو، پھر اہل کو سمجھانا۔ بہت بھاری پتھر اٹھا لیا تھا اس نے، مگر اسے چوم کر واپس رکھ دینے کا ارادہ اس کا ہرگز نہیں تھا۔

☆☆☆

آج خالدہ نہیں آئی تھی۔ بے چاری بیمار تھی۔ اس کی چھٹی نے اہل کو مصروف کر دیا تھا۔ گھر کے کام ثانیہ کے کام اور پھر چھٹی کا دن، عادل اور ذہاب دونوں گھر پر۔ وہ گھن چکر بن گئی تھی۔ ثانیہ کے دانت نکل رہے تھے، وہ بھی چڑچڑی ہو رہی تھی۔ بات بے بات رو پڑتی، ذہاب نے اس کی فیڈر بنالی اور اسے پلانے لگا۔
"تھینک یو ذہاب!" اہل دوپہر کے لیے ہنڈیا چڑھا رہی تھی۔ ذہاب کی ممنون ہو گئی۔ گھر کے کاموں میں تو نہیں مگر ثانیہ کے معاملے میں وہ اہل کی بہت مدد کروا دیتا تھا۔
"ذرا سوچو، ہم نہ ہوتے تو اس وقت یہ کام بھی اکیلی کر رہی ہوتیں۔" ذہاب نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
"ذہاب! پاگل تو نہیں ہو گئے۔ کیوں فضول باتیں کر رہے ہو۔" اہل کا یک دم ہی دل دہل گیا۔
"پانی کا بلبلہ، بس ایک پھونک کا محتاج ہوتا ہے۔ کیا بھروسا آدمی اور زندگی کا۔" ذہاب نے اپنی بیٹی کا منہ صاف کرتے ہوئے ذرا گھمبیر اور فلسفیانہ انداز میں کہا۔
"کیا ہو گیا ہے تمہیں، کیوں بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔" اہل روہانسی ہو گئی۔
"مجھے کچھ دنوں سے ایک خیال ستا رہا ہے۔" ذہاب نے خالی فیڈر ایک طرف رکھی اور بیٹی کو ڈکار دلانے کے لیے کاندھے سے لگایا۔
"کیسا خیال؟" اہل آلو چھیلنے لگی۔
"آنکھیں بند کر کے ایک منٹ کے لیے اپنی زندگی کا تصور کرو میرے بغیر۔ کیا محسوس کرو گی تم، کیا سوچو گی؟" ذہاب بولتے بولتے ننھی ثانیہ کی کمر سہلا رہا تھا۔
"تم نے آج تہیہ کیا ہوا ہے مجھے رلانے کا۔" اہل نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور احتجاجاً وہاں سے اٹھ گئی۔
"ایک تو تم فوراً ایموشنل ہو جاتی ہو۔" ثانیہ کو لٹا کر وہ فوراً اہل کے پیچھے لپکا۔
"مذاق کر رہا تھا میری ملکہ جذبات۔" پیچھے کھڑے ہو کر اس نے اہل کے کندھے دبائے۔
"میں پاپا سے شکایت کروں گی تمہاری۔" اہل

کا غصہ ابھی فرو نہیں ہوا تھا۔

''اچھا بابا کر لینا، اب تو مسکرا دو۔''

''پہلے رلاتے ہو پھر مسکرانے کو کہتے ہو۔'' اہل کی خفگی اتنی جلدی ختم ہونے والی نہیں تھی۔ وہ رخ موڑ کر چولہا جلانے لگی۔

گئی بھینس پانی میں۔ اب ایک اچھے سے ڈنر سے کم اہل محض اس کی معذرتوں سے بہلنے والی نہیں تھی۔ ایک بے بس سی آہ بھر کر ذہاب باہر نکل گیا۔

☆☆☆

روزانہ کی طرح وہ بھی ایک عام سا دن تھا۔ مگر خاص اس لیے لگ رہا تھا کہ محنت کشوں کا عالمی دن تھا۔ عادل بھی گھر پر تھے اور ذہاب بھی۔ ناشتے کے بعد عادل کچھ دیر اخبار پڑھتے رہے پھر اسٹڈی میں چلے گئے۔ پچھلے ایک سال سے ان کا معمول بن گیا تھا چھٹی کا دن زیادہ تر اپنی اسٹڈی میں گزارتے تھے۔ ایک وہ وقت تھا جب وہ چھٹی کے دن کا انتظار کرتے تھے اور وہ پورا دن بس ثانیہ اور ذہاب کے ساتھ نوک جھونک اور باتوں میں گزر جاتا تھا اور اب......؟ اب وہ سوچتے تھے کہ ہفتے کے ساتویں دن بھی ڈیوٹی پر چلے جائیں۔ چھٹی کا دن آیا ہی نہ کرے جو اتنا طویل لگتا تھا کہ ان سے گزارنا مشکل ہو جاتا تھا۔ گھبرا کر وہ کتابوں میں پناہ لینے لگے۔

ذہاب آ کر خاموشی سے بیٹھ گیا تھا۔ عادل نے ''آب گم'' بند کر کے میز پر رکھ دی۔

''کیا بات ہے برخوردار؟''

''اہل کی مما نے تو صاف ہی جواب دے دیا۔ اب کیا کروں؟'' ذہاب نے اپنی پریشانی فوراً ہی بیان کر دی اور عادل کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

''میں نے پہلے ہی تمہیں سمجھایا تھا مگر تم نہیں مانے۔''

''آپ بات کریں ان سے، وہ راضی ہو جائیں گی۔''

''پہلے خود کو تو راضی کر لوں۔''

''یہ فاؤل ہے بابا! آپ نے کہا تھا کہ آپ سوچیں گے۔'' ذہاب تو اچھل ہی پڑا۔

''سوچا تھا، بہت سوچا۔'' عادل نے عینک اتار کر میز پر رکھی اور گہری سانس لی۔

''مگر فیصلہ یہی ہوا کہ یہ سب بے کار ہے۔ کوئی کسی کی جگہ نہیں لے سکتا۔ نہ کسی کی کمی، کسی کا خلاء پورا کر سکتا ہے اور پھر میرے پاس کسی کو دینے کے لیے ہے بھی تو نہیں۔ سب کچھ تو تمہاری ماں اپنے ساتھ لے گئی۔''

''آپ بھی وہی قنوطی باتیں سوچتے ہیں، آپ کو شاید علم نہیں، آپ کتنے بجھ کر رہ گئے ہیں۔ اتنے خاموش تو آپ کبھی نہیں تھے، قدرت کی دی ہوئی وقتی تنہائی کو اپنے لیے مستقل کیوں کر رہے ہیں آپ۔''

''تم لوگوں کے ہوتے ہوئے میں تنہا کیسے ہو سکتا ہوں۔''

''بابا! بے ایمانی مت کریں۔'' ذہاب زچ ہو گیا۔

''وہ تو زندگی نے کر ہی لی۔'' عادل احسن کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر مسکرائے۔

''ذہاب!'' دروازہ کھول کر اہل اندر داخل ہوئی۔

''دو گھنٹے پہلے بتایا تھا کہ ثانیہ کے پیپر ختم ہو گئے ہیں۔''

''جا رہا ہوں۔'' ذہاب کسل مندی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

نہا کر آج اس نے نیا جوڑا پہنا تھا۔ کاسنی اور گلابی رنگوں کا امتزاج، نفیس کڑھائی نظروں کو بھلی لگ رہی تھی۔ ڈرائر سے بال خشک کر کے ایسے ہی چھوڑ دیئے۔ جلدی جلدی میک اپ کر کے بال سنوارے اور جیولری پہننے لگی۔ آج ان کی شادی کی سالگرہ تھی۔ دونوں نے مل کر باہر سیلیبریٹ کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ ثانیہ کو کنول کے پاس چھوڑ کر دونوں اب اکثر باہر چلے جاتے تھے۔

شوخ رنگ کی لپ اسٹک لگا کر امل نے اپنے گداز لبوں کا جائزہ لیا اور پھر اپنے سراپا کا۔ آئینہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت خوب صورت لگ رہی ہے۔ تیار ہو کر انتظار کرنا بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ امل کو بھی گزرتا ہر ہر پل بہت بھاری لگ رہا تھا۔ ذہاب نے فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ نکل چکا ہے اور آدھ گھنٹے بعد گھر پر ہوگا۔

ثانیہ بھی تیار تھی۔ دودھ پی کر سو چکی تھی۔ اس کے کپڑے اور ضروری اشیاء امل نے ایک چھوٹے سے بیگ میں رکھ لی تھیں۔ بیٹھ بیٹھ کر، ٹہل ٹہل کر تھک گئی تو موبائل اٹھا لیا۔ ذہاب کو کال کی، مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔

امل نے وقت دیکھا، ذہاب نے گھر پہنچنے کا جو وقت بتایا تھا۔ اس سے آدھ گھنٹہ اوپر ہو چکا تھا۔ وہ پھر نمبر ٹرائی کرنے لگی، چند بار کی کوششوں کے بعد بالآخر رابطہ ہو ہی گیا مگر فون اٹینڈ کرنے والی آواز اجنبی تھی۔

''بی بی آپ نے جس نمبر پہ فون کیا ہے، یہ صاحب آپ کے کون ہیں؟''

''میرے ہزبینڈ ہیں۔'' سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں خدشات نے آ کر دماغ میں جگہ بنائی تھی۔

''مجھے افسوس ہے محترمہ! میرے پاس ایک بری خبر ہے آپ کے لیے۔''

آواز گھمبیر اور سنجیدہ تھی۔ ثانیہ کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔

☆☆☆

رسٹ واچ، والٹ، اس میں رکھے شناختی کارڈ سمیت دیگر اشیاء اور رقم، سن گلاسز...... عادل احسن کے سامنے جو چیزیں تھیں وہ فوراً پہچان گئے تھے۔ انہوں نے ڈوبتی سانسوں کے ساتھ شناخت کر لی تھی مگر اس لمحے نے تو ان کی روح نکال دی تھی جب سفید چادر سرکا کر انہیں چہرہ دکھایا گیا اور چہرہ بھی کہاں تھا، فقط پٹیاں تھیں جس نے چہرے کو ڈھانپا ہوا تھا۔

ڈمپر کے پہیوں نے اس بری طرح کچلا تھا کہ چہرہ سمیت جسم کئی جگہ سے بری طرح مسخ ہو گیا تھا۔

عادل کی سماعتیں مختلف آوازیں سن رہی تھیں۔ ڈاکٹرز کی، پولیس کی اور اپنے ساتھ موجود اپنے دوست اور پڑوسی صالح صاحب کی۔ جن کے ساتھ وہ یہاں آئے تھے اور جو مستقل ان کا ہاتھ تھامے سہارا دے رہے تھے۔ ان ہی آوازوں میں امل کی چیخیں بھی شامل ہو گئیں، جسے صالح صاحب کی بیوی سنبھال رہی تھیں۔ ثانیہ کو انہوں نے گھر پر اپنی بہو کے پاس چھوڑ دیا تھا۔

لٹے پٹے گھر واپس آئے تو حالت مُردوں سے بھی بدتر تھی۔ آن کی آن میں گھر بھر گیا، پہلے محلے داروں سے اور پھر رشتے داروں سے، دوست احباب سے۔ اس ناگہانی پر سب ہی غم زدہ تھے۔

''عادل بھائی کا تو گھر ہی اجڑ گیا۔ پہلے بیوی، اب اکلوتا بیٹا...... خدا جانے کس کی نظر کھا گئی اتنے ہنستے بستے گھر کو۔''

''بے چاری امل چہرے کے ساتھ نصیب بھی ماں پر چلا گیا۔'' کسی نے آہ بھری۔

قدرت بڑی بے رحم ہوتی ہے، دنیا و مافیہا سے بے خبر ماں کی آغوش میں کمسنی امل کو سب ہمدردی و ترس کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کنول کا دل صدمے سے پھٹ ہی گیا تھا۔ مہر بہ لب ساکت نگاہیں ایک ہی جگہ مرکوز تھیں۔ جس بیٹی پر کبھی کسی دکھ کا ہلکا سا سایہ بھی نہیں پڑنے دیا تھا، آج اس کی ساری خوشیاں، آنکھوں سے نکلتے آنسوؤں کے ساتھ بہہ گئی تھیں۔

رات جیسے جیسے گزر رہی تھی، اس کی سیاہی امل کے بخت میں شامل ہوتی جا رہی تھی۔

''اور کیا ضروری تھا کہ میرا نصیب میری بیٹی کے مقدر میں بھی رقم کیا جاتا؟ کیا یہ کہانی پھر سے دہرائی جائے گی؟'' زندگی میں پہلی بار کنول کا دل اپنے رب سے شکوہ کناں تھا، اپنے لیے نہیں، اپنی بیٹی کے لیے اور اولاد کو آزمائش قرار دیا گیا ہے کہ جس کے لیے انسان اپنے خالق کی نافرمانی بھی کر لیتا ہے اور اس سے شکوے شکایات بھی۔

لوگ صبر کی تلقین کر رہے تھے اور کنول سوچ رہی تھی کہ ان جلتے ہوئے راستوں پہ امل کیسے چل سکے گی جس پر قدم رکھتے ہی آبلے پڑ جاتے ہیں۔

اس ظالم اور طویل رات کی سحر بھی ہو ہی گئی۔ پو پھٹ رہی تھی جب وہ اندر داخل ہوا، سب سے پہلے تو گیٹ کھلا دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اندر قدم رکھا تو حیرانی دو چند ہو گئی۔ ڈرائنگ روم میں، لاؤنج میں آڑے ترچھے پورے رات کے جاگے لوگ اب محو خواب ہوئے تھے۔ سارے قریبی رشتے دار بیک وقت؟

"الٰہی خیر۔" کسی انہونی کے خوف سے اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اپنے بیڈ روم کی سمت جانے سے پہلے وہ اسٹڈی کی طرف بڑھا۔ آہستہ سے دروازہ کھولا۔

"اور کھلی آنکھوں سے اب یہ مجھے ہر جگہ، ہر وقت نظر آئے گا۔" اپنی سرخ اور جلتی ہوئی آنکھوں کو عادل احسن نے بے دردی سے مسلا۔

"بابا!" ذہاب دھیرے سے آگے بولا۔

"کک......کون......" نیم ملگجے اندھیرے میں آگے بڑھتا ہوا ہیولا اور اس کی آواز۔

"کیا تصور اتنا طاقتور اتنا واضح ہوتا ہے؟" وہ بے اختیار اپنی کرسی سے کھڑے ہو گئے۔

ہیولا چلتا ہوا ان کے قریب آ گیا۔ وہ اب واضح طور پر اسے دیکھ رہے تھے۔ سر پر بندھی ہوئی پٹی چہرے پر لگے خراشوں کے نشانات۔

"آپ ٹھیک تو ہیں نا بابا! اور امل اور ثانیہ، سب خیریت تو ہے نا۔ گھر میں اتنے سارے مہمان کیسے ہیں؟" ذہاب ان کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا اور عادل کی بے یقین آنکھوں اور مردہ وجود میں جیسے کسی نے روح پھونک دی۔

"تم زندہ ہو......ذہاب......تم زندہ ہو؟" اس کے چہرے کا ایک ایک نقش چھو کر عادل نے پہلے سوال کیا تھا پھر شاید خود کو بتایا تھا اور پھر بیٹے کو گلے لگا کر ان کے باقی ماندہ آنسو بھی بہہ نکلے۔ ذہاب نے اپنی پوری زندگی میں دوسری بار باپ کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔ ثانیہ کی موت پر جو وہ آنسو غم کے تھے اور آج جو آنسو اس کے سامنے بہہ رہے تھے وہ خوشی کے تھے۔

"کیا ہوا ہے بابا! مجھے بتائیں۔" عادل کے سامنے کرسی گھسیٹ کر وہ بیٹھ گیا اور ان کے ہاتھ تھام لیے۔

عادل کی بات مکمل ہوئی تو ذہاب نے ایک گہری سانس لی۔ کچھ دیر خاموش رہا پھر کہنے لگا۔

"کل مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی، ریش ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ایک موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی درخت سے جا ٹکرائی۔ آپ ہمیشہ مجھے تاکید کرتے ہیں نا سیٹ بیلٹ باندھنے کی اور میں کبھی پروا نہیں کرتا تھا۔ کل اس لا پروائی کا نتیجہ دیکھ لیا۔" ذہاب کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "اتنی زور سے سر اسٹیئرنگ پر لگا کہ کچھ دیر کے لیے تو میں اردگرد سے بے خبر ہی ہو گیا۔ ذرا ہوش آیا تو کوئی مہربان مجھے گاڑی سے نکال رہا تھا، اس نے مجھے موٹر سائیکل پر بٹھایا اور اسی مہربان نے کچھ آگے جا کر مجھے اپنی بائیک سے اتارا۔ میری گھڑی، گلے میں اٹکے گلاسز اور جیب میں رکھا والٹ، موبائل ساری چیزیں بڑے آرام سے نکالیں اور رفو چکر ہو گیا۔ مجھ میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ ہاتھ پیر ہی ہلا لیتا۔ بری طرح چکر آ رہے تھے۔ سر سے خون بہہ رہا تھا۔ میں چکرا کر گر پڑا، ہوش آیا تو ہاسپٹل میں تھا۔ ایک وارڈ بوائے کے موبائل سے آپ کے اور امل کو باری باری فون کیا مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔ سگنلز کا مسئلہ تھا اور رات میں مجھے جو میڈیسن دی اسے کھا کر نیند آ گئی۔ صبح جیسے ہی آنکھ کھلی، بیڈ سے اتر کر سیدھا گھر کی طرف بھاگا۔ مجھے اندازہ تھا کہ آپ لوگ کتنے پریشان ہوں گے مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ......"

"اوہ......" اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا اور پھر کراہ کر بھی رہ گیا۔

"کیا ہوا؟"

"رکشے والا باہر کھڑا ہے، اسے کرایہ دینا ہے۔"

"میں دے آتا ہوں۔ تم امل کے پاس

جاؤ...... وہ تو......" عادل کچھ کہتے کہتے رک گئے اور پھر اسٹڈی سے باہر نکل گئے۔

بیڈروم کا دروازہ کھول کر ذہاب اندر داخل ہوا تو کنول نماز پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی۔ امل بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ ثانیہ اپنے کاٹ میں سو رہی تھی، وہ دبے پاؤں امل کے قریب پہنچا اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"امل!" اس نے دھیرے سے اس کا رخسار چھوا۔

امل نے بری طرح چونک کر آنکھیں کھولی تھیں اور ذہاب کو اپنے قریب بیٹھا دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"اصلی ہوں، بھوت نہیں ہوں۔" ذہاب نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"تم......" امل اب تک آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

"معمولی سا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ ساری رات ہاسپٹل میں رہا۔"

"اور وہ...... جس کے پاس تمہارا موبائل اور چیزیں تھیں؟ ہم سب یہی سمجھے کہ وہ تم ہو۔" امل اٹک اٹک کر بولی۔

"وہ میری چیزیں چھین کر بھاگا تھا۔ کل رات اس کی قضا آئی تھی۔"

"تم نے تو کل رات ہمیں مار ہی ڈالا ذہاب!" امل کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب بہہ نکلا۔ اپنے بازو پہ اس کا سر سہلاتے ہوئے ذہاب کنول کی جانب دیکھ کر مسکرایا۔ جو ششدر کھڑی تھی۔

اجالا پھیلتے پھیلتے گھر ایک بار پھر لوگوں سے بھر گیا مگر اس بار لوگ افسوس کے لیے نہیں بلکہ مبارک باد دینے اور خوشی کا اظہار کرنے آرہے تھے۔ آنسوؤں کی جگہ مسکراہٹ نے لے لی تھی۔

عادل اسٹڈی میں اور کنول بیڈ روم میں خدا کے آگے سربسجود تھے۔ دونوں نے کل رات اپنے بچوں کے لیے کسی معجزے کی، کسی انہونی کی دعا اور التجا کی تھی۔ دعاؤں کو قبولیت کا درجہ مل گیا تھا، سجدہ شکر تو واجب تھا۔

☆☆☆

"آئی ایم سوری یار! یہ ڈنر ایک ہفتہ لیٹ ہو گیا۔" اگلے ہفتے کینڈل لائٹ ڈنر کرتے ہوئے ذہاب نے کہا۔

"ہوں۔" پچھلے ہفتے ہونے والے حادثے کے بعد سے امل بہت خاموش خاموش سی رہنے لگی تھی۔

"ویسے مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم مجھ سے اتنی محبت کرتی ہو۔" ذہاب نے اسے بولنے پر اکسایا۔

"بہت سی باتیں مجھے بھی معلوم نہیں تھیں۔ اب ٹھیک سے اندازہ ہو رہا ہے۔" امل سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"کیسی باتیں؟" ذہاب نے مچھلی کا ٹکڑا کانٹے میں پھنسایا۔ اسے سی فوڈ پسند تھا۔

"ہیں کچھ ایسی باتیں، جن کی معنویت اور گہرائی مجھ پر اب واضح ہوئی ہے۔" امل نے ایک گہری سانس لی۔

"یہ تو اچھی خبر ہے کہ میری بیگم پڑھ بجھ دار ہوئی ہیں۔" ذہاب نے امل کی پسند کا گرم گرم سیخ کباب اس کی پلیٹ میں منتقل کیا۔

"باتوں کے ساتھ کھانا بھی ضروری ہے۔" بریانی کا لقمہ لیتے ہوئے اس نے لقمہ دیا۔

"مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے، اب ازالہ کرنا بھی چاہوں تو بہت دیر ہو چکی ہے۔" امل خود کلامی کر رہی تھی۔

"دراصل بات یہ ہے کہ بھوکے پیٹ مجھے فلسفہ ہضم ہوتا ہے، نہ برداشت۔ ذرا کھانا کھالوں پھر سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں، آخر تم کہنا کیا چاہ رہی ہو۔"

"کبھی سیریس بھی ہو جایا کرو۔" امل نے شوہر نامدار کو گھورا۔

"کوئی ایسی ملے بھی تو......" ذہاب نے فقرہ ادھورا ہی چھوڑ دیا کہ امل کھانے کے بجائے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔

☆☆☆

رات کو وہ گھر پر ہی رک گئی تھی۔ اس نے ذہاب کو پہلے ہی بتا دیا تھا۔ ڈنر کے بعد وہ اسے میکے چھوڑ کر واپس گھر چلا گیا۔ ثانیہ سو چکی تھی۔

''کافی لیں مما!'' امل نے ماں کی طرف کافی کا مگ بڑھایا۔

''مجھے کہہ دیتیں امل! میں بنا لیتی۔''

''کیوں، میں کوئی مہمان ہوں اور ویسے بھی اتنی معمولی سی خدمات تو کر سکتی ہوں آپ کی۔ پہلے ہی بہت زیادتی کر چکی ہوں آپ کے ساتھ۔'' امل کی آواز رندھ گئی۔

''امل!'' بیٹی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کنول حیران تھی اور وہ بھیگی ہوئی آواز میں بول رہی تھی۔

''وہ رات میری زندگی کی سب سے طویل، سب سے اذیت ناک رات تھی جب ہم سب نے سمجھا کہ ہم نے ذہاب کو کھو دیا۔ اپنی بیٹی کو سینے سے لگائے اس ایک رات میں وہ سب کچھ سوچ ڈالا جو شاید پوری زندگی میں بھی نہیں سوچ سکتی۔ خوف، مایوسی، ناامیدی، دکھ، درد یہ وہ تلخ ذائقہ چکھ لیا جس سے آج تک آپ نے مجھے دور رکھا تھا۔ آپ نے تو کبھی احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ ایسے کڑوے ذائقوں کی کتنی ہی طویل اور سیاہ راتیں اور مشکل دن آپ نے گزارے ہیں۔ مجھے اب اندازہ ہوا ہے مما! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کی فیلنگز کو، آپ کی زندگی کو، آپ کی مشکلات کو کبھی سمجھا ہی نہیں۔ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، الٹا آپ کی راہ میں حائل ہو گئی اگر میں رکاوٹ کی دیوار کھڑی نہیں کرتی تو آج آپ کی زندگی میں بھی آسودگی اور خوشی ہوتی۔'' امل بری طرح رو رو کر کہہ رہی تھی۔

''چپ ہو جاؤ امل! تمہارے رونے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ جانتی ہو نا۔'' کنول نے اپنی ہتھیلیوں سے اس کا چہرہ صاف کیا۔

''تم کم عمر تھیں، نادان تھیں۔ جو کچھ تمہارے ذہن میں بھرا گیا، تمہارے کچے دماغ نے سے قبول کر لیا اور وہ بعد میں پختہ ہو گیا۔ مجھے تم سے بلکہ کسی سے بھی کوئی شکایت نہیں ہے۔ شریک حیات سے محرومی کے بعد میں ان بہت ساری مشکلات، پریشانیوں اور الجھنوں سے محفوظ رہی جو عموماً ہمارے معاشرے میں بیوہ خواتین کو درپیش ہوتے ہیں۔ خود سے زیادہ مجھے تمہاری خوشیاں عزیز ہیں۔ وہ رات تمہارے لیے ہی نہیں، میرے لیے بھی بہت اذیت اور خوف سے بھری ہوئی تھی مگر اللہ نے بڑا کرم کیا۔ میں اس کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتی۔'' کنول نے ایک گہری سانس لی۔

''جو گزر گیا، سو گزر گیا۔ تم اتنا مت سوچو، اب ان پچھلی باتوں سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ٹھہراؤ اور اطمینان ہے زندگی میں۔ اللہ کی رحمت یہ بھی، چلو کافی پیو۔'' کنول نے مگ اس کی طرف بڑھایا اور خود بھی گھونٹ بھرنے لگی۔

☆☆☆

''ذہاب! کم سے کم تولیہ تو ٹھکانے پر رکھ دیا کرو۔ گیلا تولیہ بیڈ پر ڈال دیتے ہو۔'' امل بڑبڑاتے ہوئے تولیہ اٹھا کر ہینگر میں لٹکا رہی تھی۔ ''اور اپنے کپڑے بھی ڈھنگ سے رکھنا سیکھ لو، الماری میں جہاں دل چاہتا ہے رکھ دیتے ہو۔''

''اب اکیلے تم سے میرے کام نہیں ہوتے، ایک ہیلپر لے آؤں تمہارے لیے؟'' ذہاب نے موبائل کی ازحد مصروفیات سے آنکھ اٹھا کر ذرا بیوی کی طرف توجہ کی۔

''لے آؤ۔'' امل وارڈروب کے مختلف خانوں سے ذہاب کے کپڑے نکال رہی تھی۔

''سیلری والی یا نان نفقے والی؟'' ذہاب نے پھلجڑی چھوڑی۔

''نان نفقے والی؟ ایک تو سنبھالی نہیں جا رہی، دوسری کا بڑا شوق آ رہا ہے۔'' امل نے مجازی خدا کے انتہائے شوق پر دانت پیسے۔

''تم اپنی کہو، بڑی پراسرار ہوتی جا رہی ہو۔ جب دیکھو، میرے والد محترم کے پاس گھسی جانے کیا کیا پٹیاں پڑھاتی رہتی ہو۔'' ذہاب نے بڑی چابک

دتی سے موضوع بدلا۔
"تمہارے والد محترم میرے بھی کچھ لگتے ہیں۔ تم سے زیادہ ان کی فکر ہے مجھے۔"
"کیسی فکر؟" ذہاب کو سن گن تو تھی کہ وہ کون سے مشن پر مصروف عمل ہے پھر بھی بھولا سا منہ بنا کر پوچھنے لگا۔
"جب سورج نکلے گا تو ساری دنیا کو نظر آجائے گا۔" امل نے بڑی شان سے محاورے میں تبدیلی کی۔
"تو کب ہو رہا ہے سویرا؟" ذہاب کی نگاہیں پھر موبائل پر گڑ گئیں۔
"بس دیکھتے جاؤ۔"
"آہ...... تم دیکھنے ہی کہاں دیتی ہو کچھ۔" ذہاب کی رگ ظرافت پھر پھڑک اٹھی۔
"تم کبھی نہیں سدھرو گے۔ یہ تمہارے کپڑے ہیں، ان میں سے وہ سارے کپڑے الگ کر لو، جو سال میں ایک بار پہنتے ہو۔" امل نے حکم جاری کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں ابھی آرہی ہوں۔"
"دنیا کا سب سے بورنگ کام، میں ہرگز نہیں کروں گا۔" ذہاب کراہ اٹھا۔
"میرے آنے سے پہلے کر لینا۔" اس کا احتجاج سنی ان سنی کر کے امل چل دی۔
"اف، اچھا بھلا خوش باش آزاد انسان شادی کیوں کرتا ہے؟" بیوی کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ذہاب سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

بپھرے سمندر کی لہریں ایک کے بعد ایک آکر ساحل سے سر پٹخ رہی تھیں۔ نیلگوں سمندر اپنے چاندی جھاگوں کے ساتھ تاحد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ نظر جہاں تک کام کرتی، وہاں تک سمندر نظر آتا۔ اس کے بعد آسمان سے گلے ملتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ساحل کے ایک محفوظ مقام پر دو بڑے بڑے پتھروں پر بیٹھے دونوں نفوس خاموشی سے لہروں کا شور سن رہے تھے پھر ان میں سے ایک نے بولنا شروع کیا۔
"مجھے سمندر ہمیشہ سے ہی مسحور کرتا ہے، یہاں آکر وقت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ گھنٹوں بیٹھے رہو، اٹھنے کا دل نہیں کرتا۔ ثانیہ کو گہرے سمندر کی نسبت اونچے اونچے برف پوش پہاڑ پسند تھے۔ جن کا کراچی میں کوئی وجود نہیں، اسی لیے یہ شوق پورا کرنے کے لیے ہم ہر سال شمالی علاقہ جات کی طرف نکل جاتے تھے۔" عادل احسن ایک لمحے کو رک کر مسکرائے پھر کہنے لگے۔
"ہماری ارینج میرج تھی مگر شادی کے بعد ہمیشہ ایسا لگا جیسے ہماری لو میرج ہے اور ثانیہ کے بعد بہت عرصے تک ایسا لگا جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ہو مگر میں غلط تھا۔ زندگی کی جنگ ہمیں اپنی آخری سانس تک لڑنی ہوتی ہے۔ کتنا ہی بڑے سے بڑا حادثہ ہو جائے یا سانحہ ہو جائے، ہم خود کو ٹھہرا کر اور اپنی زندگی کو جمود کا شکار کر کے دراصل کفران نعمت کرتے ہیں۔ جو خوشیاں ہماری دسترس میں ہوں، ان سے منہ موڑنا اور جو دروازے ہم با آسانی کھول سکتے ہیں، انہیں مستقل بند رکھنا کفران نعمت نہیں تو اور کیا ہے؟ نئی نسل ہم سے زیادہ سمجھ دار اور ایکٹو ہے۔ ذہاب نے اور امل نے مجھے یہ بات سمجھائی اور میری سمجھ میں آگئی۔"
عادل نے گہری سانس لی، ایک نظر کنول کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں وہی سمندر نظر آرہا تھا جو وہ دیکھ رہی تھی۔
"محبت کا دعوا بہت بڑی بات ہے۔ میں یہ دعوا نہیں کر سکتا مگر قدر دانی، احساس اور مروت کا دعوا ضرور کر سکتا ہوں۔ اپنائیت اور انسیت کے سہارے بھی زیست کا سفر آسان ہو جاتا ہے۔"
عادل نے اپنی نگاہیں سمندر پر مرکوز کیں جہاں تلاطم برپا تھا۔ کنول کے دل کی طرح مگر انہیں یقین تھا کہ یہ تلاطم ٹھہراؤ اور سکون میں بدل جائے گا۔ اس کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔ وہ فیصلہ کن لمحے سے گزر رہی تھی۔ ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھے ذہاب اور امل کو بھی یقین تھا کہ یہاں تک ایک ساتھ آنے کے بعد اب آگے کا سفر دونوں اکٹھے ہی طے کریں گے کہ آدم و حوا کا ساتھ ان کی فطرت بھی ہے اور ضرورت بھی ہے۔

☆

عنذلیب زہرا



خوب صورتی اور ذہانت دونوں ہی خدا کی دین ہیں......لیکن...... یہ ایک ساتھ ہر کسی کو عطا نہیں ہوتیں۔

خوب صورت لوگ عقل سے عاری ہوتے ہیں (عمومی رائے)

ذہین لوگ رنگ روپ سے فارغ (خصوصی رائے)

لیکن سو میں سے کوئی دو تین ایسے ضرور ہوتے ہیں جنہیں خوب صورتی اور ذہانت دونوں ودیعت ہوتی ہیں۔

خوش بخت بھی ایسی خوش نصیب تھی۔

شکل تو چندے آفتاب، چندے ماہتاب ہی تھی لیکن ذہانت بھی اپنی مثال آپ تھی۔

ہر رنگ اس کے لیے بنا تھا۔

ہر لباس اس پر سج جاتا، جو فیشن کرتی، پسندیدہ قرار پاتا ذہانت اور حاضر جوابی میں اس کا ثانی نہیں تھا۔

ٹیچرز کی پسندیدہ......کتابوں کی شائق

اس نے ہمیشہ محبت وصول کی تھی۔ محبت تقسیم کی تھی۔ محفل میں اس کے آگے کسی کا چراغ نہ جلتا تھا۔

وہ اپنی خوب صورتی اور ذہانت سے آگاہ تھی۔ اور انہیں نکھارنے کے فن سے بھی آشنا...... سو دونوں کا استعمال بخوبی کرتی......

''خوش بخت! تم دلوں کی ملکہ ہو۔'' سہیلیاں اسے سراہتیں۔

خاندان، کالج، یونیورسٹی میں لڑکے اس کی توجہ کے متمنی رہتے تھے۔ لیکن حسین و ذہین خوش بخت کردار کی ہلکی نہ تھی نگاہ کی ٹیڑھی نہ تھی۔

''جب نعمتیں، عزت، محبت حلال اور جائز راستے سے مل رہی ہیں تو پیچیدگیاں کیوں پالی جائیں......'' یہ اس کا مؤقف تھا کوئی اسے مغرور سمجھتا...... کوئی بڈھی روح...... کوئی نخرے باز...... لیکن اس نے چنداں پروا نہ کی تھی۔ اسے اپنا پندار بہت عزیز تھا۔ ماں باپ کی نیک نامی بھی۔

لیکن کہیں اندر، بہت اندر یہ احساس بھی رہتا تھا کہ وہ جو بہت خاص ہے تو اس کے لیے خاص الخاص ہی ہونا چاہیے۔

''وہ کیسا ہونا چاہیے۔'' اس نے کسی کو نہ بتایا تھا۔

ان ہی دنوں وہ آ گیا جس کے سب منتظر تھے۔ وہ خود بھی......

ارمان گردیزی......

ہر لحاظ سے ہم پلہ۔

شکل صورت...... تعلیم...... خاندانی نجابت و شرافت۔

گویا کسی نے تراش کر بنایا ہو۔ بہت خاص...... کوئی کمی نہ تھی۔ ماں باپ نے ہر لحاظ سے مطمئن ہو کر ہاں کہہ دی تھی۔

خوشیوں کی بارات، خوش بخت کے آنگن میں اتر آئی تھی۔

ہر نگاہ میں رشک تھا۔

وہ فخر و انبساط سے سرشار تھی۔

''جوڑی مکمل ہے۔'' جب اسے اسٹیج پر بٹھایا گیا تو ہر زبان نے کہا۔

☆☆☆

خوش بخت، خوش تھی، جیون ساتھی ویسا ہی تھا،

جیسا اس نے سوچا...... اس کے تخیل نے تراشا اور خوابوں نے پیکر بنایا تھا۔

وہ منتظر تھی، اپنے بخت کی خوش قسمتی کی۔

وہ آیا...... لیکن ایک اجنبی کی طرح...... اور یہ اجنبیت ان کے درمیان ہمیشہ رہی...... نہ خوش بخت کی خوب صورتی متاثر کرتی...... نہ ذہانت اسیر کرتی...... خوش بخت نے کسی میدان میں شکست نہیں کھائی تھی...... لیکن اب؟

اس نے روایتی طریقے استعمال کیے...... غیر روایتی ہتھکنڈے بھی۔''

لیکن مقابل تو کوئی مجسمہ تھا...... جذبات و احساسات سے عاری...... خوش بخت کی خوشی کو گھن لگ گیا تھا۔ شوہر کی بے اعتنائی کا...... اس نے ہر حربہ آزمایا، لیکن دل تک رسائی آسان نہ تھی۔ وہاں قفل لگے تھے۔ اور دل کے دروازے اس کے لیے بند تھے۔ آخر ایک روز تھک کر وہ ٹوٹ کر گر پڑی......

اس بے مہر کے قدموں میں...... وہ جاننا چاہتی تھی کہ ارمان اتنا کٹھور کیوں ہے۔ حسین وطرح دار بیوی کے ہوتے ہوئے اتنا بے نیاز۔

وفادار اور سمجھ دار شریک سفر کے ہوتے ہوئے اس قدر لاتعلق، اس نے دوست رازدار بن کر اس کے دل کا راز معلوم کرنا چاہا۔ بیوی بن کر تو وہ اعتماد جیت نہ سکی تھی۔ محرم راز بن کر دل تک رسائی حاصل کر سکتی تھی ناں...... ہاں یہ بات زیادہ آسان تھی۔ اور اتنے عرصے میں پہلی بار ارمان گردیزی نے دل کی بات کھول دی۔

''وہ میری پہلی محبت ہے اور آخری بھی...... قسمت...... سماج...... آڑے آ گیا...... لیکن میرے دل پر وہ قابض ہے کسی ساحرہ کی طرح......'' آخر میں وہ بے بس ہو کر رو پڑا......

خوش بخت دل کی ٹیسیں دبائے سن رہی تھی، وہ اس ساحرہ سے ملنا چاہتی تھی۔ جس نے خوش بخت کا سحر چلنے نہ دیا تھا۔ اور بہت جلد اس کی آرزو پوری ہو گئی۔ اس نے ایک ریسٹورنٹ میں ارمان اور اس ساحرہ کو دیکھ لیا۔ وہ عام سی تھی۔ عام سے نین نقش...... معمولی شخصیت ایسی لڑکی جو کسی محفل میں ہو تو اس کی موجودگی کا علم بھی نہ ہو سکے کجا کہ زندگی میں......

خوش بخت ساکت تھی۔ اس کا حسن، ذہانت، مٹی کا ڈھیر بن چکے تھے۔

اس کے نصیب کو مات ہو چکی تھی۔ مقدر ہار چکا تھا۔

☆



قرۃ العین خرم ہاشمی

آواز کا ڈھول

''کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ زندگی میں یہ وقت بھی آئے گا۔''

سوجی آنکھوں اور زرد چہرے کے ساتھ اداس بیٹھی ثانیہ نے کہا۔ روشن اور ہوادار لاؤنج میں قالین پر رکھے دیدہ زیب کشن پر وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں کے سامنے چائے کے کپ اور کیک رسک رکھے ہوئے تھے۔

''کہہ تو ایسے رہی ہو جیسے زندگی کی پچاس بہاریں دیکھ لی ہوں۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے بمشکل اٹھائیس سال۔''

ذکیہ خالہ نے منہ بنا کر کہا اور مزے دار کیک چائے میں ڈبو کر کھانے لگیں۔

''لگتا تو ایسا ہی ہے، جیسے صدیوں کا بوجھ کندھے پر اٹھایا ہوا ہے۔'' ثانیہ نے مایوسی سے کہا۔

''مایوسی کا بوجھ بظاہر نظر نہیں آتا مگر اس کا وزن سب سے زیادہ بھاری ہوتا ہے۔''

ذکیہ خالہ نے چائے ختم کر کے اللہ کا شکر ادا کیا۔

''ذکیہ خالہ! مجھے وقار سے اس رویے کی امید نہیں تھی۔''

ثانیہ سسک پڑی۔ ذکیہ خالہ کا دل دکھ سے بھر گیا۔

''غصہ اسی لیے تو حرام ہے کہ انسان کی عقل کو سلب کر دیتا ہے۔''

ذکیہ خالہ نے ہمدردی سے کہا۔

''میں جب سوچتی ہوں کہ وقار نے مجھ پر شک کیا تو دل کرتا ہے کہ......''

ثانیہ غصے سے کہتے ہوئے رک گئی۔

''بے وقوف لڑکی! جذبات میں کچھ الٹا سیدھا مت سوچو۔''

ذکیہ خالہ نے سختی سے کہا تو ثانیہ منہ بسور کر رہ گئی۔

''فی الحال تو یہ سوچنا ہے کہ نوبت یہاں تک کیسے پہنچی ہے؟'' ذکیہ خالہ نے پرسوچ انداز میں کہا۔

اسی وقت اندر والے کمرے سے تین سالہ حمزہ کے رونے کی آواز آئی تو ثانیہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ ذکیہ خالہ نے ایک نظر سارے گھر پر ڈالی۔ گھر بلاشبہ بہت صاف ستھرا اور خوبصورت تھا۔ اوپر والا پورشن انھوں نے رینٹ پر لیا ہوا تھا۔ نیچے مالک مکان رہتے تھے۔

ذکیہ خالہ کی نظر لاؤنج کے ساتھ ملحق امریکن اسٹائل اوپن کچن پر پڑی۔ جو خوبصورتی اور نفاست سے سجا ہوا تھا۔ کچن کی کھڑکی سے آنے والی ٹھنڈی ہوا اور روشنی نے لاؤنج کا ماحول پرسکون بنا دیا تھا۔

''یہ بھی اچھا طریقہ ہے کہ کچن میں کام کرتے ہوئے لاؤنج پر بھی پوری نظر رکھی جائے۔''

ذکیہ خالہ نے جدید انداز کی اس سہولت کو سراہا تھا۔ ثانیہ اکثر کچن میں کھڑے ہو کر ان سے باتیں کرتی رہتی۔ اس طرح باتوں کے ساتھ ساتھ کام بھی ہو جاتا تھا۔

ذکیہ خالہ کو یہاں آئے تین دن ہو گئے تھے اور وہ ان تین دنوں میں چکرا کر رہ گئی تھیں۔ معاملہ

بالکل ایسی شکل اختیار کر گیا تھا، جیسے غلطی سے بلا ارادہ کسی نے ریشمی دھاگے کو الجھا دیا ہو۔ ذکیہ خالہ اتنا تو جان گئی تھیں کہ بات اتنی بڑی نہیں ہے جتنی بن چکی ہے مگر انھیں غلط فہمی کے الجھے دھاگے کا وہ سرا نہیں مل رہا تھا جو اس الجھن کو سلجھا سکتا تھا۔ وہ باریک بینی سے ساری صورتحال کا پھر سے جائزہ لینے لگیں۔

☆☆☆

ثانیہ اور وقار کی شادی ارینج میرج تھی۔ وقار کا واحد رشتہ ذکیہ خالہ ہی تھیں۔ جنہوں نے بہت ارمان سے اس کی شادی کی۔ شادی کے بعد وقار نے اپنے آفس کے قریب ایک اچھی سوسائٹی میں اوپر والا پورشن کرائے پر لیا اور ثانیہ کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگا۔ ان کی پانچ سالہ ازدواجی زندگی میں چھوٹی موٹی تو بے شمار لڑائیاں ہوئیں مگر کبھی اتنی سنجیدہ ناراضی ان کے درمیان نہیں ہوئی تھی۔ ان دونوں کی



لڑائی میں اکلوتا بیٹا بھی نظر انداز ہو رہا تھا۔ وقار کی مسلسل ناراضی اور غصہ دیکھ کر ثانیہ نے ذکیہ خالہ کو فون کر کے بلالیا اور ان کے سامنے سارا معاملہ رکھا۔

ذکیہ خالہ نے ثانیہ کی بات سننے کے بعد، وقار سے اکیلے میں تفصیلی بات کی اور ہکا بکا رہ گئیں۔ وقار منفی سوچ کی انتہا پر کھڑا تھا۔ ذکیہ خالہ کے دل کو دھڑکا لاحق ہو گیا کہ کہیں ان کے پیارے بھانجے کا گھر نہ ٹوٹ جائے۔ انھوں نے اپنی قسم دے کر وقار کے غصے کے آگے بند تو باندھے تھے مگر آخر کب تک......

جوان خون میں اٹھتا طوفان، اس بپھرے ہوئے پانی کی طرح ہوتا ہے جو اپنی راہ میں آئی ہر چیز کو تہس نہس کر دیتا ہے۔

☆☆☆

"مجھے لگتا ہے کہ یہ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے یہ ڈرامہ کر رہے ہیں۔"

رات کے کھانے کے بعد وہ تینوں لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے جب ثانیہ نے رندھے لہجے میں کہا۔ وقار نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کا اچھا طریقہ ہے۔"

وقار نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔" ثانیہ نے غصے سے کہا۔

"میں پاگل نظر آتا ہوں؟" وقار نے بھی غصے سے کہا۔

"تم دونوں پھر بحث کر رہے ہو بجائے معاملے کو حل کرنے کے۔"

ذکیہ خالہ نے پریشانی سے کہا۔

"معاملہ کیسے حل ہوگا؟ میں تو صرف اپنے بچے کی وجہ سے چپ ہوں، نہیں تو......"

وقار نے سخت لہجے میں کہا۔ ثانیہ خوف سے کانپ گئی۔

"خدا کے قہر سے ڈریں وقار! ایک شریف عورت پر الزام لگا رہے ہیں۔"

ثانیہ نے تھک کر کہا۔ وقار کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"تم مجھے خدا کے قہر سے ڈرا رہی ہو؟ کیا تمہیں خدا کا خوف نہیں آیا۔ جب ایک نامحرم مرد سے گھر کی باتیں شیئر کرتی تھیں۔"

وقار نے چلا کر کہا۔

"میں اپنے بچے کی قسم کھاتی ہوں میں نواب کو نہیں جانتی ہوں اور نہ کبھی ان سے ملی۔"

ثانیہ نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ بچے کی قسم پر وقار چپ کر گیا۔

"پھر نواب کو گھر کی باتیں کیسے پتا چلتی ہیں؟ اس گھر میں ہم دونوں کے علاوہ تیسرا ہمارا بیٹا ہے۔ اگر میں نواب سے کوئی بات نہیں کرتا تو اور کون ہے؟" وقار نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"دیکھو وقار بیٹا! تمہاری بات میں وزن ہے مگر ثانیہ بھی جھوٹ نہیں بول رہی۔ تھوڑا تحمل سے غور کرو۔ بعض دفعہ آنکھوں کے سامنے کی چیز نظر نہیں آتی۔"

ذکیہ خالہ نے نرمی سے سمجھایا مگر انھیں خود کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس مسئلے کو کیسے حل کریں۔

"ذکیہ خالہ! پتا نہیں مجھے کس چیز نے روکا ہو ہے۔ نہیں تو......"

وقار غصے سے اٹھ کر چلا گیا۔ ثانیہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ ذکیہ خالہ بے بسی سے اسے روتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

وقار نے جب اس محلے میں گھر لیا تو اس کا پہلا سامنا پڑوس میں رہنے والے نواب سے ہوا، جو کسی دوسرے شہر سے کام کے سلسلے میں یہاں اپنے رشتے داروں کے گھر مقیم تھا۔ پکی عمر، چھوٹے قد کا چالاک و عیار نواب وقار کو پہلی نظر میں بہت برا لگا۔ بہت جلد وقار کو پتا چل گیا تھا کہ نواب کی ساکھ محلے میں

اچھی نہیں ہے۔ وہ ہر وقت اپنے ٹیرس پر کھڑا فون کان سے لگائے باتیں کرتے ہوئے قہقہے لگاتا رہتا تھا۔ اس کے عاشقی و معاشقی کے بہت سے فسانے وقار نے سنے۔

وقار نے ثانیہ کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ ٹیرس پر بہت احتیاط سے اور دیکھ بھال کر جایا کرے۔ نواب کا سامنا کرنے سے ہر ممکن گریز کرے کیونکہ دونوں گھروں کے ٹیرس ساتھ ساتھ تھے۔ بلکہ نواب کے گھر کا ٹیرس تھوڑا اونچا تھا اور ان کے پورشن کا نیچے۔ جس کی وجہ سے وہ بہت آرام سے ان کے گھر میں تانک جھانک کر سکتا تھا۔ یہ گھر لیتے وقت وقار کو اس خامی کا پتا نہیں چلا مگر اب یہاں رہنا اس کی مجبوری تھی۔

وقار صبح کا گیا، شام ڈھلے گھر آتا تھا۔ وہ ایک مطمئن اور خوش گوار زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی پر سکون زندگی میں اچانک تلاطم اٹھنے لگے۔

''وقار بھائی! حمزہ کیسا ہے؟'' ایک دن راستے میں نواب ملا تو سلام دعا کے بعد پوچھنے لگا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' وقار نے حیرانی سے جواب دیا۔

''اچھا کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتایئے گا۔''

نواب نے کہا تو وقار نے سر ہلا دیا۔ گھر آکر وقار نے ثانیہ سے پوچھا کہ کیا نواب سے اس کا آمنا سامنا ہوا تھا؟ ثانیہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''اچھا! وہ حمزہ کی چوٹ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔''

وقار نے حیرت سے کہا۔ کل کھیلتے ہوئے حمزہ گر گیا تو اس کے سر پر چوٹ لگ گئی تھی۔

''ہوسکتا ہے، ساتھ والی آنٹی یا انکل نے بتا دیا ہو یا جب آپ حمزہ کو پٹی کروانے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تب اس نے دیکھ لیا ہو۔''

ثانیہ نے مصروف انداز میں جواب دیا۔ تو وقار نے سر ہلا دیا۔ بات آئی گئی ہوگئی مگر اب اکثر ایسا ہونے لگا کہ جب بھی نواب ملتا، وہ وقار سے ضرور کوئی نہ کوئی گھر کی ذاتی بات پوچھ لیتا۔ پہلے پہل وقار کو یہ سب اپنا وہم لگا مگر بہت جلد اس کے دل میں شک کا ناگ پھن پھیلا بیٹھ گیا۔ وہ ثانیہ سے بھی بات کرنے میں محتاط ہوگیا۔

وقار ثانیہ پر غیر محسوس انداز میں نظر رکھنے لگا۔ ثانیہ اپنی دنیا میں مگن تھی۔ اس نے وقار کے بدلے ہوئے تیور محسوس ہی نہیں کیے۔ وقار نے شک کی نظر سے دیکھنے کے باوجود ثانیہ میں کوئی خرابی نہیں دیکھی تھی۔

☆☆☆

ایک شام جب وقار گھر واپس آیا تو ثانیہ اور حمزہ کو گھر کے اندر نہ دیکھ کر چونک گیا۔ کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا پھر دبے قدم چلتا ٹیرس پر آگیا۔ اس کا اندازہ

درست تھا۔ اس نے کھلے دروازے کے کونے میں کھڑے ہو کر سامنے دیکھا۔ ثانیہ اور حمزہ ٹیرس پر موجود تھے۔ ثانیہ نے حمزہ کو گود میں اٹھایا ہوا تھا اور اس کا رخ ساتھ والوں کے گھر کی طرف تھا۔ جہاں نواب کھڑا مسکرا رہا تھا۔

نواب نے ہاتھ بڑھا کر کوئی چیز ثانیہ کی طرف بڑھائی جسے تھوڑا سا آگے جھک کر ثانیہ نے پکڑ لیا۔ ثانیہ تیزی سے مڑی، جب ٹیرس کے دروازے کے پاس وقار کو سرخ چہرے کے ساتھ کھڑا دیکھ کر چونک گئی۔ پہلی بار اس کے دل میں خوف کی لہر پیدا ہوئی تھی۔

''وقار آپ...؟''

ثانیہ نے خود پر قابو پاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا اور جلدی سے اندر آ گئی۔ وقار نے اتنے زور کی آواز کے ساتھ ٹیرس کا دروازہ بند کیا ثانیہ ڈر گئی۔ حمزہ نے باپ کی طرف ہاتھ بڑھائے مگر وقار نے اسے گود میں نہیں اٹھایا۔

''میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ نواب سے بات مت کیا کرو۔'' وقار نے دانت پیس کر کہا۔

''میں کب بات کرتی ہوں؟'' ثانیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں، تم تو ملاقات کرتی ہو۔'' وقار نے نفرت سے کہا۔

''وقار! آپ سوچ سمجھ کر بولیں۔'' ثانیہ کو غصہ آ گیا۔

''اچھا تم جو چاہے کرتی رہو۔'' دونوں بولتے ہوئے لاؤنج سے اب اپنے کمرے میں آ گئے تھے۔ ثانیہ نے حمزہ کو گود سے اتار کر بیڈ پر بٹھایا۔

''میں نے کیا کیا ہے؟'' ثانیہ نے تنک کر سوال کیا۔

''نواب سے کیا بات کر رہی تھیں؟'' وقار کی سوئی ایک جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

''آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں کسی سے بات نہیں کر رہی تھی۔ حمزہ نے کھیلتے ہوئے اپنی گیند ان کے ٹیرس پر پھینک دی تھی۔ نواب بھائی وہ ہی پکڑا رہے تھے۔'' ثانیہ نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا مگر اسے وقار کی بدگمانی نے شدید تکلیف پہنچائی تھی۔

''اچھا بہانا ہے۔ چلو آج تو گیند پکڑانے کا بہانا کر لیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ ہمارے گھر کی اکثر باتیں نواب کو کیسے پتا ہوتی ہیں؟''

وقار اپنی بات پر قائم تھا۔

''مجھے کیا پتا؟'' ثانیہ نے حیرت سے کہا۔

''تمہیں سب پتا ہے۔ مجھے بے وقوف مت بناؤ۔'' وقار نے دبی آواز میں غصے سے کہا۔

''وقار! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔''

ثانیہ کی ٹانگیں جیسے بے جان ہو گئیں اور وہ روتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئی۔ ایک لمحے کے لیے وقار کو پچھتاوا ہوا تو وہ خود پر قابو پاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ رات ان دونوں نے الگ الگ کمروں میں گزاری۔ ثانیہ ساری رات روتی رہی۔ دو دن ایسے ہی گزر گئے تو ثانیہ نے ذکیہ خالہ کو فون کر کے بلا لیا۔ ان کے آتے ہی سارا معاملہ سامنے رکھتے ہوئے انصاف مانگا۔ ذکیہ خالہ یہاں آ کر چکرا کر رہ گئیں۔ ان کی تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ کسی کے حق میں فیصلہ کیا دیتیں۔

☆☆☆

''ایک بات کہوں؟''

ثانیہ ہینڈ فری کان سے لگائے کچن میں کام کر رہی تھی۔ اس کی عادت تھی کہ کچن میں کام کرتے ہوئے اپنی بہن کو کال ملا لیتی۔ جو اس وقت فری ہوتی اور دونوں بہنیں سارے دن کی روداد ایک دوسرے کو آرام سے سنا لیتی تھیں۔ ثانیہ اور فائقہ دو ہی بہنیں تھیں۔ دونوں میں کمال کی ذہنی ہم آہنگی اور دوستی تھی۔ حمزہ کے ساتھ لاؤنج کے صوفے پر بیٹھے ذکیہ خالہ نے ایک سرسری نظر فون پر باتیں کرتی ثانیہ پر

ڈالی تھی۔

"مجھے لگتا ہے کہ کسی نے تمہارے گھر پر جادو کروادیا ہے۔"

فائقہ نے کہا تو ثانیہ چونک گئی۔

"جادو؟" ثانیہ نے دہرایا تو ذکیہ خالہ بھی چونک گئیں۔

"ہاں! حسد کرنے والوں کی کمی تو نہیں ہے۔ تم ایسا کرو کہ کسی سے دم کروالو یا۔"

فائقہ چھوٹی بہن کو سمجھانے لگی۔ ثانیہ پرسوچ انداز میں سر ہلانے لگی۔

"آج کل کوئی کسی کو خوش اور ہنستا بستا نہیں دیکھ سکتا ـــــ خاص کر میاں بیوی کو خوش دیکھ کر لوگ جلن سے مر جاتے ہیں۔"

فائقہ نے کہا تو ثانیہ ڈر گئی۔

"اچھا، میں ذکیہ خالہ سے بات کرتی ہوں۔"

ثانیہ نے مدھم آواز میں کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

"باجی! میں کہہ رہی ہوں اگر آپ نے رضیہ سے صفائی کروائی تو میں آپ کے کپڑے دھونا چھوڑ دوں گی۔"

سلمٰی نے اس طرح لاڈ سے کہا کہ ذکیہ خالہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"سلمٰی! ایک بات تو بتاؤ۔ ہم نے تم سے کام کروانا ہے کہ تمہارے گھر کے مسئلے حل کرنے ہیں۔"

ذکیہ خالہ نے منہ بنا کر کہا تو سلمٰی چائے پینے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"خالہ جی! رضیہ میری نند ہے مگر بہت ظالم ہے۔ وہ مجھے گھر میں سکون سے نہیں رہنے دیتی تھی۔ جب سے میں الگ ہوئی ہوں۔ سکون سے رہ رہی ہوں۔ اس لیے جہاں رضیہ کام کرتی ہے۔ وہاں میں کام نہیں کرتی۔"

سلمٰی نے فخریہ انداز میں کہا۔

"خیر، یہ تمہارے گھر کے مسئلے ہیں۔"

ثانیہ نے بیزاری سے کہا تو سلمٰی بڑبڑاتی ہوئی سلام کر کے چلی گئی۔ وہ ساتھ والوں کے گھر بھی کام کرتی تھی۔

"توبہ ہے۔ بہت تیز ہے۔" ذکیہ خالہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"آج کل سادہ کون ہے۔" ثانیہ نے بے دلی سے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وقار سے ناراضی کے بعد سے وہ مرجھا کر رہ گئی تھی

☆☆☆

"ثانیہ! بیسن کہاں رکھا ہے؟"

کچن سے ذکیہ خالہ کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ ثانیہ نے کچن میں آ کر ان کی سب مطلوبہ چیزیں انھیں نکال دیں۔ آج ذکیہ خالہ کڑھی پکوڑا بنا رہی تھیں۔ ذکیہ خالہ کی پوری کوشش تھی کہ دوپہر کے کھانے تک کڑھی تیار کر لیں تاکہ سب مل کر کھانا کھا لیں۔ آج وقار نے آفس سے چھٹی کی تھی۔ اس کی بڑھی شیو اور آنکھوں کے گرد حلقے واضح تھے۔ ذکیہ خالہ آج کل ہر روز تہجد کے وقت دو نفل حاجت کے پڑھ کر ان کے لیے دعا کر رہی تھیں۔ انھیں یقین تھا کہ اللہ کی مدد ضرور آئے گی اور سب کچھ پہلے کی طرح نارمل ہو جائے گا۔

کڑھی پکوڑے کے ساتھ چاول بھی ابال لیے گئے۔ وقار کڑھی سفید چاولوں کے ساتھ کھاتا تھا۔ کھانا تیار ہو گیا۔ ثانیہ خاموشی سے سر جھکائے میز پر کھانے کے برتن رکھ رہی تھی۔ وقار موبائل پر گیم کھیل رہا تھا۔ حمزہ قالین پر بیٹھا اپنے کھلونوں سے کھیلنے میں مگن تھا۔ ذکیہ خالہ کچن میں کھڑی مسلسل ہلکی پھلکی گفتگو کر رہی تھیں۔ اپنے ماضی سے لے کر حال تک کے کتنے ہی قصے انھوں نے سنا دیے مگر پھر بھی ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے سارے روبوٹ کی طرح بس اپنا اپنا کام کر رہے ہیں۔ اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔ وقار نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سلمٰی تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی

"سلام خالہ۔" سلمٰی نے پھولی سانس کے ساتھ کہا۔

''تم اس وقت؟'' ذکیہ خالہ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ وہ کپڑے دھونے بدھ والے دن آتی تھی۔ جبکہ آج منگل تھا۔

''خالہ کڑھی کھا رہی ہیں میرے بغیر۔'' سلمیٰ نے لاڈ بھرے انداز میں کہا تو ذکیہ خالہ چونک گئیں۔

''ہیں...... تمہیں کیسے پتا چلا؟''

ذکیہ خالہ کے سوال پر وقار نے چونک کر پہلے ان کی طرف دیکھا اور پھر ثانیہ کی طرف۔ جو خود بھی ہمہ تن گوش تھی۔

''ارے خالہ! صبح سے آپ نے اتنا شور ڈالا ہوا ہے۔ کبھی بیسن مانگ رہی ہیں، کبھی مرچ، کبھی کچھ۔'' سلمیٰ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' ثانیہ نے حیرت سے پاس آ کر سوال کیا۔

''باجی! جب آپ لوگ یہاں کھڑے ہو کر بات کرتے ہیں تو ساتھ والوں کے لاؤنج میں ساری آوازیں آتی ہیں۔ کیونکہ دونوں کی کھڑکیاں ساتھ ساتھ جو ہیں۔'' سلمیٰ نے لاپروائی سے کہا۔ وہ تینوں اپنی اپنی جگہ ساکت کھڑے رہ گئے۔

''میں نے صبح صفائی کرتے ہوئے خالہ کی آوازیں سن کر اندازہ لگالیا تھا کہ آج کڑھی بن رہی ہے۔ اس لیے سب کام ختم کر کے دوڑی چلی آئی کہ گھر جاتے ہوئے کڑھی لے کر جاؤں گی۔''

سلمیٰ نے زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ خالہ ذکیہ نے بت بنے، سفید ہوتے چہرے کے ساتھ کھڑے وقار کی طرف دیکھا۔ ثانیہ کی آنکھوں سے تیزی سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''سلمیٰ! ایک بات بتاؤ۔ کیا ثانیہ باجی کی آواز بھی اکثر وہاں سنائی دیتی ہے؟'' ذکیہ خالہ نے نرمی سے سوال کیا تو سلمیٰ ہنس پڑی۔

''تو اور کیا خالہ! باجی جب دوپہر کو اپنی بہن سے فون پر بات کر رہی ہوتی ہیں تو اکثر میں اس وقت ساتھ والوں کے گھر کام کرنے آئی ہوں۔''

نواب بھائی اس وقت لاؤنج میں کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوتے ہیں۔ وہ تو اکثر کہتے ہیں کہ ساتھ والی باجی بہت اونچا بولتی ہیں کہ میں آرام بھی نہیں کر سکتا۔''

سلمیٰ نے صاف گوئی سے کہا۔

''اچھا یہ کڑھی لو اور یہ پیسے بھی۔''

ذکیہ خالہ نے دل میں اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہوئے فوراً صدقے کے پیسے سلمیٰ کو پکڑائے۔ وہ خوشی خوشی وہاں سے چلی گئی۔ ذکیہ خالہ نے ان دونوں کی طرف دیکھا جو اپنی اپنی جگہ مجرم بنے کھڑے تھے۔

☆☆☆

''معافی تلافی کرنے کے لیے ساری عمر پڑی ہوئی ہے۔ مگر ابھی جو سبق تم دونوں کو ملا ہے پہلے اس پر غور کر لو۔''

وہ دونوں سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ ذکیہ خالہ سنجیدگی سے بول رہی تھیں۔

''ثانیہ بیٹی! ایک عورت ہونے کے ناتے بہت سنبھل کر رہنا چاہیے۔ عورت کی آواز کو ڈھول کی طرح نہیں ہونا چاہیے کہ وہ دیوار اور کھڑکیاں پھلانگ کر نامحرم مرد کے کانوں میں سنائی دے۔ جیسے عورت کو خوشبو کے استعمال کرتے وقت احتیاط کا حکم ہے کہ خوشبو کسی نامحرم تک نہ جائے۔ اسی طرح زندگی کے باقی معاملات میں بھی عورت کو سوچ سمجھ کر چلنا چاہیے۔''

ذکیہ خالہ نے کہا تو ثانیہ نے روتے ہوئے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

''میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ میری معمولی سی غفلت مجھے کس مقام پر لا کر کھڑا کر دے گی۔''

ثانیہ شرمندگی سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ایسے کتنے ہی لمحے، کتنے ہی پل، کتنی ہی ذاتی باتیں، شکایتیں ایک کے بعد ایک یاد آ رہی تھیں کہ وہ پچھتاوے کی آگ میں جلنے لگی۔ اپنی بہن سے بہت ذاتی باتیں کرتے وقت

ی، اس نے کبھی اپنی آواز کے والیم کو کم رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور اس کی آواز ہمیشہ سے ایسے ٹ دار تھی کہ وہ سرگوشی بھی کرتی تو سب کو سنائی دیتا تھا۔

اب پتا نہیں ساتھ والے گھر میں موجود لوگوں نے اس کی کون کون سی باتیں سنی تھیں۔ بہر حال ایک شرمندگی تو اسے ساری عمر رہنی تھی۔

"ثانیہ! مجھے معاف کر دو۔ میں نے تم پر شک کیا۔"

وقار نے بے اختیار ہاتھ جوڑے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر شرمندگی تھی۔

"وقار! تم نے اپنی بیوی پر شک کر کے بہت غلط کیا۔ ایک شوہر سے بہتر اس کی بیوی کو بھلا کون جان سکتا ہے۔ میاں بیوی کے رشتے کو کم از کم اتنا مضبوط تو ہونا چاہیے کہ ایک دوسرے پر اندھا اعتبار کر سکیں۔ اگر اس رشتے میں اندھا اعتبار قائم نہیں کر سکتے تو زندگی میں اس سے قریبی تو اور کوئی رشتہ نہیں ہوتا ہے۔"

ذکیہ خالہ نے افسوس بھری نگاہ وقار پر ڈالی۔

"تمہیں معاف کرنا یا نہیں کرنا ثانیہ کا ذاتی فیصلہ ہے۔ میں کل صبح واپس چلی جاؤں گی۔"

ذکیہ خالہ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ان کے وہاں سے جانے کے بعد وہ دونوں گم صم اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ عام حالات ہوتے تو ثانیہ شاید کبھی وقار کی اس حرکت کو معاف نہیں کرتی مگر اب صورت حال دوسری تھی۔ وقار سے زیادہ ثانیہ کی بے وقوفی نے اس معاملے کو بگاڑا تھا۔ وقار کی جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو بیوی کو مار پیٹ کر طلاق بھی دے چکا ہوتا۔ پتا نہیں ثانیہ کی کونسی نیکی اس کے کام آئی تھی۔

مگر اب جھجک یہ تھی کہ وہ دوبارہ، کہاں سے وقار کے ساتھ زندگی کی ابتدا کرے؟ جب سب کچھ ہی بدل کر رہ گیا تھا۔

وہ دونوں اپنی اپنی جگہ سوچوں میں گم تھے جب ثانیہ کو اپنے ہاتھ پر ایک نرم لمس محسوس ہوا۔ ثانیہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو حمزہ مسکراتے ہوئے اس کی انگلی پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ ثانیہ گہری سانس لے کر کھڑی ہوئی تو حمزہ اس کی انگلی کھینچتا، ساتھ بیٹھے وقار کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بھی کھینچنے لگا۔

"غبارہ لینا ہے۔"

حمزہ کو رنگ برنگے غبارے بہت پسند تھے۔ وہ اپنے والدین کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے جانا چاہتا تھا۔ وقار اور ثانیہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔ وقار نے آگے بڑھ حمزہ کو گود میں اٹھایا اور پھر وہ باہر کی طرف بڑھ گیا۔ ثانیہ ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھ کر اداسی سے مڑ کر اندر کمرے کی طرف جانے لگی جب آگے جاتے جاتے وقار نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر ثانیہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ثانیہ بے اختیار اس کے پیچھے چل پڑی۔ ذکیہ خالہ نے مطمئن ہو کر انھیں جاتے ہوئے دیکھا اور شکرانے کے نفل پڑھنے کے لیے وضو کرنے چل دیں۔

پرسکون اور خوبصورت بنی سوسائٹی کی طویل اور روشن سڑکوں پر شام ڈھلے، وہ دونوں، حمزہ کے لیے رنگ برنگے غباروں کی تلاش میں دور تک چلتے جا رہے تھے۔ مقصد تو ساتھ چلنا تھا۔ ایک دوسرے کی خاموشی کو محسوس کرنا تھا۔

ثانیہ نے اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں روشن رات کو دیکھا۔ کچھ دیر پہلے وہ سوچ رہی تھی کہ وقار کے ساتھ آگے کی زندگی کیسے گزرے گی؟

قدرت نے اس کے سوال کا جواب فوراً دے دیا تھا۔

"خواہش اور خواب کے غباروں کے پیچھے چلتے، انہیں ڈھونڈتے، وہ زندگی کا مشکل سفر، ایک ساتھ گزار سکتے تھے۔ بات صرف نیت اور ساتھ چلنے کی لگن کی تھی۔

اور اس لگن کی لو ان دونوں کے دل میں آج بھی روز اول کی طرح روشن تھی۔

☆

موسم گرما کا اختتام تھا۔ سردیاں خراماں خراماں گرما کو رخصت کرنے کے درپے دکھائی دے رہی تھیں ایسے میں کچنار کے پیڑ پر قیام پذیر سبز طوطی اور سیاہ چونچ والی چڑیا مضمحل سی بیٹھی موسم کی رخصتی پہ ماتم کناں تھی۔

صغریٰ نے روز کی طرح باجرہ اور روٹی کے ٹکڑے درخت کے نیچے دھرے مٹی کے پیالہ میں رکھے مگر دونوں میں سے کوئی بھی اڑ کر ادھر نہ آیا ان کی یاسیت محسوس کرتے ہوئے انہوں نے تاسف سے سر ہلایا اور ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئیں۔

پشمینہ کا سبز آنچل لہراتے صحن کی جانب آتے ہوئے وہ ذرا سا مسکرائی تھی۔

''دادا جان یاد آ رہے ہیں ناں۔'' کرسی گھسیٹ ان کے مقابل بیٹھتے ہوئے اس نے جھک کر بات سے استفسار کیا تو پیچھے سے یکلخت کمر پر ضرب پڑی تھی وہ بلبلا کر مڑی تو سامنے تھالی میں چاول لیے لمڑی شمیم اسے تنبیہی نگاہوں سے گھور رہی تھیں

''شرم کا مقام ہے۔ لحاظ ہی نہیں ہے کہ کس سے کیا پوچھا جا رہا ہے۔''

''امی! میرا اور دادی کا مذاق ہے، آپ ہر بات اپنے معنوں میں کیوں لے جاتی ہیں۔'' اس نے جھلا کر کمر سہلاتے ہوئے دہائی دی جسے شان بے نیازی سے نظر انداز کر کے وہ تھالی سنبھال کر کرسی پر بیٹھ گئیں۔

مونا شاہ قریشی





''جن لوگوں نے آنا تھا ان کا کب تک ارادہ ہے آنے کا۔'' دادی کے پوچھنے پر اس کی تمام حسیات یکلخت بیدار ہوئی تھیں جبکہ فوراً سے پیشتر شمیم نے اسے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا تھا۔ مرے مرے قدموں سے چلتے ہوئے وہ جانے کو مڑی تھی اور پھر چند قدم چل کر تجسس کے مارے وہیں ٹھہر گئی تھی۔

''اس جمعہ کو آنے کا کہہ رہے ہیں، میری لڑکے کی ماں سے بات ہوئی تھی فون پر، بھلے مانس سے لوگ لگے مجھے تو......''

''اللہ میری عنایہ کو جھولی بھر بھر خوشیوں سے



نوازے۔'' دادی نے اٹھتے ہوئے دعا دی تو شمیم زیر لب آمین کہہ کر چاولوں کی پر جھک گئیں۔ عنایہ نے سنتے ہی کمرے کی جانب دوڑ لگائی تھی۔ دھک دھک کرتے دل سے بستر پر گرتے ہوئے وہ پریشانی سے آنے والے دنوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

جمعہ کے بابرکت دن عنایہ کا رشتہ طے ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن کو اپنے دوست کا لائق بیٹا عنایہ کے لیے بہت بھایا تھا۔ عنایہ کی ساس نے بھی عنایہ کو دیکھتے ہی پسند کرلیا تھا۔ دونوں خاندانوں کی باہمی رضامندی سے شادی پانچ ماہ بعد ہونا طے پائی تھی۔ گھر میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے۔ جہیز کا بیشتر سامان آچکا تھا۔ کپڑے اور کراکری کے لیے بازار کے لگتے چکروں نے شمیم کو نڈھال کردیا تھا۔ آج بھی بازار سے واپس آکر انہوں نے سارے شاپر صوفے پر رکھے اور چادر تہہ کر کے گہری سانس بھرتی صوفے پر ہی ڈھے گئی تھیں۔

''جیولری کے لیے آرڈر دیا ہے آج۔ سونے کی قیمت تو گویا آسمان کو چھونے کے درپے ہے۔''

وہ اماں کو بتا رہی تھیں اسی اثنا میں عنایہ ہاتھوں میں جوس کا گلاس اور پلیٹ میں تلے ہوئے خستہ ڈونٹس لے آئی۔

عنایہ کو شروع ہی سے کھانا پکانے سے دلچسپی تھی اب تک وہ کھانا بنانے میں ماہر ہوچکی تھی۔ گریجویشن سے فراغت کے بعد اس کا بہترین مشغلہ باورچی خانہ میں وقت گزارنا تھا

''ماشاء اللہ بھئی ماشاء اللہ۔ آپی! آپ کے شوہر اور ساس کی تو موج ہوجائے گی واللہ۔''

شہروز نے پلیٹ میں سے ایک ڈونٹ اچک کر ہانک لگائی۔ شمیم اور دادی بیک وقت مسکرائیں جبکہ عنایہ نے پیچھے مڑ کر اسے گھورا جس کی اس نے چنداں پروانہ کی، آج کل چونکہ وہ آن لائن کوکنگ کلاسز لے رہی تھی تو کھانے پینے کے شوقین شہروز کے صحیح معنوں میں عیش ہوگئے تھے

''اب کھانا لگا دو جلدی سے۔ امی کو بھوک لگ رہی ہوگی۔ ہے ناں امی۔'' اپنے پیٹ کی دہائی کو اس نے ماں کی تائید میں دبانا چاہا تھا۔

''یہ پیٹ جو ہے میرے دلارے۔ مٹکا بن جائے گا ذرا اعتدال میں لاؤ اپنی زبان کے چٹخارے۔'' آخری بات کو چبا کر بولتے عنایہ نے اس کا کان پکڑ کر مروڑا تھا جس پر اس کے منہ سے بے ساختہ ہائے نکلی تھی۔ دادی نے مسکراہٹ دبائے ہوئے سر دائیں بائیں ہلایا تھا۔ شمیم کی آنکھیں یکلخت ہی بھر آئی تھیں۔ چند دنوں بعد یہ رونق سلسلہ تھم جانا تھا۔ اداسی بھری مسکراہٹ کو لبوں پر پھیلاتے انہوں نے آنکھوں کی نمی کو چھپانا چاہا تھا۔

''یہ سامان سیف میں رکھو سنبھال کر۔'' شاپر عنایہ کو پکڑاتے ہوئے شمیم نے گلاس لبوں سے لگا تھا۔ سامان اٹھائے عنایہ وہاں سے چلی گئی تھی جبکہ دادی تسبیح کے دانے گرانے ذکر میں محو ہوگئی تھیں۔

ہر گزرتا دن اس کے اس گھر میں قیام کو قلیل کر رہا تھا آنے والے دن موسم میں ذرا خنکی لے آئے تھے۔ دوپہر ڈھل کر شام میں تبدیل ہو رہی تھی۔ سہ پہر نے جونہی اپنا سایہ در و بام پر ڈالا۔ گھر کے مکینوں میں ہلچل مچ گئی۔

''تمہیں کس نے کہا تھا دوپہر کا کھانا بنانے کو۔'' شمیم نے غصہ دبا کر ذرا تحمل سے پوچھا۔

''شہروز ضد کر رہا تھا کہ جانے سے پہلے اس ہاتھ کی کڑاہی تو کھلا دیں۔'' مایوں کا پیلا جوڑا استری سے استری کرتے عنایہ نے جواب دیا۔

''وہ تو ہے ہی احمق کم از کم تم تو اپنا دماغ ٹھکانے پر رکھو۔ پانچ دن بعد بیاہ ہے اور بنو چلی ساری محنت چولہے میں جھونکنے۔''

ٹھہرے لہجہ میں ڈانٹتے شمیم بڑبڑائی تھیں پچھلے پندرہ دنوں سے اس کا کچن میں داخلہ ممنوع تھا۔

گھر کے ہر کام سے بری الذمہ ہونے کے اسے جو مشغلہ تھمایا گیا تھا وہ اپنے آپ کو سنوارنا تھا

دادی کے ہاتھ کا بنا ہلدی اور صندل کا ابٹن ملتے ملتے اس کے ہاتھ جواب دے گئے تھے مگر اک دن کا ناغہ بھی قابل قبول نہیں تھا۔

''امی کیا ہو گیا ہے۔ نہیں پڑا میرے حسن میں داغ۔ تسلی رکھیں۔'' عنایہ کے سکون پر انھوں نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔

''اب جلدی تیار ہو کر نکلنا باہر۔'' اسے ہدایت دے کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

مایوں کے بعد پانچ دن محض پانچ گھنٹوں کے مترادف ثابت ہوئے تھے اور بارات کا دن آن پہنچا تھا۔

نارنجی لہنگے میں دلہن بنی سجی سنوری وہ حسین ترین دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی ساس نے ڈھیروں بلائیں لیتے ہوئے ہزاروں روپے وار کر صدقہ دیا تھا۔ دونوں بیاہی نندیں اپنے بچوں کو گود میں چڑھائے بمشکل عنایہ کی تعریف کر رہی تھیں۔

شزا اس کی بن بیاہی نند تھی جو دھڑا دھڑ بھائی بھابھی کی تصاویر اتارنے میں مگن تھی تاکہ کالج میں دوستوں کو دکھا سکے۔ اکلوتی جیٹھانی ٹیڑھی نظروں سے دیورانی کے دو آتشہ روپ کو دیکھ کر منہ بنائے کھڑی تھیں۔ لاؤنج میں لگا رش عنایہ کے دل کو ڈانواں ڈول کر گیا تھا۔

بھانت بھانت کے لوگ کھڑے تبصرے اور تصاویر میں مصروف تھے۔ اس کے چہرے کے پریشان کن تاثرات دیکھ کر اس کی بڑی نند جھٹ اپنے بچے کو شوہر کی گود میں منتقل کرتے اس کے قریب آئی تھی، سب کے بیچ سے اسے احتیاط سے اٹھا کر کمرے میں لے آئی تھی۔

''آرام سے بیٹھو۔ میں رضا کو بھیجتی ہوں۔'' اس کی پشت پر تکیہ لگا کر ملائمت سے کہتی وہ باہر نکل گئی۔

اکڑی کمر کو آرام دہ تکیہ پر ٹکاتے وہ قدرے پرسکون ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

چند لمحوں بعد ہی رضا نے کمرے میں قدم رکھ

کر اس کی دھڑکنوں میں ارتعاش برپا کیا تھا۔ لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ سجائے پشت پر دونوں ہاتھ باندھے اس نے سلامتی بھیجی تھی جس کا جواب عنایہ نے مدھم سی آواز میں دیا تھا۔

''میرے ویران کمرے کو باغ و بہار بنانے کا شکریہ۔'' اس کے ہاتھ کو ہولے سے تھام کر رضا نے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے جھینپ گئی۔ پہلی ملاقات کی شناسائی گویا برسوں کی رفاقت میں ڈھلنے لگی۔ عہد، محبت اور احترام کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔

ہوا کے شریر جھونکے کھڑکی کے کانچ سے ٹکرا کر پلٹنے لگے تھے۔ بادلوں کے چند ٹکڑوں نے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے دو چار بوندیں زمین کے سینے پر برسائی تھیں اور بھاگتے دوڑتے آگے نکل گئے تھے۔ بوگن ویلیا نے بارش کے چند قطروں کو اپنے اندر جذب کر کے اپنا حسن نکھارا تھا۔ ہر شے گویا تازگی اور خوش گواریت کا عندیہ لیے ہوئے تھی۔ آسمان سے گرتی ڈھلتی رات کی خنکی میں بھی شگفتگی گھلی تھی۔ اب صبح کا انتظار تھا جو یقیناً رات کے تاثر سے لبریز ہونے والی تھی۔

☆☆☆

کمرے کے دروازے پر ہونے والی مدھم سی دستک سے عنایہ نے گھبرا کر دوپٹہ سر پر ٹکایا۔ رضا نے ہولے سے مسکرا کر اس کے گھبرائے روپ کو دیکھا پلکیں اٹھائے گرائے وہ دروازہ کھلنے کی منتظر تھی۔ بمشکل اس کے چہرے سے نظریں ہٹاتے اس نے دروازہ کے پٹ وا کیے تھے۔

صبح کا سلام جھاڑتی عنایہ کی دونوں نندیں مسکراتے ہوئے معنی خیزی سے اندر داخل ہوئی تھیں اور پھر باتوں کا ایک نہ تھمنے والا سلسلہ چل نکلا تھا ناشتے سے فراغت کے بعد ولیمہ کی تیاری نے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ یونہی بھاگ دوڑ میں شادی کا دوسرا روز بھی خوش گوار طریقے سے اپنے انجام کو پہنچا تھا۔ زندگی کو اپنی روٹین پر آتے کئی دن لگ گئے تھے۔

آج میٹھا پکوائی کی رسم کے لیے پورا گھر اک جمع تھا دونوں نندیں اپنے سسرال سے یہاں آئی ہوئی تھیں اور جیٹھانی جو کہ علیحدہ گھر میں قیام رہتی یں وہ بھی تشریف فرما تھیں۔ ساس کی طرف سے ہ اور نندوں کی طرف سے کھیر کی فرمائش آئی تھی۔ سے کچن میں گھسی وہ اپنی تمام صلاحیتیں بروئے لاتے تن دہی اور دلجمعی سے دونوں ڈشز بنانے مصروف تھی۔ گھر میں چونکہ وہ متعدد بار سب کچھ چکی تھی اس لیے بنا کسی تردد کے نہایت سکون سے ب بنا رہی تھی۔

شزا (چھوٹی نند) کی مدد بس اس نے بادام پتے کاٹنے کی حد تک لی تھی باقی تمام کام اس نے خو ہی خوش اسلوبی سے سرانجام دیے تھے۔ نہایت سلیقے سے ٹرے میں چاول اور ڈونگے میں کھیر ڈال کر اس نے خوب صورتی سے گارنش کیا تھا۔ انتظار میں بیٹھے سب لوگوں کی نگاہوں میں میٹھے کی سجاوٹ دیکھ کر ستائش ابھری تھی۔

''واہ بھئی! شکل تو بہت لاجواب ہے کھانے کی۔''

جیٹھ کی طرف سے تعریف موصول ہوئی جسے اس نے مسکرا کر قبول کیا۔ جیٹھانی کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری تھی سب نے اپنی پلیٹ میں اپنی مرضی سے میٹھا نکالا تھا۔ رضا کو اس نے کھیر ڈال کر دی تھی۔

ساس اور سسر دونوں نے زردہ سے پلیٹ بھری تھی اپنی پلیٹ میں ذرا سی کھیر ڈال کر ابھی اس نے ایک چمچ لیا ہی تھا کہ ساس کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''یہ زردہ ہے؟ اس قدر کم میٹھا ڈالا ہے۔''

پلیٹ میں رکھے چاولوں میں چمچ ڈال کر انہیں پرے کھسکاتے ہوئے انہوں نے برا سا منہ بنایا۔

''دکھائیں ذرا۔'' شزا نے فوراً پلیٹ اپنی جانب کھسکا کر اک چمچ بھر کر منہ میں لیا تھا۔

''ہاں واقعی میٹھا تو بہت کم ہے۔'' شزا نے تائید کی۔

''میٹھا تو میں نے نارمل ہی رکھا ہے۔'' عنایہ نے رضا کو دیکھتے ہوئے کہا جو بے نیازی سے کھیر کھا رہا تھا۔

''نہیں نہیں۔ میٹھا تو بالکل ٹھیک ہے۔ ماشاء اللہ مزے دار زردہ بنا ہوا ہے۔ دراصل امی وغیرہ میٹھا زیادہ کھاتے ہیں۔ یہ شزا بتانا بھول گئی ہوگی۔'' اس کی سب سے بڑی نند نے تعریف کرتے ہوئے وضاحت دی تو اس کے تفکر زدہ چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ در آئی۔

''کھیر تو بہت لذیذ بنی ہوئی ہے جیسا سنا تھا بھابھی بالکل ویسا پایا۔ آپ واقعی کھانا زبردست بناتی ہیں۔'' جیٹھ نے دل کھول کر سراہا جبکہ جیٹھانی خاموشی سے کھاتی رہیں۔ مسکراہٹ اب بھی ان کے لبوں پر کھیل رہی تھی جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔

سسر اور دوسرے نمبر والی نند بھی ستائش سے نواز رہی تھی۔ ساس کے جملے سے جو دل شکنی ہوئی تھی وہ لمحوں میں ہوا ہو گئی تھی۔ کھانے سے فراغت کے بعد شزا نے سب کے لیے چائے بنائی تھی۔ سہ پہر سے کچھ دیر پہلے محفل برخاست ہوئی تو چائے کے خالی کپ رکھنے وہ باورچی خانہ میں چلی آئی۔

''ابھی تو شروعات ہے یہ۔ آگے دیکھنا پوری فلم۔''

پہلے سے وہاں موجود اس کی جیٹھانی نے اسے دیکھ کر معنی خیزی سے کہا اس نے ناسمجھی سے انہیں دیکھا تھا۔

''ان لوگوں کے ساتھ گزارا آسان نہیں ہے۔ یہاں ان کے اصول لاگو ہوتے ہیں۔ تمہارا سارا سلھڑاپا فیل ہو جائے گا۔ یہی رنگ ڈھنگ دیکھ کر میں علیحدہ ہوئی تھی۔''

''مجھے یہ سب بتانے کا مقصد کیا ہے آپ کا۔''

ان کی بات پر نہایت سکون سے اس نے پوچھا۔

''میرا تم سے کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے تو مقصد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تو تمہیں ہوشیار رہنے کا اشارہ دے رہی تھی۔''

انہوں نے لاپروائی سے کندھے اچکائے اور باہر نکل گئیں۔ زارا نے پرسوچ نظروں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھا اور پھر سر جھٹک کر خود بھی اپنے کمرے میں چلی آئی۔

''آپ کو کھیر پسند نہیں آئی کیا۔ آپ نے تعریف ہی نہیں کی۔'' رضا کو نیم دراز دیکھ کر اس کے منہ سے شکوہ پھسل گیا۔

''کیوں نہیں پسند آئی۔ بہت مزے کی بنی ہوئی تھی۔'' رضا کے پیار سے کہنے پر وہ ایکدم خوش ہو گئی

شام کو ہی سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ اگلے روز صبح کے ناشتے سے اس نے باقاعدہ کام کا آغاز کیا تھا۔ شزا کو کالج جلدی جانا ہوتا تھا کیونکہ وین لینے آتی تھی اس لیے فجر کی نماز کے بعد ہی اس نے فٹافٹ ناشتہ تیار کر دیا تھا۔

''اوہو بھابھی پراٹھوں پر کتنا کم گھی لگایا ہے۔ سوکھے پڑے ہیں بالکل۔'' جلدی جلدی چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے شزا نے تبصرہ کیا

''دوسرا پراٹھا بنا دوں کیا۔'' اسے بیگ اٹھاتے دیکھ کر عنایہ نے جلدی سے کہا۔ مبادا وہ ناشتہ کیے بنا ہی کالج نہ چلی جائے۔

''نہیں بھابھی بس رہنے دیں۔ وین آ گئی ہے۔'' موبائل پر بجنے والی میسیج ٹون دیکھتے ہوئے وہ افراتفری میں باہر نکل گئی تھی۔

''ناشتہ کر کے گئی ہے یہ۔'' اس کی ساس نے کمرے سے باہر آ کر پوچھا۔

''نہیں امی ادھورا چھوڑ گئی ہے۔''

''کیوں ادھورا کیوں چھوڑا ہے۔'' تسبیح کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' عنایہ نے نہایت دھیمی آواز میں کہا۔

''ہمم...... ناشتہ آٹھ بجے بنانا سب کا۔ رضا کا

دفتر جانے کا وقت ہوتا ہے۔" اسے ہدایت دیتی وہ صحن کی جانب بڑھ گئیں۔

کمرے میں آ کر اس نے تھوڑا آرام کیا اور پھر ساڑھے سات بجے باورچی خانہ کا رخ کیا۔ ناشتہ بنا کر دستر خوان لگاتے ہوئے اس نے مسلسل خود پر ساس کی نگاہوں کو جما ہوا محسوس کیا تھا۔

"دستر خوان پر سب سے پہلے پانی رکھتے ہیں۔" سب چیزیں رکھ کر ابھی وہ بیٹھی ہی تھی کہ سخت لہجہ سماعت سے ٹکرایا وہ پانی کا جگ رکھنا بھول گئی تھی۔ شرمندہ ہوتے ہوئے اس نے بمشکل "جی" کہا۔ اور تیزی سے پانی کا جگ اٹھا لائی۔

"پراٹھوں پر اتنا گھی کیوں لگایا ہے۔" نوالہ منہ میں ڈالتے ہی انہوں نے اعتراض کیا تھا۔

"امی! وہ دراصل شزا نے کہا تھا کہ پراٹھے پر گھی کم لگایا ہے تو اس لیے مجھے لگا شاید زیادہ لگانا ہے۔" بتاتے ہوئے عنایہ تھوڑا ہچکچائی۔

"تب ہی آج وہ ناشتہ نہیں کر کے گئی۔ کم از کم پوچھ ہی لینا تھا تم نے اس سے۔ وہ زیادہ گھی والا پراٹھا کھاتی ہے۔ پتا نہیں کالج میں بھی کچھ کھائے گی یا نہیں۔" ان کے جذباتی ردعمل پر وہ بوکھلا کر رضا کو دیکھنے لگی کہ شاید وہ کچھ کہے۔

"آپ پریشان نہ ہوں امی۔ میں آفس جاتے ہوئے ناشتہ پیک کروا کر اس کے کالج میں دیتا جاؤں گا۔" رضا کی تسلی پر انہوں نے سر ہلایا تھا۔

"بھئی مجھے تو آج پراٹھے بہت اچھے لگ رہے ہیں۔" سسر نے یکلخت ہی حمایت میں دو بول بولے تھے جنہیں ساس نے بڑے سکون سے گھرک کر چپ کروا دیا تھا۔

"آپ کو دل کا مسئلہ ہے صدیق صاحب! آپ تو اجتناب کیجیے ثقیل غذاؤں سے۔" ان کی بات پر عنایہ خفت زدہ ہوئی تھی۔

بوجھل فضا میں بمشکل چند نوالے کھا کر اس نے دستر خوان سمیٹ دیا تھا۔

دوپہر کے کھانے پر اس کی ساس وہیں باورچی خانہ میں ہی کرسی رکھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ ایک ایک مسالا عنایہ نے ان سے پوچھ کر ہانڈی میں ڈالا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ پہلی بار کھانا بنا رہی ہے۔ ہر چیز اپنے حساب سے ڈلوا کر پورا سالن اپنی نگرانی میں تیار کروا کر وہ باہر گئیں تو اس نے کھل کر سانس لیا۔ روٹیاں ڈال کر ہاٹ پاٹ میں رکھتے ہوئے اس نے سلیقے سے بکھرا سامان سمیٹا اور جگ میں پانی بھر کر دستر خوان لگانے لگی۔ شزا کالج سے آ چکی تھی کھانا لگانے کے بعد ہاتھ دھو کر دستر خوان پر بیٹھی تو ایک نیا اعتراض اس کا منتظر تھا۔

"روٹیاں ہاٹ پاٹ میں نہ رکھا کرو۔ مجھے تازہ گرم روٹی پسند ہے۔ یہ ہاٹ پاٹ والی روٹی تو عجیب نرم سی ہو جاتی ہے۔"

نوالہ توڑ کر سالن میں لگاتی عنایہ نے لب بھینچ کر ان کی بات پر سر ہلایا تھا۔ شام کو سب کھانے پر اکٹھے ہوئے تو اس کی ساس نے پھر سے دوپہر کا تذکرہ چھیڑ ڈالا۔

"آج تو اپنی نگرانی میں کھانا بنوایا ہے۔ میں نے کہا چلو آہستہ آہستہ سیکھ جائے گی بچی۔"

"اچھا بنا ہوا ہے امی۔" رضا نے کہا تو عنایہ نے حیرت سے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا جو کھانے کی تعریف کر رہا تھا۔ حالانکہ کھانا خاصا بدمزہ تھا۔ نمک مرچ کا تناسب اس قدر کم تھا کہ اس سے دوپہر میں بھی کھایا نہ گیا جب کہ وہ سب لوگ آرام سے کھا رہے تھے۔ اب ہر روز اسی طرح ہونے لگا۔

کھانے کے وقت پر اس کی ساس باورچی خانہ میں پائی جاتیں۔ ہر چیز اپنی مرضی سے ڈلواتیں۔ سبزی کاٹنے سے لے کر کھانا بنانے تک اس نے ایک ایک چیز نئے سرے سے سیکھی تھی۔ وہ سالن میں مسالا اچھا ڈالتی تھی جبکہ یہاں برائے نام مسالے والا سالن کھایا جاتا تھا۔

زیادہ نمک۔ زیادہ مرچیں اور زیادہ آئل کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ روٹی تھوڑی بھاری بنتی تھی جبکہ اسے پتلی روٹی بنانے کی عادت تھی۔

بات اگر نئے گھر کے عادت و اطوار سیکھنے کی ہوتی تو کوئی مضائقہ نہیں تھا مگر جس انداز میں اسے سب سمجھایا جارہا تھا وہ ہتک آمیز تھا۔ اسے بالکل صفر پر کھڑا کر کے خود ہر چیز سکھانے کا کریڈٹ وہ نہایت ہوشیاری اور بہ احسن طریق اپنے حصے میں لے جاتی تھیں۔

دراصل اس کی ساس کا تعلق عورتوں کی اس قبیل سے تھا جو باورچی خانہ بہو کے ہاتھ میں دینے کا مطلب پورے گھر پر قبضہ کرنا سمجھتی تھیں۔ بڑی بہو کے ساتھ بھی یہی روش رکھی گئی تھی۔ وہ خاصی پراعتماد اور چالاک تھی تب ہی ساس کے انداز پہچان کر لڑائی جھگڑے ہی سے سہی مگر الگ ہوگئی تھی مگر یہاں عنایہ تھی۔ چالاکیوں سے مبرا۔ روایتی سیاست سے بے بہرا اس لیے خاموشی سے ہر بات کو تسلیم کیے جارہی تھی۔

☆☆☆

فجر کی نماز کی ادائیگی کے بعد پیڑ تلے بچھی کرسی پر بیٹھ کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ اسے میکے آئے دوسرا دن تھا۔ چڑیا کی مسلسل چوں چوں ورد خدا کا عندیہ دے رہی تھی۔

دادی نے صحن کی جانب آتے ہوئے مسکرا کر پیار سے اسے دیکھا۔

"تھک گئی ہو۔" انہوں نے سر پہ ہاتھ دھرا۔

"جی بہت زیادہ۔" بوجھل آواز میں اس نے اعتراف کیا تو ان کی نگاہوں میں سوچ کا عکس لہرایا۔

"تھکن کی نوعیت جو بھی ہو میری بچی! اسے ختم ہوجانا چاہیے۔ مستقل تھکن زندگی دشوار کردیتی ہے۔" ذرا توقف کے بعد انہوں نے پیار سے سمجھایا۔

"ارے آپی! میں کب سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔" شہروز اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچا۔

"چلو جی یہاں تو راز و نیاز چل رہے ہیں۔ ہماری کیا ضرورت بھلا......" ٹراؤزر کی جیبوں میں سے ہاتھ نکال کر اس نے سینے پر باندھے۔

"صحیح کہہ رہے ہو تمہاری کوئی ضرورت ہے بھی نہیں۔ سیکنڈ ٹائم پیپر ہے تمہارا، جاکر تیاری کرو۔"

ذرا سا سر اوپر اٹھا کر عنایہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا جس پر اس کے منہ کے زاویے یکلخت بگڑ گئے۔

"دوپہر میں میرے لیے کچھ اسپیشل بنا دیجیے گا۔ اچھا کھاؤں گا تو اچھا دماغ چلے گا۔" اس کی فرمائش پر عنایہ کی پیشانی پر لکیریں ابھری

"میں کچھ نہیں بنا رہی۔" بے زاری سے کہتی وہ دادی کی گود میں منہ چھپا گئی۔

"ہیں یہ کیا۔ آ آ آ آپی ی ی......"

وہ مصنوعی صدمے سے چلایا تو دادی نے سر کے اشارہ سے اسے وہاں سے جانے کو کہا جس پر منہ بناتا وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

"اب یوں مت دیکھیں مجھے۔ اول درجے کی پھوہڑ ہوں میں۔ مجھے کچھ بھی بنانا نہیں آتا۔ مجھ میں گرہستی کا سلیقہ نہیں ہے۔"

دادی کی خاموش نگاہوں پر اس نے دل بھر کر شکوہ کیا۔

"بالکل صفر سے شروع کیا ہے، میں نے سب کچھ سیکھنا۔ امور خانہ داری ہو یا گھر کے دوسرے کام ہر چیز مجھے یوں سکھائی گئی ہے جیسے میں کوری ہوں۔"

ان کی خاموشی پر وہ مزید بولی۔

"بیٹا ہر گھر کے اپنے طور طریقے ہوتے ہیں۔ وہی عورت کامیاب ہوتی ہے جو ہر ماحول میں رچ بس جائے۔ اس بات کو اتنا دل پر لینے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے انہوں نے رسان سے سمجھایا۔

"دادی! مجھے کوئی قباحت نہیں ہے سیکھنے میں مگر مجھے یہ باور تو نہ کروایا جائے کہ میری ماں نے مجھے کچھ سکھایا نہیں۔ مجھے کچھ آتا جاتا ہی نہیں ہے۔"

سر اٹھا کر وہ چمک کر بولی پھر ایک دم ڈھیلی پڑتے ہوئے منہ لٹکا گئی۔

"بیٹا! یہ ظرف ہوتا ہے دوسرے کی اچھائی کو

قبول کرنے کا اور ہر شخص یہ ظرف نہیں رکھتا تم اپنا ظرف دکھاؤ اور جیسا وہ چاہتے ہیں ویسا کرو لیکن اپنا دل خراب مت کرو۔ وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ کچھ عرصہ بعد تمہیں بھی عادت ہو جائے گی اور انہیں بھی۔ تب تک حوصلے اور صبر سے یہ چھوٹی چھوٹی باتیں برداشت کرلو۔''

وہ اس وقت چونکہ دل برداشتہ تھی اس لیے انہیں ہمدردی کرنا مناسب نہیں لگا اگر وہ ذرا سی بھی لچک دکھا دیتیں تو بات بگڑ جاتی۔ ان کی سوچ کے بارے میں جان کر برا تو انہیں بھی لگا مگر تحمل سے وہ عنایہ کو بات کا دوسرا رخ دکھا گئیں۔

''دادی! رضا بھی کچھ نہیں کہتے اگر میں کچھ کہوں تو کہتے ہیں کہ میں گھر میں لڑائی جھگڑا نہیں چاہتا۔ میں نے کب کہا کہ لڑائی کریں مگر کم از کم میری حمایت میں دو بول تو بول دیں۔''

اتنے دنوں کے شکوؤں سے دل بھرا پڑا تھا۔ دھیرے دھیرے تمام شکایات باہر نکلنے لگیں۔

اس کی یہ بات سن کر دادی زور سے ہنس پڑیں جس پر عنایہ نے قدرے خفگی سے انہیں دیکھا تھا۔

''میری بھولی بٹی! اگر آج ان باتوں کو نظر انداز کرو گی تو سکھی رہو گی ورنہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں پھانس کی طرح دل میں چبھ کر دکھ دیں گی۔ یہ تو نئی زندگی کی شروعات کا چھوٹا سا مشکل پہلو ہے۔ اللہ تمہیں کسی بڑے امتحان سے بچائے۔''

انہوں نے اس کا ناراضی بھرا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لیا۔

''چلو اٹھو اب شاباش۔ اچھا سا ناشتہ بناؤ۔''

اس کا دھیان بٹانے کے لیے وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''بھئی مجھے تو حلوہ کھانا ہے وہ بھی آپ کے ہاتھ کا۔'' ان کے ساتھ چلتے ہوئے عنایہ نے فرمائش کی۔ دونوں کا رخ باورچی خانہ کی جانب تھا۔

''مجھ بوڑھی کی ہڈیوں کو تھکا دو تم۔'' خشمگیں نگاہوں سے گھورتے دادی نے کہا تو عنایہ زور سے کھلکھلا اٹھی۔

''ہاں میری شونا۔ آپ تھک کر بھی ہم سے زیادہ جوان اور حسین ہیں۔'' عنایہ نے کس کر ان کے گرد باہوں کا گھیرا ڈالا جس پر وہ جھینپتی اسے بے شرم کہہ گئیں۔

عنایہ کی مسلسل ہنسی صبح کے اجالے میں گھل کر اور بھی گونج رہی تھی۔ پیڑ کی شاخ پر بیٹھی توتی اور حمد و ثنا کرتی چڑیا نے اس بھرپور منظر سے خوب لطف اٹھایا تھا اور پھر اڑ کر کے اڑتی رزق کی تلاش میں نکل پڑی تھیں۔

☆☆☆

پھر یوں ہی ہوا تھا۔ وہ ہر دل شکن بات کو نظر انداز کرنے لگ گئی تھی آہستہ آہستہ ان کے رنگ ڈھنگ میں ڈھلتے کئی ماہ گزر گئے اور وہ عادی ہوتی چلی گئی اس ماحول اور اس کے ذائقوں کی...... بس کبھی کبھار جب کوئی بات زیادہ بری لگتی تو ایک دم دل افسردگی کی لپیٹ میں چلا جاتا جیسے آج وہ طبیعت خرابی کے باعث دودھ میں ضامن لگانا بھول گئی اور دہی نہ جما پائی۔

صبح اٹھ کر جو باتیں سننے کو ملیں وہ الگ مگر ہر آتے جاتے بندے کو اس کی ساس بہو کا کارنامہ مع پھوہڑ پن بتانا نہ بھولیں اس سے بھی دل نہ بھرا تو یہاں وہاں رشتے داروں میں فون کھڑکا کر خوب جی ہلکا کیا کہ کیسی نکمی بہو ملی ہے کچھ نہیں سکھایا ماں نے......

یہاں آکر اس کی برداشت ختم ہو جاتی تھی مگر پھر بھی وہ آنسو بہا کر رضا کو شکایت لگا بیٹھتی تھی جس پر اسے پیار سے سمجھاتے دلاسہ دیتے وہ گویا مرہم رکھ دیتا تھا۔

بڑے بھائی کی وجہ سے کچھ سال قبل جو جھگڑا گھر کے در و بام میں دراڑ ڈال گیا تھا محض اسی بد نظمی اور بدامنی کے باعث وہ اکثر ناجائز باتیں نظر انداز کر جاتا تھا اور عنایہ کو اپنے طریقے سے سمجھا بجھا کر قائل کر لیتا تھا۔

☆☆☆

وقت نے جب اپنی مخصوص رفتار سے گزرنا شروع کیا تو ہر چیز کو اپنے حساب سے اپنی لپیٹ میں لیتا گیا۔ نئے مہمان کا اضافہ ایک خوش گوار اضافہ ثابت ہوا۔ اس کی جیٹھانی چونکہ ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھی اس لیے گھر کا پہلا وارث ہونے کے ناتے عنایہ کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔

سارا دن طلحہ کے ساتھ مصروف رہتے وہ سب گلے شکوے بالکل بھول گئی تھی یا یوں کہنا درست ہوگا کہ وہ اب اس ماحول کی عادی ہو چلی تھی۔ طلحہ کے بعد حوریہ اور ایان کی پیدائش نے اسے بری طرح مصروف کر دیا۔

ساس شوگر کی مریضہ ہونے کے ساتھ دل کے عارضے میں بھی مبتلا تھیں۔ سسر کو عالم بالا پہنچے دو برس گزر چکے تھے۔ شزا کے بیاہ کو چوتھا سال تھا۔ ساس کی خدمت کے ساتھ بچوں کو سنبھالنے کا ہنر اسے بہ خوبی آ چکا تھا۔ کم عمر سیدھی سادھی عنایہ اب ایک مکمل ذمہ دار اور سمجھ دار خاتون میں بدل چکی تھی۔ شادی کا ابتدائی عرصہ جو اس نے بوجھل پن میں گزارا تھا اک خواب سا محسوس ہوتا تھا۔ کہیں وقت گزرے وقت کا مداوا ثابت ہوتا ہے تو کہیں گزرا وقت اپنی گہری چھاپ چھوڑ جاتا ہے تحمل اور برداشت سے وہ وقت کے اس چکر کو اپنی حمایت میں کر چکی تھی۔

کچھ عرصہ مزید گزرا تو ساس کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ یہ وقت کافی مشکل تھا۔ جیٹھ نے گھر بیچ کر اپنے حصے کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا تو رضا نے بنا کوئی بحث کیے ان کے حصے کے پیسے دے کر گھر اپنے نام کروالیا۔

بہنوں کے حصے کی رقم اس کے سسر اپنی زندگی میں ہی انہیں دے چکے تھے۔ زندگی اب اک بہاؤ میں چل پڑی تھی۔ بچوں کی تعلیم اور پرورش میں مگن وہ پرسکون زندگی کی چھاؤں تلے قیام پذیر تھی۔

صالح فرماں بردار اولاد نے اس کے دامن میں سکھ ہی سکھ بھر دیے تھے اور پھر وہ دن بھی پوری شان سے آیا تھا جو کبھی اس کی زندگی کا حسین اور اہم ترین دن رہا تھا۔

عائلی زندگی کی شروعات کا دن...... اپنے لخت جگر طلحہ اور نور نظر حوریہ کے بیاہ کے دن نیلی ساڑھی میں سادہ سا جوڑا کیے انتہائی باوقار انداز میں دو مہمانوں کی تواضع کے انتظامات میں مشغول تھی۔ ایان کی بار بار یہاں وہاں دوڑیں لگ رہی تھیں اکلوتی بہن اور بڑے بھائی کی شادی کے انتظامات نے اسے گھن چکر بنا ڈالا تھا

''ماشاء اللہ! کیا خوب گھر سنبھالا ہے طاہرہ کی چھوٹی بہو نے۔ کتنے فرماں بردار اور لائق بچے ہیں بھئی داد دینی پڑے گی اس کی پرورش اور سگھڑاپے کی، اللہ نے رضا کی قسمت میں ہیرا جڑ دیا۔''

سسرال کے وہی لوگ جو اسے پھوہڑ اور نکما گردانتے تھے آج ہر طرح سے کامیاب دیکھ کر داد دیے بنا نہ رہ سکے۔ پاس سے گزرتی عنایہ نے ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہوئے مسکرا کر اپنی تعریف کا لطف اٹھایا تھا اور فخر سے اپنے بچوں کی جانب دیکھا تھا۔ شادمانی اور سکون کا حسین امتزاج لمحات کو یادگار بنائے ہوئے تھا۔ بہترین کھانے کے بعد دولہا دلہن کی ڈھیر ساری تصاویر کا دور چلا اور پھر مہمانوں نے اگلے دن تک کے لیے رخصت چاہی، رات گئے تک گھر واپسی کے بعد روایتی رسومات سے فارغ ہوتے ہوتے خاصا وقت لگ گیا۔

بہو کو کمرے میں چھوڑنے کے بعد وہ تھکن بھرا وجود لیے کمرہ میں داخل ہوئی تو نیم دراز رضا کے چہرے پر اسے دیکھ کر مسکراہٹ در آئی۔

''اللہ نے کتنا کرم کیا ہے ہم پر۔''

چوڑیاں اتار کر میز پر رکھتے ہوئے عنایہ نے مڑ کر اپنے شریک حیات کو دیکھا۔

''ہاں بالکل! سب کچھ بہترین طریقے سے ہو گیا۔ شکر ہے اللہ کا۔'' شوہر کی تائید کرتے ہوئے اس نے سر ہلایا اور زیورات اٹھا کر ڈبوں میں رکھنے لگی۔

''تم نے طلحہ کی بیوی کو یہ کنگن کیوں نہیں دیے۔''
ڈبے میں سجے کنگن دیکھ کر رضا نے چونک کر کہا کیونکہ یہ کنگن خاص بہو کے لیے بنوائے گئے تھے۔
''میرا ارادہ بدل گیا ہے اب۔ یہ کنگن میں اپنی حوریہ کو دوں گی۔'' عنایہ کے کورے جواب پر وہ انگشت بدنداں رہ گیا۔
''حوریہ کے لیے تو ماشاء اللہ پہلے ہی بہت کچھ بن چکا ہے۔ یہ جس کے لیے ہیں اسی کو دو۔'' رضا کی بات پر اس کی پیشانی پر دو بل پڑے تھے۔
''اسے بھی بہت کچھ دیا ہے ہم نے اور اپنے میکے سے بھی بڑا کچھ لائی ہے وہ۔ یہ اتنے خوب صورت کنگن میں اس کے حوالے نہیں کروں گی۔ جانے کیا حشر کرے ان کا۔'' نخوت سے کہتے ہوئے وہ روایتی ساس کی مثل لگ رہی تھی جو بہو کے آتے ہی اس سے ان دیکھا بیر باندھ لیتی ہے۔
''یہ غلط ہے عنایہ! طلحہ نے اتنا اچھا کما کر تمہیں دیا ہے اور تم اس کی بیوی کو اچھی چیز دینے سے انکاری ہو۔ سنبل اب اس گھر کا فرد ہے بالکل حوریہ جیسی، ہے وہ۔'' رضا کو اس کی یہ بات بے حد ناگوار لگی۔
مگر وہ ہنوز بگڑے تاثرات لیے خاموشی سے زیورات رکھنے میں مگن رہی۔ اگلے روز طلحہ کا ولیمہ اور حوریہ کی بارات کی شان دار تقریب تھی جس نے پورے خاندان والوں کی چکاچوند --- کردیں۔ سارے انتظامات لاجواب تھے۔ مہنگا ہال اور اعلیٰ کھانا سب کو آنکھیں کھولنے پر مجبور کر گیا۔
حوریہ کے سسرال والے بھی خاص توجہ اور اہمیت پر مسرور دکھائی دے رہے تھے۔ رخصتی کا واویلا مچا تو گویا ساون کی برکھا برس اٹھی۔ رضا کی آنکھیں نم تھیں جبکہ ایان پوری شدت سے رو رہا تھا۔ طلحہ نے نم آنکھوں سے مسکراتے اسے خود میں بھینچا تھا۔ اکلوتی بہن کو پرایا کرنا قطعی آسان نہ تھا۔ عنایا سرخ آنکھیں لیے بار بار اس سے لپٹ رہی تھی۔ بمشکل خود کو سنبھالتے اپنے جگر کے ٹکڑے کو سسرال دوں کے حوالے کیا تھا، دل کٹ رہا تھا۔ آنکھیں چھلک رہی تھیں مگر لب مسلسل دعاؤں کا حصار قائم کیے ہوئے تھے، خوشی غم کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اسے نئے سفر کی شروعات پر روانہ کرکے وہ رضا کے کاندھے پر سر رکھ کر رو پڑی جبکہ وہ مسلسل حوریہ کی خوشیوں کا تذکرہ کرکے اسے چپ کروا رہا تھا۔
کتنی عجیب بات ہے ناں۔ مائیں خود بھی یہ وقت جھیل کر اس مقام تک پہنچتی ہیں مگر بیٹیوں کو رخصت کرتے ایسا لگتا ہے جیسے یہ وقت پہلی بار آیا ہو۔ وہ بھی اسی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ بیٹی کے خیال میں اس نے تمام رات سوتے جاگتے کاٹی تھی۔ پھر مکلاوے تک گھر میں خوب مہمانوں کی چہل پہل رہی۔ اس کے بعد ایک دم سناٹا چھا گیا
ایان روزمرہ کی طرح کالج جانے لگا۔ رضا اور طلحہ کی دفتر کی پریڈ شروع ہوگئی۔ وہ اور سنبل گھر میں اکیلے رہ گئے۔ اب تک تو وہ ماسی کے ساتھ مل کر خود ہی سارا کام کر رہی تھی مگر آج اس نے بطور خاص سنبل کو کہا تھا کھانا بنانے کے لیے...... بڑے دل اور محنت سے اس نے کھانا بنایا تھا۔
شام کو سب دسترخوان پر جمع ہوئے تو کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو محسوس کرکے طلحہ کے لب مسکرا اٹھے۔ اس نے محبت سے سنبل کی جانب دیکھا تھا جو خوشی خوشی کھانا لگا رہی تھی۔ پہلا نوالہ توڑ کر کھاتے ہی اس نے ابرو اچکا کر ستائشی اشارہ دیا تھا۔
عنایہ کی نظروں سے یہ مخفی نہ رہا تھا۔
سنبل تو نہال ہی ہوگئی تھی۔
''گوشت کچا ہے ابھی اور سالن میں نمک بھی کم ہے۔'' عنایہ کی بات پر اس کا کھلتا چہرہ ایک دم پھیکا پڑا تھا۔ طلحہ نے قدرے حیرت سے ماں کی جانب دیکھا جو اطمینان سے کھاتے ہوئے نقص نکال رہی تھیں۔
''مجھے تو اچھا لگ رہا ہے کھانا۔'' لاپروائی سے کندھے اچکا کر کھاتے ہوئے ایان نے کہا۔

''کھانا واقعی اچھا بنا ہوا ہے۔'' اب کی بار رضا نے لب کشائی کی۔

''جی بابا۔'' طلحہ نے تائید میں سر ہلا کر سنبل کی جانب دیکھا تھا۔ ان سب کے مکالموں پر وہ یکلخت بھڑک اٹھی تھی۔

''تو میں غلط کہہ رہی ہوں یا جھوٹ بول رہی ہوں۔'' تیکھے لب ولہجہ پر سنبل بوکھلا گئی۔

''نہیں امی! آپ صحیح کہہ رہی ہیں، گوشت واقعی تھوڑا سخت رہ گیا ہے۔ اگلی بار دھیان رکھوں گی۔'' سنبل کے بروقت جواب پر ماحول کا تناؤ کم ہوا تھا۔

رضا کی ملامتی نگاہوں کو پس پشت ڈال کر وہ اب سکون سے کھانا کھا رہی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ وقت دہرایا جا رہا تھا۔ برسوں پہلے جو جذبات اس کے تھے اب وہی سنبل لیے بیٹھی تھی مگر وہ بھول گئی تھی یا یوں کہنا مناسب ہوگا کہ ہر عورت کی طرح وہ بھی اپنی حاکمیت ختم ہونے کے جھوٹے خوف تلے دبی ہوئی تھی وہ کھوکھلا خوف جس نے اس کے حسین دن سمجھوتے کی نذر کیے تھے۔ اب سنبل کی زندگی میں رخنہ ڈالنے کو تیار بیٹھا تھا۔

☆☆☆

اتوار کا دن معمول کے کاموں سے ہٹ کر زیادہ مصروف تھا۔ ناشتے کے بعد کام والی نے عنایہ کے کہنے پر مشین لگائی تھی۔ سفید کپڑوں کو دھونے کی ذمہ داری سنبل کی تھی۔ نہایت احتیاط سے سفید کپڑے پہلے بنڈل میں ڈال کر اس نے دھوئے تھے اور سکھانے کے لیے ماسی کے حوالے کر دیے تھے۔ یہیں اس سے غلطی ہوئی تھی۔ ماسی نے رنگ دار جوڑے کے ساتھ سفید کپڑے پھیلا دیے تھے۔ طلحہ کی شرٹ پر پھیلا ہلکا نیلا رنگ پوری شرٹ بدنما کر گیا تھا۔ شام کو کپڑے اتروا کر اپنی نگرانی میں تہہ کرواتے ہوئے عنایہ کی نظر اس پر پڑی تو وہ بھڑک اٹھی۔

طلحہ کے آنے کا وقت تھا۔ خوب صورت جوڑا زیب تن کیے وہ شبنمی بالوں میں کنگھا کر رہی تھی، جب عنایہ کی تیز آواز پر یکلخت بوکھلا کر باہر نکلی۔ نکمے پن اور کام چوری کے ڈھکے چھپے طعنے سن کر اس نے سختی سے لب بھینچے تھے۔ ایسے دو چار باتیں سنا کر عنایہ تو کمرے میں چلی گئی تھی مگر وہ وہاں سے ہل بھی نہیں پائی تھی۔ ملازمہ کے سامنے ہتک کے احساس سے سیاہ رنگ آنکھوں میں کاجل ملا سرمئی پانی امڈ آیا تھا۔

طلحہ کی آواز پر اس نے سرعت سے آنسوؤں کو مٹانا چاہا تھا مگر پھیلا کاجل اور تازہ ٹھہری نمی آنکھوں پر ستم کا بھید کھول گئی تھی۔

''کیا ہوا ہے۔ روئی کیوں ہو۔''

بے چینی سے اس کی موہنی صورت کو ہاتھوں کے پیالے میں بھرتے ہوئے طلحہ نے پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلا گئی۔

''سنبل۔'' طلحہ کی بھاری پکار پر وہ دھیرے سے مسکرا دی

''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں امی اور عروہ (بہن) کو یاد کر رہی تھی۔'' اس کی اتنی توجہ اور خیال پر وہ شگفتگی سے بولی تو پیار سے اس کا سر تھپتھپا کر طلحہ نے چائے لانے کے لیے کہا۔

چائے بناتے ہوئے وہ مسلسل عنایہ کے تلخ رویے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اگلے روز شام میں حوریہ ملنے چلی آئی۔ ساتھ اس کا شوہر بھی تھا۔ کچھ دیر بیٹھ کر اس نے حوریہ کو رات رہنے کے لیے یہیں چھوڑا اور خود واپس چلا گیا۔ وہ شادی کے بعد پہلی بار کچھ دن رہنے کے لیے آئی تھی۔

سنبل اور حوریہ کی چونکہ اچھی خاصی بے تکلفی تھی اس لیے رات گئے تک جاگ کر دونوں نے جی بھر کر گفتگو کی۔ وہ دونوں لاؤنج میں بیٹھی سنبل کے ہاتھ کی بنی چائے پی رہی تھیں جب عنایہ آنکھیں ملتے ہوئے کمرے سے باہر آئی۔

''یہ کون سا وقت ہے گپیں لڑانے کا اور تم......''

انہوں نے سنبل کی جانب رخ کیا۔

''تمہارا شوہر اندر تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ کوئی

احساس ہے تمہیں۔" تیز لہجے میں انہوں نے [illegible] طرح سنبل کو ڈپٹا۔ حوریہ نے حیرت سے ماں [illegible] جانب دیکھا جو تلخی بھرے لہجہ میں مخاطب تھی۔

سنبل کا چہرہ شرم اور لہجے کے سرد وار یکلخت پھیکا پڑ چکا تھا۔

"امی! طلحہ بھائی ہمارے ساتھ ہی بیٹھے ابھی اٹھ کر گئے ہیں۔" حوریہ نے فوراً بھابھی [illegible] حمایت کی۔

"میں نے طلحہ سے اجازت لے لی تھی امی۔" سنبل نے بھی مدھم لہجے میں جواب دیا تو وہ خجالت مٹانے کو جلدی سے بولی۔

"اچھا اچھا چلو! اب بس بہت رات ہو گئی ہے۔" حوریہ نے کپ اٹھا کر باورچی خانہ کا رخ کیا اور سنبل نے اپنے کمرے کی جانب......

صبح کا اجالا اپنے ساتھ تفکر کی کئی شعاعیں کھینچ لایا تھا جو حوریہ کے چہرے پر واضح دکھائی دے رہی تھیں۔

اس کی سسرال سے واپسی کے بلاوے کی کال آئی تھی۔ ساس کی اچانک طبیعت خرابی نے اس کے میکے میں قیام کو موقوف کر دیا تھا۔ بجھے دل کے ساتھ تیاری کرتے ہوئے اس نے چنگھاڑتے ہوئے فون کو اٹھایا تھا جہاں اس کا شوہر شام کو لینے کے لیے آنے کا عندیہ سنا رہا تھا اور ساتھ پیار بھری معذرت اور توجیہات بھی پیش کر رہا تھا بے دلی سے فون رکھ کر وہ عنایہ کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

ان کی گود میں سر رکھ کر اس نے آنکھیں موند کر "امی" پکارا تھا۔ عنایہ کی حسیات یکلخت بے دار ہوئی تھیں۔

"کیا بات ہے۔ کوئی مسئلہ ہے۔ پریشانی ہے۔" اس کی پکار پر وہ بے ساختہ بولی تو حوریہ نے ہولے سے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا تھا۔

"عادل لینے کے لیے آرہے ہیں شام کو۔ امی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔" اس کے چھوٹے منہ پر ناراضی کے تاثرات رقم تھے جنہیں دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ عنایہ کے لبوں کو چھوئی۔

"پھر نہیں جانا چاہتی ہو کیا۔" اس نے حوریہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں جانا ہوتا تو اب تک عادل کو انکار کر چکی ہوتی اور میرے سسرال میں محاذ کھل ہو چکا ہوتا میرے خلاف....." حوریہ کی بات پر عنایہ نے چونک کر اس کے چہرے کو دیکھا۔

"آپ نہیں جانتیں امی! میری ساس اک روایتی ساس ہیں۔ بہوؤں پر گھر کے اصول من وعن لاگو کرنے والی۔ اپنا حکم چلانا اور جتانا خوب آتا ہے انہیں۔ ہر کام ان کی منشا کے مطابق ہوتا ہے مگر پھر بھی انہیں گلہ رہتا ہے۔ آپ نے پوچھا تھا ناں مجھ سے کہ میں نے زیور کیوں نہیں پہنے۔ میرے سارے زیور انہوں نے لاکر میں رکھے ہیں جنہیں صرف سسرالی شادیوں پر پہننا ہے اور پہن کر دوبارہ انہیں ہی لوٹا دینا ہے۔" استہزائیہ مسکرا کر بتاتے ہوئے وہ پھر سے آنکھیں موند گئی تھی۔ اس کے بالوں میں چلتا عنایہ کا ہاتھ تھم کر رہ گیا۔

"تم خوش نہیں ہو۔" عنایہ نے اندر کے خدشات دباتے ہوئے عام سے انداز میں پوچھا۔

"نہیں امی! ایسی بات نہیں ہے میں خوش ہوں۔ عادل بہت اچھے ہیں بس....." بات ادھوری چھوڑ کر حوریہ نے عنایا کی جانب دیکھا اس کی ادھوری بات کا مطلب جان کر عنایہ نے دھیرے سے سر ہلایا۔

"تغیر زندگی کا حصہ ہے اور اس تغیر کو اپنانا عورت کی خوبی ہے۔" انہوں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اسے تسلی دی۔ وقت آج سے کئی سال پیچھے چلا گیا تھا جب وہ بھی یونہی دادی کی گود میں سر رکھ کر اپنا جی ہلکا کر رہی تھی۔

"دل دکھتا ہے امی۔"

حوریہ کے منہ سے نکلے چند جملوں کا اداسی بھرا دکھ عنایہ کے دل کو جا لگا۔ اس نے جھک کر حوریہ کی پیشانی چومی تھی۔

''بھابھی بھی ایسے ہی ہرٹ ہوتی ہیں امی!''
ان کی گود سے سر اٹھا کر وہ سامنے بیٹھ گئی تھی۔
''یہ جو حاکمیت بھرے لہجوں کے وار ہوتے ہیں نان۔ یہ مار دیتے ہیں۔ جو کام نرمی سے ہوسکتا ہے اس کے لیے سختی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر آپ کسی عدم تحفظ کا شکار ہیں تو یہ خدشات نکال دیجیے دل سے۔ طلحہ بھائی آپ کے بیٹے ہیں اور رہیں گے۔ بہو اچھی مل گئی ہے تو اسے اپنی خوش قسمتی گردانیے اور قدر کیجیے۔ یہ پڑوس کی سلمیٰ خالہ جیسی بہو آ جاتی تو سوچیے کیسے دنگل ہوتے اس گھر میں.....'' کہتے کہتے آخر میں اس کا لہجہ شرارتی سا ہوگیا۔
عنایہ کے لبوں پر پل بھر کے لیے مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔
وقت کا پہیہ گھوم کر کئی سال پیچھے چلا گیا جب وہ بھی اپنی چھوٹی چھوٹی من مرضی والی خواہشات کو دبا کر رکھتی تھی اور تنے ہوئے رویے کے کرب کو جھیلتی تھی۔ نکتہ چینی گویا زندگی کا حصہ بن کر رہ گئی تھی۔ وہ شدت سے زندگی کے اس حصے سے نالاں تھی مگر سمجھوتے کی سل تلے دبی مجبور تھی۔ اک ٹھنڈی بے حد ٹھنڈی سانس اس نے کمرے کی معتدل فضا کے سپرد کی تھی۔ حوریہ اٹھ کر کمرے سے باہر جا چکی تھی۔ بستر سے نیچے اتر کر چپل پیروں میں ڈال کر اس نے بھی باہر کی راہ لی تھی
گھر کے در و بام پر دھیرے دھیرے سرمئی شام کی ردا پھیل رہی تھی۔ عادل کے آنے کا وقت تھا۔ حوریہ مکمل تیاری کے ساتھ لاؤنج میں موجود صوفے پر بیٹھی محو انتظار تھی۔ سنبل نے ابرو اچکا کر اس کی جانب مسکراہٹ اچھالی تو حوریہ نے گھور کر اس کی مسکراہٹ کا جواب دیا
''چائے تیار ہے حوریہ!'' سنبل نے شرارت سے کہا اسی اثنا میں داخلی دروازہ کی گھنٹی بج اٹھی۔
''چائے پینے والے بھی آ گئے ہیں۔'' حوریہ نے بھی اٹھلا کر اس کی شرارت کا جواب دیا اور دروازہ کھولنے چلی گئی۔ سنبل باورچی خانہ میں آئی تو عنایہ وہاں پہلے سے موجود تھی۔
''امی آپ کو کچھ چاہیے تھا۔'' اس نے چونک کر اس سے پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلا گئی۔ طلحہ اور عنایہ نے عادل کو اصرار کر کے رات کے کھانے کے لیے روک لیا تھا۔ کھانے کی تیاری عنایہ اکیلی کر رہی تھی۔ اس نے سختی سے سنبل کو باورچی خانہ میں داخل ہونے سے منع کیا تھا۔ وہ خاموشی سے سب کے بیچ آ کر بیٹھ گئی تھی۔ پھیکی سی مسکراہٹ لیے وہ سب کی باتوں کی سر ہلا ہلا کر تائید کر رہی تھی۔ کرکٹ۔ سیاست اور حالات حاضرہ پر تبصرہ ہو رہا تھا حوریہ نے بغور سنبل کا پھیکا پن دیکھا تھا اور پھر باورچی خانہ کی طرف دیکھ کر تاسف سے سر دائیں بائیں ہلا دیا تھا۔
موسم میں خنکی کے باعث جلد ہی اندھیرا چھا گیا تھا۔ عنایہ نے مغرب کی نماز کے بعد فوراً کھانا چن دیا۔ حوریہ خاموشی سے ساری کارروائی ملاحظہ کر رہی تھی۔ بنا کسی کی مدد لیے وہ تمام کام بڑی چابک دستی سے سرانجام دے رہی تھی۔ کھانے کے لوازمات دیکھ کر گھر والے یکلخت چونکے تھے۔ جتنا خوش ذائقہ کھانا دکھائی دے رہا تھا اس سے کہیں زیادہ سجاوٹ متاثر کن تھی۔ رضا کو ایک دم شادی کے اوائل ایام والی عنایہ یاد آ گئی۔ ماضی کی یاد کی ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی تھی
''آج تو کمال ہوگیا ہے امی!'' ایان نے وائیٹ ساس والا پاستا پلیٹ میں ڈال کر جلدی سے چمچ بھر کر منہ میں لیا۔ اس کے بے صبرے پن پر سب مسکرائے تھے۔
''آنٹی! کھانا بہت اچھا بنا ہوا ہے۔'' عادل نے بے ساختہ تعریف کی تو وہ مسکرا دی۔
''ابھی تم نے میری بہو کے ہاتھ کا بنا کھانا نہیں کھایا۔ سنبل اس سے بھی زیادہ لذیذ کھانا بناتی ہے۔''
ستائش تھی یا طنز......
سنبل نے جھٹکے سے سر اٹھا کر ساس کی جانب

دیکھا تھا وہاں نرم سی مسکراہٹ تھی یعنی یہ تحسین بھرے جملے تھے اس کا چلتا منہ رک گیا تھا۔ سب ایک دوسرے کے منہ کی جانب تک رہے تھے سوائے عادل کے جو مسکرا کر تعریفی انداز میں ابرو اچکا رہا تھا۔

''حوریہ کو بھی کچھ سکھا دیجیے گا۔'' شائستگی سے سنبل کو کہتے ہوئے اس نے شرارت سے حوریہ کی جانب دیکھا۔

''میں نے سیکھا ہے، اچھا!'' وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

''مگر بھابھی جیسا کھانا میں واقعی نہیں بنا سکتی۔'' حوریہ نے بھی دل کھول کر تعریف کی۔ سنبل جھینپ سی گئی۔

''پڈنگ بہت مزے کی بنی ہے۔'' کھانے سے فراغت کے بعد میٹھا کھاتے ہوئے عادل نے کہا۔

''اس لیے کیونکہ یہ میری بہو نے بنائی ہے۔'' سنبل کے لیے عنایہ کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

یہ پڈنگ اس نے دوپہر کو کھانے میں بنائی تھی طلحہ کو بہت پسند تھی مگر دوپہر میں صرف وہ حوریہ اور عنایہ تھیں اس لیے یہ فریج میں رکھی رہ گئی۔ خوش گوار حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے سنبل کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیر گئی۔ حوریہ تو گویا ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ طلحہ بھی اس قدر مثبت تبدیلی پر کندھے اچکا کر رہ گیا تھا۔ کھانے کے بعد حوریہ نے سب کے لیے چائے بنائی۔

آج سنبل بہت آرام سے بیٹھی تھی۔ چائے پی کر دونوں نے اجازت لی اور باہر نکل آئے۔

''حوریہ! میں پوری کوشش کروں گا کہ امی کی جانب سے تمہاری حق تلفی یا دل آزاری نہ ہو۔'' گاڑی ریورس کرتے ہوئے عادل نے پورے خلوص سے کہا۔ اس کی بات پر حوریہ کا سر اثبات میں ہل گیا۔

ساس اور بہو کے اس مثبت اور خوش گوار رویہ نے عادل کو بہت [illegible] سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ گھر جنت یوں ہی نہیں بن جایا کرتے۔ انہیں جنت بنانے کے لیے ''ماں'' کی قبریں بنتی ہیں۔ کسی بھی تعلق کی خوب صورتی کا انحصار ایک دوسرے کی رائے اور پسند و ناپسند کے احترام سے جڑا ہوتا ہے جہاں ہم اپنی مرضی مسلط کرتے ہیں وہاں تعلق کو گرہن لگا دیتے ہیں۔

لاؤنج کے در و بام سے قہقہے پھوٹ رہے تھے۔ سب مل کر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ سنبل کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے وہ خاصی پرسکون اور مسرور دکھائی دے رہی تھی۔

''آج تو بڑے چشمے پھوٹ رہے ہیں ادھر سے محبت کے.....'' ایان نے عنایہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے چھیڑا تو وہ اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورنے لگی۔

''آج تو لوگوں نے باورچی خانہ میں تہلکہ مچایا ہے۔'' رضا نے بھی شرارت میں حصہ لیا

''سرپرائز دینا تھا بھئی ویسے بھی یہ کھانا میں نے اپنی بہو کے لیے بنایا ہے۔''

سنبل کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے نرمی سے بتایا وہ تو نہال ہی ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر بکھرے معصوم سے خوشی کے رنگوں میں عنایہ کو اپنا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

حوریہ کے چند جملوں نے اسے یکلخت جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ اسے وہ عورت نہیں بننا تھا جو اپنے تخت کے چکر میں کسی دوسری عورت کے بخت کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ضبط کر لیتی ہے۔

حال کا تازہ جھونکا مستقبل کے در سے آیا تھا اور ماضی کی تمام گرد اپنے ساتھ اڑا کر لے گیا تھا۔ چہرے پر پھیلی ہلکی مسکان کو بھرپور مسکراہٹ میں بدلتے ہوئے وہ پھر سے اپنی بہو کے ساتھ محو گفتگو ہو گئی تھی۔



انتباہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر "آفیشل پیج" کی اصطلاح استعمال کررہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اورکہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کرکے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کررہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کردیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

Prevention of Electronic Crimes Act 2016

اور

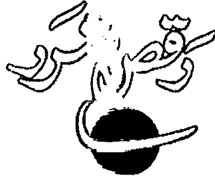
Copyright Ordinance 1962 / 2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

خواتین ڈائجسٹ | ماہنامہ شعاع
ماہنامہ کرن | عمران ڈائجسٹ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

فائزہ [illegible]ین



بیلا نے سنگنگ کمپیٹیشن میں حصہ لیا اور جیت گئی۔ [illegible]ں گھرانے سے تعلق رکھتی تھی وہاں اس کی اجازت نہ تھی۔ اپنے نانا کا خواب پورا کرنے کے لیے وہ اس میں حصہ لیتی ہے۔ جب ان کو پتا چلتا ہے تو وہ اپنی بیٹی کا سوچ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک مشہور موسیقار ہیں۔

قاری عبدالوہاب صاحب ملک گیر شہرت کے حامل تھے انہیں قاری عبدالباسط کا شاگرد ہونے کی وجہ سے مصر میں بھی پذیرائی حاصل تھی۔

مکمل ناول

مایا ئیلا کے گھر فون کر کے بتا دیتی ہے کہ اس نے موسیقی کے پروگرام میں حصہ لیا ہے۔ اس کے گھر میں بھونچال آ جاتا ہے لیکن ابا بہت خوش ہوتے ہیں۔
ئیلا کی خالہ اور کزن میشا بھی بہت خوش ہوتے ہیں وہ خود بھی موسیقی کی دنیا سے وابستہ ہیں۔
تقسیم سے پہلے تارا سنگھ اور امانت علی کے گھر آمنے سامنے ہوتے ہیں دونوں کو موسیقی سے لگاؤ ہے۔ دونوں گھرانوں کے لوگ مغل دربار میں گا کر داد وصول کرتے تھے۔
تارا سنگھ اور امانت علی کے درمیان گائیکی کا مقابلہ ہونا ہے دونوں اس کی تیاری کرتے ہیں۔

دوسری قسط



"ما گھ چل رہا ہے ابھی، کیا خیال ہے، چیت یا پھاگن میں امانت اور تارا کا مقابلہ نہ رکھوا دیا جائے۔" وہ اس وقت جگجیت سنگھ کے گھر میں تھے۔ شاگرد ریاض کر کے ابھی ابھی نکلے تھے۔ جب شوکت علی نے جگجیت سنگھ کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

تین سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ مگر امانت علی اور کرتار سنگھ کے مقابلے کی بات نہیں بھولا تھا۔ بلکہ جوں جوں وقت گزرتا تھا لوگوں کی بے تابی بڑھتی تھی۔ پورے دہلی شہر میں اس وقت ایک بھی ایسا فرد نہ تھا۔ جو موسیقی کا ذوق رکھتا ہو اور اس مقابلے کا منتظر نہ ہو۔

اس عرصے میں امانت اور تارا دونوں ہی نوجوان موسیقار اور گلوکار کے روپ میں ابھرے تھے۔ تارا پندرہ برس کا تھا جبکہ امانت کو تیرہواں لگا تھا۔ مگر کہنے والے کہتے تھے کہ انہوں نے فن کے میدان میں تیس، تیس سال سے ریاض کرنے والے موسیقاروں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

دونوں ہی نے نیا راگ بنایا تھا اور دونوں ہی نے اسے عام نہیں کیا تھا۔ اور ان کا بنایا گیت باہر کی دنیا میں تو کیا، دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کو بھی نہیں سنایا تھا۔

"کس سوچ میں پڑ گئے۔"

جگجیت کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر شوکت علی نے انہیں متوجہ کیا۔

"سوچ رہا ہوں، تارا ابھی تھوڑا کچا ہے۔ کچھ وقت مزید لے گا ابھی، چیت تو قریب ہی ہے۔"

"تو پھر......؟" شوکت علی نے ابرو سوالیہ انداز میں اٹھایا۔

"ساون یا بھادوں ٹھیک رہے گا۔" جگجیت نے پر سوچ انداز میں انہیں دیکھا۔

"یہ تو تقریباً چھ ماہ کا عرصہ بنتا ہے۔" شوکت علی حیران ہوئے تھے۔

"ہاں، مگر...... تارا کو کچھ وقت چاہیے۔" جگجیت سنگھ کا اصرار قائم تھا۔

"ٹھیک ہے پھر، ساون کر لیتے ہیں۔

کیوں......؟" شوکت علی مان گئے تھے۔

"ٹھیک ہے...... لگتا ہے، امانت میاں کی تیاری پکی ہے۔ مقابلے کے بعد شیرینی بانٹنا آپ کو ہی سجے گا۔"

جگجیت سنگھ مسکرائے تھے۔

"تارا کم ہے کسی سے کیا۔ سنا ہے ویرانوں میں جا کر جب اپنا راگ گاتا ہے تو دور دیس کے پرندے بھی سننے کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

"ہاہاہا......" جگجیت سنگھ کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"رائی کا پہاڑ بنانے والوں کی کوئی کمی ہے دہلی میں ہم نے بھی تو سنا ہے کہ امانت نے ایسا اچھوتا راگ بنایا ہے کہ سننے والوں پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ اداسی کا مرض کہیں اور بھاگ جاتا ہے۔ دل خوشی سے بھر دینے والا راگ، کیا ایسا ہی ہے۔"

"ہاہاہا۔" جگجیت کے سوال پر شوکت علی کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"ارے رائی کا پہاڑ بنانے والوں کی کوئی کمی ہے کیا۔"

شوکت علی کے جواب پر دونوں دوستوں کا قہقہہ پورے گھر میں گونجا تھا۔

☆☆☆

اور یہ سن تھا 1947 کا، مہینہ تھا ساون امانت علی اور تارا سنگھ کے متوقع مقابلے کی گونج دور دور تک سنائی دیتی تھی۔ بھادوں کی تین یا چار یعنی یکم شوال، اب وہ تین بنتی یا چار مقابلہ اسی دن ہونا تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی عید منانے کا اہتمام کرتے تھے اور احترام رمضان بھی۔

مقابلے کی رات منتخب ہو گئی تھی۔ پنڈال کا انتخاب بھی کر لیا گیا تھا۔ انتظامات جاری تھے۔ مگر ایک عجیب بات ہوئی تھی جانے کیسے مگر یہ مقابلہ دو موسیقاروں کے بجائے مسلم موسیقار اور غیر مسلم موسیقار کا مقابلہ بن گیا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مقابلے کی رات موسیقی کے متوالے اکٹھے ہوتے۔ دو

موسیقاروں کو سنتے، لطف اندوز ہوتے اور جس کا راگ پسند آتا اسے داد دیتے گھروں کو روانہ ہوتے۔

مگر جو ایک ہندو مسلم فسادات کی ہوا چل پڑی تھی۔ اس نے ادھر بھی ایک عجیب ماحول بنا دیا تھا۔ مسلمان امانت علی کو فاتح دیکھنا چاہتے تھے تو ہندو اور سکھ تارا سنگھ کو جتوانے کے لیے مرنے، مارنے پر اتر آئے تھے۔

شوکت علی اور جگجیت سنگھ اسی ساری صورت حال سے پریشان سے ہو گئے تھے۔ اگر فساد ہوتا جیسا کہ اندیشہ تھا تو بھاری نقصان اٹھانا پڑ سکتا تھا۔ اس ساری صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے جگجیت سنگھ نے دبے انداز میں مقابلہ رکوانے کی بات کی تھی، مگر تارا سنگھ آڑے آ گیا تھا۔ پہلے ہی اکثر لوگ تارا کے مقابلے میں امانت علی کے جیتنے کی پیش گوئی کر رہے تھے۔ اب اگر مقابلہ رکوانے کی بات ان کی طرف سے کی جاتی تو بڑی سبکی اٹھانی پڑ سکتی تھی۔ لوگوں کی زبان کوئی روک سکا ہے بھلا۔ اگر جو کوئی کہہ دیتا کہ ہارنے کے ڈر سے مقابلہ جان بوجھ کر رکوایا گیا ہے تو...... ورنہ ایسے مقابلے تو اکثر موسیقاروں کے درمیان ہوتے رہتے تھے پہلے تو کبھی فساد نہیں پڑا تھا۔ بلکہ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ ہندو موسیقار کو مسلمان تماش بین داد دیتے۔ تو کبھی مسلم کو ہندوؤں کی طرف سے پسندیدگی کی سند ملتی تھی۔ مذہب دیکھ کر تو کبھی داد ملتے نہیں دیکھا گیا تھا۔

جو جگجیت سنگھ کی فراست دیکھ رہی تھی، وہ تارا کی سوچ سے بھی پرے کی بات تھی۔

اور یہ مقابلے سے دو تین دن پہلے کی بات تھی بھادوں کی ایک اور اگست کی سولہ جب جگجیت سنگھ نے شوکت علی کے دروازے پر دستک دی۔ رات جو بن پر تھی۔ کچھ ہی سمے گزرے۔ پھر سحری کے لیے مسلمان اٹھنے لگتے۔ لگتا تھا وہ جو بات کرنا چاہتا ہے وہ راز داری کی متقاضی تھی۔ جب ہی تو اس نے ان کے سحری کے لیے اٹھنے کا انتظار نہیں کیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چوکیدار نے بڑے سے منقش گیٹ کی چھوٹی کھڑکی کھول کر جھانکا اور جگجیت سنگھ کو دیکھ کر چونک پڑا۔

''آپ......؟ اس وقت......؟''

اس نے دروازہ کھولتے ہوئے بے ساختہ سوال کیا تھا۔ لیکن جگجیت نے جیسے اس کا سوال سنا ہی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے دیوان خانے کی طرف بڑھ گیا۔ جیسے اسے پتا تھا کہ ملازم شوکت علی کو خبر کر دیں گے۔ اور تھوڑی دیر بعد شوکت علی اس کے روبرو تھا۔

جگجیت اسے دیکھ کر بے ساختہ اس کی طرف بڑھا۔

''شوکت یہ مقابلہ نہیں ہو سکے گا اب۔'' اس نے شوکت علی کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''کیوں......؟'' شوکت کی نظروں میں حیرت ابھری۔

''کیا تارا ابھی بھی تیار نہیں ہے؟'' اس کا پہلا خیال تارا سنگھ کی طرف گیا تھا۔

''نہیں...... جو میں دیکھ رہا ہوں۔ وہ تمہیں دکھائی کیوں نہیں پڑتا۔ تم جانتے ہو امانت جیتے گا۔ میں بھی جانتا ہوں۔ بلکہ شاید آدھا دہلی جانتا ہے یہ بات۔ مگر...... مگر اس کے بعد۔''

وہ ایک پل کو رکا۔

''حالات دن بہ دن بگڑتے جا رہے ہیں۔ بات اب میرے بس کی نہیں رہی۔'' جگجیت سنگھ مضطرب تھا۔

''کھل کے بات کرو جگ جیتے'' شوکت نے اس کے ہاتھ ہولے سے تھپکتے ہوئے کہا۔

جگجیت نے ایک نظر اسے دیکھا۔ پھر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑا لیا۔

''بڑی پکی خبر ملی ہے۔ تم لوگوں کو مارنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ پرسوں حملہ کرنا چاہتے تھے، مگر پھر بات مقابلے کی رات تک ٹل گئی۔''

اس نے گہری سانس بھری، اور ہکا بکا کھڑے شوکت علی کو ایک نظر دیکھا۔

''اب مقابلہ میں تم جیتو یا ہارو، تمہیں مارنے کا فیصلہ ہو گیا ہے۔'' کہتے کہتے اس نے رخ موڑ لیا۔

جیسے شوکت کا سامنا کرنا مشکل ہو۔
"تمہیں مارنے اور۔" کہتے ہوئے اس کی آواز کانپی، جیسے بات کرنی مشکل ہو۔
"ہاں......اور......" شوکت نے اسے بولنے کے لیے اکسایا۔
"اور میں کچھ نہیں کرسکوں گا۔ سوائے اس کے کہ تمہارے ساتھ اپنی جان بھی دے دوں گا۔"
وہ جیسے کچھ کہتے کہتے رکا اور بات بدل دی تھی۔
"بات کچھ بچی نہیں، تم ابھی بھی کچھ چھپا رہے ہو۔"
جب ہارنے پر بھی موت اور جیتنے پر بھی موت تو پھر مقابلہ نہ کرنے سے کیا حاصل؟"
جگجیت نے رخ موڑ کے شوکت کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ دہکتی ہوئی۔
"میری بات غور سے سنو۔" اس نے شوکت کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔ "ملک بٹ چکا ہے۔ ہر طرف مسلمانوں پر حملے ہو رہے ہیں ہم لوگ بھی محفوظ نہیں ہو۔ صرف مقابلے کا انتظار ہو رہا ہے۔ اس کے بعد سب ختم، تم چپ چپاتے بھرجائی اور بچوں کو لے کر پاکستان کی طرف نکل لو، میں نے سارا بندوبست کر دیا ہے۔"
شوکت نے ایک پل کو ٹھہر کر جگجیت کو دیکھا۔ اس کی سچائی اور خلوص شبہ سے بالاتر تھا۔ وہ اگر رات کے اس سمے یوں چھپ کر آیا تھا تو بات واقعی سنگین تھی۔ اور اس سے کہیں زیادہ جتنی وہ بیان کر رہا تھا۔ فسادات کی خبریں انہیں بھی مل رہی تھیں۔ مگر...... پر اگر جگجیت کہہ رہا تھا تو وہ واقعی محفوظ نہیں تھے۔
"ٹھیک ہے، میں پھر تیاری کرتا ہوں۔ تم مجھے......" شوکت کچھ کہتے کہتے رکا اور جگجیت کی نظروں کے تعاقب میں پیچھے دیکھا۔
وہاں امانت کھڑا تھا۔

☆☆☆

تیرہ سالہ امانت علی شدید ہیجان کا شکار تھا۔ اس
، مقابلے سے پھرنے اور ان کے ساتھ پاکستان
جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ جگجیت اور شوکت
لاکھ سمجھانے کے باوجود اس کی ایک ہی رٹ تھی۔
"مقابلے سے بزدلوں کی طرح پیٹھ پھیر کر نہیں
بھاگے گا۔ اس کے غصے میں کمرے سے جانے کے
بعد آخر شوکت علی نے بھی جانے سے انکار کر دیا تو
بت پھٹ پڑا۔
"یہاں رکنے کا مطلب صرف جان خطرے میں ڈالنا نہیں، بات اب عزت پر آ گئی ہے۔"
"کیا مطلب؟" شوکت علی کے چہرے کا رنگ اڑا تھا۔
"مطلب تمہیں اور امانت کو مارنے کے بعد بھرجائی اور بچیوں کو۔"
جگجیت کی آواز کانپی اور وہ رک گیا۔ آگے کچھ کہتے اس کی زبان جلتی تھی۔
شوکت کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔
امانت علی اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اسے جان سے پیارا تھا، تو دونوں بچیاں بھی کم عزیز نہیں تھیں، وہ ان کی جان تو امانت پر وار سکتا تھا۔ مگر عزت......"
"ہاں یہ سودا مشکل تھا اس کے لیے...... بہت مشکل...... مقابلے کو یونہی ادھورا چھوڑنا ہی تھا۔ شاید قدرت اس مقابلے کو کسی اور وقت کسی اور زمین پر کروانا چاہتی تھی۔ اس نے سوچنے میں لمحہ لیا تھا۔
"ہم جائیں گے، تم بتاؤ تم نے کیا انتظامات کیے ہیں۔" شوکت کی بات سن کر دروازے کے قریب کھڑے اندر کی سن گن لیتے امانت علی کو دھچکا لگا اور وہ آنکھوں میں آنسو لیے وہاں سے ہٹ گیا تھا۔
جب جگجیت، شوکت کو سارے انتظامات بتانے کے بعد وہاں سے جا رہا تھا تو دور کہیں سحری کے لیے جگانے والوں نے ڈھول پیٹنے شروع کر دیے تھے اور امانت کو لگا، ڈھول کی دھمک اور اس کے دل کی دھڑکن ایک تال دے رہے ہیں۔
"دھک دھک، دھناک......"

☆☆☆

امانت کی آنکھوں سے لاوا ابل پڑا تھا۔ شوکت نے اس کی کوئی بات سننے سے انکار کر دیا تھا اور عالم آرا کو سختی سے صرف ضروری اشیاء اکٹھی کرنے کو کہا تھا۔ صرف آج کا دن تھا۔ ملازموں تک سے راز داری کی شرط تھی۔ ایسے میں عالم آرا نے سونے کے زیورات ہی اٹھائے تھے۔ اور اپنا، نور جہاں، جہاں آرا، شوکت اور امانت کا ایک ایک سوٹ، اور پرکھوں کی کتنی ہی چیزیں تھیں۔ جنہیں وہ دیکھتی تھی اور انہیں چھوڑنے کا دکھ اس کے اندر ہوتا تھا۔ مگر وقت ایسا آن پڑا تھا کہ مال اور جان میں سے صرف ایک چیز بچ سکتی تھی۔ اور اس نے مال اپنی اولاد کی جان پر وار دیا تھا۔

مگر...... امانت، اسے کسی کل چین نہ تھا اور اس کی آنکھوں سے لاوا ابلتا تھا۔ اسے پتا تھا یہ سب جگجیت اور تارا سنگھ کی سازش تھی۔

وہ جانتے تھے کہ وہ کبھی اس سے جیت ہی نہیں سکتے۔ تو انہوں نے یہ چال چلی اور ابا جان ان کی چال میں آگئے۔ اسے یاد آرہا تھا کیسے اس کے گائیکی کے ایک ایک انداز کی کرتار سنگھ (تارا) نقل اتارتا تھا اور اتنی بار دہراتا کہ اکثر لوگوں کو لگتا کہ وہ تارا کا ہی انداز ہے۔ جبکہ وہ ایک یا دو بار کے بعد اپنے ہی انداز کو دہرانا پاپ جانتا تھا۔

یوں اس کے اکثر گیت تارا سنگھ کے نام سے جانے جاتے۔ تارا اکثر اس سے معذرت بھی کرتا تھا۔ مگر وہ پرواہ بھی نہیں کرتا تھا۔

''تمہارا کہیں یا میرا کہیں، بات تو ایک ہے تم اور میں الگ الگ ہیں کیا۔''

وہ مسکراتا تو تارا کی آنکھیں بھی جگمگا جاتی تھیں۔

''ہاں، بات تو ایک ہے۔'' وہ بھی اس سے فوراً متفق ہو جاتا تھا۔

شوکت علی بھی یہ بات جانتے تھے۔ جب ہی اس رات انہوں نے امانت علی کا وہ راگ سنا، تو اسی وقت اس سے کہا تھا۔

امانت کی آنکھوں کے آگے وہ منظر لہرایا۔

وہ اور عالم آرا، امانت کے سامنے دوزانو، بیٹھے تھے اور دونوں کی آنکھوں میں بیٹے کی کامیابی پر خوشی کے آنسو تھے۔ جب شوکت نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''جب تک تمہارا اور تارا کا مقابلہ نہیں ہو جاتا۔ تم یہ کسی کو نہیں سناؤ گے، تارا کو بھی نہیں۔''

''مگر ابا جان......'' امانت علی الجھ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سوال لہرایا مگر شوکت علی کے ہاتھ کے دباؤ نے اسے کچھ کہنے سے باز رکھا۔

''جی...... جیسے آپ کا حکم۔''

وہ مؤدب انداز میں یہی کہہ سکا۔

''اور اس کا ریاض تم تہہ خانے میں کرو گے تاکہ کسی کو آواز سنائی نہ دے۔ سمجھ گئے۔''

''جی۔'' امانت علی یہی کہہ سکا تھا۔

''تو کیا اب وہ اپنا راگ ہمیشہ چھپ کر گاتا رہے گا۔ کسی کو نہیں سنائے گا۔''

''نہیں، وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ باقی گھر والے جاتے ہیں تو جائیں۔ مگر وہ مقابلہ کیے بنا، پاکستان نہیں جائے گا بھی نہیں اور......''

اب وہ گھر بھی نہیں جائے گا۔ اگر ابا اور اماں جان اسے زبردستی ساتھ لے گئے تو وہ یہ دو تین دن یہیں کسی دوست کے گھر گزار لے گا۔ مقابلے کی رات تک روپوش رہے گا۔ مقابلے کی رات میدان میں جائے گا اور اس کے بعد پاکستان چلا جائے گا۔ وہ تیزی سے اپنے ایک راز دار دوست کے گھر کی طرف جاتے ہوئے یہی سوچ رہا تھا اور اس کے سینے میں آگ دہکتی تھی اور آنکھیں لاوا اگلتی تھیں۔

☆☆☆

''کچھ اچھی خبر نہیں ہے امانت۔''

امانت علی اپنے دوست کے گودام میں دو دن سے چھپا ہوا تھا۔ اور اس کا دوست رات کو آکر اسے دن بھر کی روداد سناتا تھا، اسی سے کل امانت کو پتا چلا تھا کہ اس کے والدین اور دونوں بہنیں گھر چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ ایسا ہوگا مگر پھر بھی

اسے دکھ ہوا تھا۔ اب پتا نہیں وہ ان سے کب مل پاتا اور مل بھی پاتا یا نہیں۔ مگر آج پریم چند آیا تو اس کا چہرہ فق تھا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' امانت چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''تمہارے گھر پر بلوائیوں نے حملہ کر دیا۔ سب کچھ لوٹ لینے کے بعد گھر کو آگ لگا دی۔ اب تمہارے گھر کے بجائے وہاں ایک جلا ہوا کھنڈر ہے اور۔'' وہ ایک پل کو رکا۔

کچھ کہنے کی کوشش میں امانت کے ہونٹ کانپے، مگر اس کی آواز نہ نکلتی تھی۔ اور وہ ایک ٹک پریم چند کو دیکھتا تھا۔

''اور حملہ کرنے والوں میں تارا سنگھ اور اس کے پتا بھی شامل تھے۔''

''کیا؟'' امانت کا رنگ فق ہوا تھا۔

تو کیا انہوں نے دھوکا کیا تھا۔ ابا میاں، اماں اور دونوں بہنوں کو با حفاظت پاکستان پہنچانے کا ذمہ جگجیت چاچا نے لیا تھا۔ اگر انہوں نے دھوکا کیا تھا۔ تو پھر اس کے گھر والے......

اس سے آگے کچھ سوچنا اس کے لیے محال ہوا تھا۔ مارے بے چینی کے اس کا بیٹھنا دوبھر ہو گیا۔ وہ فوراً داخلی دروازے کی طرف لپکا، پریم چند نے اس کا بازو پکڑ کر اسے بمشکل اندر دھکیلا۔

''تمہارے ادھر جانے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ اگر باہر کسی نے تمہیں دیکھ لیا تو تمہاری جان بچنا مشکل ہے۔''

''مگر...... میرے ابا میاں، اماں......''

''اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''وہ نکل گئے تھے وہاں سے پہلے ہی، میں بتا چکا ہوں تمہیں۔''

پریم چند نے ناقابل فہم انداز میں اسے دیکھا۔

''بھگوان نے چاہا تو وہ خیریت سے ہوں گے۔ آج مقابلے کی رات ہے۔ تمہارے کہنے پر ہم نے ہر جگہ اشتہار لگوا دیے ہیں کہ امانت مقابلے میں حصہ لینے آئے گا۔ ورنہ تارا اور جگجیت چاچا نے تو تمہارے روپوش ہونے کا اعلان کر کے مقابلہ ختم کر دیا تھا۔ اب تم صبر سے کام لو، آج یہ مقابلہ جیت کر تم پاکستان جانے والے کسی قافلے میں شامل ہو جانا۔ بھگوان نے چاہا تو تمہارے گھر والے تمہیں پاکستان میں مل جائیں گے۔''

پریم چند نے بمشکل سمجھا بجھا کر اسے باہر جانے سے روکا تھا اور مقابلے میں جانے کے لیے تیار کیا تھا۔

اور کچھ دیر بعد وہ اور پریم چند رات کے اندھیرے میں پنڈال روانہ ہو گئے تھے۔

☆☆☆

امانت نے کراہتے ہوئے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ کچھ پل لگے تھے پھر اس کی آنکھیں اردگرد پھیلے اندھیرے سے مانوس ہونے لگیں۔ اور اس نے دیکھا وہ کسی خالی ڈھنڈھار کمرے کے وسط میں فرش پر پڑا تھا۔ کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ ایک طرف سیڑھیاں اوپر کو جا رہی تھیں جن کا اختتام ایک دروازے پر ہو رہا تھا ''شاید'' نہیں بلکہ یقیناً وہ ایک تہہ خانہ ہی تھا۔ اس نے کھڑا ہونے کی کوشش کی مگر اس کی ٹانگوں نے اس کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا تھا۔

وہ کھسکتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اور ایسا کرتے ہوئے اسے اپنی پوری توانائی صرف کرنی پڑی تھی۔ مارنے والوں نے اسے ختم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ تو پھر وہ یہاں تک کیسے پہنچا۔ انہوں نے اسے جان سے مارنے کے بجائے یہاں کیوں قید کر ڈالا تھا۔ کیا اس راگ کو سننے کے لیے کیوں کہ وہ ابھی تک امانت کے سینے میں کسی راز کی طرح دفن تھا۔

مقابلے کی رات گزر چکی تھی۔ مگر اسے وہ راگ گانے کے لیے پنڈال تک پہنچنے ہی نہیں دیا گیا تھا۔ وہ اور پریم چند پنڈال سے کچھ ہی فاصلے پر تھے

تب کچھ، لٹھ برادروں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا، اور ان کے ہاتھ تب تک چلتے رہے تھے جب تک ان کی چیخیں، کراہوں اور پھر خاموشی میں نہ ڈھل گئیں۔ پتا نہیں پریم چند کدھر تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا مگر، پریم چند کہیں نہیں تھا۔

یہ بقاء کی جنگ تھی وہ ایک بار پھر سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور رفتہ رفتہ کھسکتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ مگر دروازہ شاید باہر سے بند تھا یا پھر امانت میں اتنا زور نہیں بچا تھا کہ وہ لکڑی کے اس بھاری منقش دروازے کو دھکیل کر کھول سکے۔ تب ہی دور سے آنے والی آوازوں پر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔''
آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔

''کاش کہ امانت وہ راگ مجھے سنا دیتا۔'' یہ تارا سنگھ کی آواز تھی۔

''بڑا ضدی ہے، بالکل اپنے باپ پر پڑا ہے مر جائے گا مگر راگ نہیں سنائے گا۔'' یہ چاچا جگجیت سنگھ کی آواز تھی۔

امانت کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ تو کیا اس پر حملہ انہوں نے کروایا تھا۔ پھر......''

اسے حملہ آوروں سے بچا کر انہوں نے یہاں چھپایا تھا۔ اس خیال نے اس کے مردہ تن میں جیسے جان ڈال دی تھی۔ مگر......''

تارا سنگھ کی آواز نے جیسے اس کی رگوں سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ یہ جان جانے کا خوف نہیں تھا جس سے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا تھا۔ یہ ایک دوست کی بے وفائی تھی جس نے کچھ پل کے لیے اس کی آنکھوں کی بینائی چھین لی تھی۔ وہ اگر دروازے سے ٹیک نہ لگا لیتا تو لڑھکتا ہوا نیچے جاتا۔

تارا سنگھ نے کہا تھا۔

''وار سر پر کرنا، اور دھیان سے پہلے ہی زخمی ہے، نہیں چاہتا کہ اسے زیادہ تکلیف ہو۔ بس کام بھی ہو جائے اور اسے پتا بھی نہ چلے اور کیا ہی اچھا ہو کہ اسے ابھی ہوش ہی نہ آیا ہو۔''

آوازیں اب قریب آتی جا رہی تھیں۔ وہ شاید اب دروازے کے بالکل قریب آ گئے تھے۔ جس سے ٹیک لگائے بیٹھا وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا کسی نے دروازے کو کھولا اور امانت لڑھکتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے گرا تھا۔

☆☆☆

بیلا خاموش ہوئی تو جیسے ایک فسوں ٹوٹا تھا۔ مایا یوں چونکی جیسے گہری نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ اسے یوں لگا جیسے وہ وقت کے سفر پر نکلی تھی اور 1947ء سے ایک بار پھر واپس حال میں لوٹی۔

''پھر......امانت سر پاکستان کیسے پہنچے؟''

اس نے حیرت بھرے انداز میں بیلا اور بیشا کو دیکھا۔

''بس انہیں ہوش آیا تو وہ پاکستان جانے والے ایک قافلے کے ساتھ تھے۔ جس کی حفاظت بلوچ رجمنٹ کے سپاہی کر رہے تھے۔ یوں وہ بحفاظت پاکستان پہنچ گئے۔ وہاں ایک کیمپ میں قیام کے دوران ان کے جسم کے زخم تو بھر گئے مگر جو زخم دل پر لگا تھا، وہ آج بھی رستا ہے۔''

بیلا نے گہرا سانس لیا۔

''اور تمہارے نانا جان کے والدین اور بہنیں......وہ لوگ......؟''

مایا جیسے ایک پل میں سب جان لینا چاہتی تھی۔

''ہاں، وہ بھی بخیریت پاکستان پہنچ گئے تھے اور نانا جی کو تین، چار ماہ بعد مل بھی گئے تھے۔ ان کی چھوٹی بہن اس وقت بیمار تھیں بہت اور پھر کچھ عرصہ بعد وہ چل بسیں۔ جبکہ ان کی بڑی بہن کا ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی انتقال ہوا ہے۔ ہم انہیں بڑی نانو جان کہتے تھے۔''

بیلا پھیکا سا مسکرائی۔

''اور......اور وہ راگ، بیلا وہ راگ......؟ کیا کبھی امانت سر نے وہ راگ اپنے کسی گیت میں

استعمال کیا؟ گایا کبھی......؟"

مایا نے پراشتیاق انداز میں بیلا اور میشاء کو دیکھا۔

"نہیں......" وہ راگ انہوں نے پھر نہ کبھی گایا نہ کسی کو سنایا۔

"تو پھر، کیا ہم وہ راگ اب کبھی نہیں سن سکیں گے۔"

مایا نے حسرت بھرے انداز میں دونوں کو دیکھا تو۔ وہ دونوں ہلکا سا مسکرائیں۔ بھید بھری مسکراہٹ۔

"نہیں، تم سنو گی......وقت نے وہ مقابلہ شاید کسی بڑے پلیٹ فارم پر کروانا تھا، اب اس مقابلے میں تم سنو گی وہ راگ۔"

"مگر......" مایا نے الجھن بھرے انداز میں انہیں دیکھا۔ "وہ راگ گائے گا کون......؟"

"بیلا!" میشا نے بیلا کی طرف اشارہ کیا اور مایا دنگ رہ گئی۔

"بیلا۔" اس کی آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔

"تو کیا وہ راگ انہوں نے بیلا کو سکھایا تھا۔"

سوالات کا ایک انبار تھا اس کے ذہن میں اور ہر سوال تفصیلی جواب کا متقاضی تھا۔ میشا اور مایا نے بیک وقت اثبات میں جواب دیا تھا۔

"اور......اور امانت سر......وہ پاکستان جانے والے قافلے میں پہنچے کیسے؟ یہ تو بتایا ہی نہیں۔ وہ تو ادھر تھے تہہ خانے میں۔ شدید زخمی حالت میں۔ اور تارا سنگھ اپنے والد اور ساتھیوں کے ساتھ انہیں مارنے پہنچ گیا تھا۔ پھر وہ قافلے میں کیسے پہنچے؟"

اسے اچانک خیال آیا تو اس نے بیلا اور میشا کو سوالیہ انداز میں دیکھا۔

ان دونوں نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"سچ تو یہ ہے کہ اس بارے میں نانا جی کنفرم نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ خود تو بے ہوش ہو گئے تھے۔"

بالآخر میشا بولی۔

"مگر ان کا خیال ہے کہ شاید عین وقت پر پریم چند مدد لے کر آ پہنچا تھا یا پھر ان کے کسی اور مشترکہ دوست نے مدد کی تھی۔ بہر حال نانا جی اپنے اس ہمدرد کے بارے میں قیاس آرائیاں ہی کرتے ہیں۔ واضح طور پر آج تک پتا نہ چل سکا، ان کا وہ ہمدرد کون تھا۔"

میشا نے کہا تو مایا پرسوچ انداز میں سر ہلا کر رہ گئی۔

☆☆☆

مریم جاءنماز پر بیٹھی تھی اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ اس نے بیلا کو بابا کے کہنے پر پروگرام میں شرکت کرنے بھیج تو دیا تھا مگر اسے کسی کل چین نہ تھا۔ وہ جانتی تھی بیلا نے نادانی میں کھیلنے کو دہکتا انگارہ مانگ لیا تھا۔ اور اس نے منع کرنے کے بجائے وہ انگارہ اٹھا کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا تھا۔ تو اب تکلیف تو ہونی تھی۔ اور اگر بیلا تکلیف میں ہوتی تو وہ سکون سے رہ سکتی تھی بھلا۔

"یا اللہ، یا مالک دو جہاں!" اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ تو لفظوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

وہ کیا دعا مانگے، ہدایت مانگے، مگر کس کی......؟ کسے زیادہ ہدایت کی ضرورت تھی۔ بیلا کو یا......؟

اس کے بابا بیلا کے جیتنے کی دعا مانگ رہے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ وہ شر کو ایسے مانگ رہے ہیں جیسے خیر مانگتے ہیں۔

کیا وہ انہیں کبھی سمجھا پائے گی کہ وہ جس موسیقی کو "روح" کی غذا مانتے ہیں۔ دین اسلام نے وہ حرام قرار دی ہے۔ اسے سننا تک منع ہے۔ کجا کہ نت نئی دھنیں ترتیب دے کر دوسروں کو سنانے کا اہتمام کرنا۔

"یا اللہ، میرے پیارے اللہ، مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھ سے کوتاہی ہوئی۔ کاش میں ابتدا میں ہی بابا کو منع کر دیتی۔ بیلا کو ان کی شاگردی میں جانے ہی نہ دیتی تو آج وہ یوں سرِعام اپنی آواز کا جادو نہ جگا رہی ہوتی۔" مریم کے مضطرب ذہن میں خیالات

ہا نہیں ہو رہے تھے۔ کبھی اس کا ذہن بیلا کے حالیہ گرام کی طرف جاتا تو کبھی ماضی کی طرف پلٹ تا۔

اسے یاد تھا اس کی ایک کلاک فیلو، سارہ، کافی ہی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اور وقتاً فوقتاً دینی لیمات پر مشتمل پمفلٹ مفت تقسیم کرتی رہتی ں۔ مختلف موضوعات پر مبنی یہ پمفلٹ، سادہ اور م فہم انداز میں اسلامی تعلیمات پر مشتمل ہوتے ہے۔ مریم کو وہ موضوعات اچھے لگتے تھے اور وہ فی شوق سے ان کا مطالعہ کرتی تھی۔ کہیں کوئی نص ہوتی تو سارہ سے پوچھ لیتی اور وہ بہت اچھے راز میں سمجھاتی تھی۔

ان ہی دنوں سارہ نے اسے ''اسلام میں سیقی کی ممانعت'' کے موضوع پر ایک پمفلٹ دیا اور اسے پڑھ کر وہ الجھ گئی تھی۔ جس فن پر اس کے با اور بہن بھائی بے حد فخر کرتے تھے۔ ان کے ہب میں اس کی اس قدر ممانعت تھی کہ پیغمبر سلام جہاں موسیقی کی آواز سن لیتے، کانوں میں گلیاں ٹھونس کر وہاں سے تیزی سے گزرتے تھے۔ پمفلٹ میں لکھا تھا۔

''موسیقی دلوں میں نفاق کے جذبات اگاتی ہے۔''

''کیسے......؟'' اس کے دل میں سوال اٹھتا تھا۔

لکھا گیا تھا موسیقی شیطان کی آواز ہے۔

''کیوں......؟'' وہ الجھ کر سوچتی تھی۔

وہ پمفلٹ اسلامی تعلیمات اور احادیث کے والے سے لکھا گیا تھا اور سارے حوالے مستند تھے۔ وہ انہیں جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ مگر اس کے لیے ماننا بھی شکل تھا بہت مشکل...... کیوں؟ اور کیسے؟ کے سوال ں کے ذہن میں سر اٹھاتے رہتے تھے۔ وہ ان دنوں بے حد پریشان اور مضطرب رہتی تھی۔ دل و دماغ میں ٹھتے سوالوں کے جواب وہ کیسے حاصل کرے۔ کس سے مدد مانگے۔

اور شاید وہ یونہی الجھی رہتی جو اگر سارہ اسے اپنے گھر درس میں نہ بلوا لیتی، اور وہ درس سننے کے بعد اسے اپنے کئی تشنہ سوالات کے جواب مل گئے تھے۔

درس دینے والی ایک خوش شکل سی ادھیڑ عمر خاتون تھیں۔ سب انہیں آپا جی کہہ کر پکار رہے تھے اور ان آپا جی نے اس کی زندگی بدل دی تھی۔ وہ جسے ایک گلوکارہ بننا تھا۔ اپنے والد کے فن کو آگے بڑھانا تھا۔ وہیں سے پلٹ گئی تھی۔

گائیک خاندان میں پیدا ہونے پر اسے کبھی فخر تو نہیں رہا تھا۔ مگر ایسی کم مائیگی کا احساس بھی کبھی نہیں ہوا تھا۔

وہ بددلی سے بیٹھی تھی۔ اور اس کی توجہ بار بار درس سے بھٹک جاتی بلکہ اس نے شاید وہ ٹھیک سے سنا بھی نہیں تھا۔ درس کے بعد سوال، جواب کا سلسلہ تھا۔ اور پتا نہیں کسی خاتون نے ان سے کیا سوال کیا تھا مگر ان کے جواب نے اس کی توجہ کھینچ لی تھی۔

''رب کے آگے کیوں؟ اور کیسے؟ کا سوال رکھنے کی ہم خاکی پتلوں کی اوقات نہیں ہے بیٹا''

اسے لگا، وہ اس سے مخاطب ہیں۔

''جو حکم دے دیا گیا، وہ ماننا ہی بندگی ہے، جو اس میں فائدہ اور نقصان ڈھونڈنے لگ جائے وہ مومن تو نہ ہوا پھر۔''

''مگر......؟''

وہ خاتون شاید کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''دیکھو، جھوٹ بولنے کو منع کیا گیا ہے۔ اور سچ بولنے کا کہا گیا ہے ناں......''

انہوں نے تصدیق طلب انداز میں سب کو دیکھا۔

''جی۔''

بہت سی آوازیں ایک ساتھ ابھری تھیں۔

''مگر...... اگر دو لڑتے ہوئے بھائیوں میں جھوٹ بول کر صلح کروا دو تو نہ صرف یہ جائز ہے بلکہ

اس پر اجر بھی ملے گا۔ گویا مصیبت بھی عبادت بن گئی اگر شریعت کے مطابق سے ہو۔ اور اگر حق کو شریعت کے خلاف استعمال کیا جائے تو وہ معصیت (گناہ) بن جاتا ہے۔ جیسے غیبت سچ بولنے کو کہتے ہیں یعنی کسی میں موجود عیب کو اس کے پیٹھ پیچھے بیان کرنے کا نام غیبت ہے۔ اگر عیب حقیقت میں نہ ہو۔ جھوٹا گھڑا گیا ہو تو یہ پھر بہتان بن جاتا ہے۔ غیبت حقیقت میں موجود عیب کو پوری سچائی سے بیان کرنے کو کہتے ہیں۔ مگر اللہ نے اس سچ کی ممانعت فرمائی اور اسے حرام رکھا۔

نتیجہ کیا نکلا۔

انہوں نے مسکرا کر سوالیہ انداز میں سب کو دیکھا۔

''نتیجہ یہ نکلا کہ نہ سچ عبادت ہے۔ نہ جھوٹ گناہ، بلکہ کہنا ماننا فرمان الٰہی پر عمل کرنا۔ عبادت ہے۔ اور اللہ کے حکم کو نہ ماننا گناہ ہے۔''

شریعت......؟ خدا کی مرضی اور نامرضی کو کہتے ہیں، یعنی اللہ کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند اور یہ شریعت اللہ تعالیٰ نے صرف انسانوں پہ اتاری، اپنی باقی کی مخلوقات میں سے صرف انسانوں پر، جنات شریعت کے پابند ضرور ہیں مگر شریعت ان پہ اتاری نہیں گئی، یہ انسانوں کا امتیاز ہے اور اسی لیے وہ اشرف المخلوقات کہلاتے ہیں کہ انہیں شریعت کا علم دیا گیا۔''

وہ ایک پل کو رکیں سب پہ ایک طائرانہ نگاہ ڈالی، سب مکمل طور پہ ان ہی کی طرف متوجہ تھے۔

''اب دیکھو، جیسے ماہ رمضان میں روزہ فرض ہے، کیونکہ اللہ کی مرضی ہے اور اگر بلا عذر ترک کر دیا جائے، تو گناہ اور سزا دونوں سر پڑتے ہیں، لیکن...... یہی روزہ عید کے دن حرام ہے، اگر روزہ رکھ لے تو گناہ گار ہو جائے گا۔ تو واضح ہوا کہ نہ روزہ رکھنا عبادت ہے نہ چھوڑنا گناہ، کہنا ماننا عبادت ہے کہ جب ہم حکم دیں روزہ رکھو، جب ترک کرائیں، ترک کر دو۔ اپنی تجویز کو دخل مت دو، کہ یہی اطاعت درحقیقت عبادت ہے۔ یہ نماز، روزہ عبادت کی صورتیں اور مثالیں ہیں، حقیقی عبادت اطاعت اور تسلیم و رضا ہے۔''

وہ خاتون اب سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلا رہی تھیں۔ جبکہ آپا جی اب مسکرا کر کسی اور خاتون کی طرف متوجہ تھیں۔

مگر مریم پر سوچ کے کئی در وا کر گئی تھیں اور تب اس نے جانا کہ، اگر موسیقی کو حرام قرار دیا گیا ہے، گناہ کہا گیا ہے۔ تو یہ اللہ کی مرضی ہے۔ جو اس نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اپنی مخلوق تک پہنچا دی۔

کیوں حرام قرار دی گئی ہے، اس سوال کا جواب ڈھونڈنا فرض نہیں ہے، بلاچوں و چرا اس کہنا ماننا فرض ہے۔

اور اس نے کہنا مان لیا تھا، پھر بھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ موسیقی کیوں گناہ ہے۔ جب رب نے کہہ دیا تو کہہ دیا۔

مگر......اب اسی کی بیٹی نے یہ سوال اٹھایا تھا اور اس کے دادا نے کہا تھا کہ وہ یہ جواب خود ڈھونڈ کے لائے گی۔ یہ دعا تھی یا بددعا، اس کا فیصلہ اب وقت نے کرنا تھا۔ مگر مریم جانتی تھی اس جواب کو حاصل کرنے کے لیے اس کی بیٹی کو کانٹوں پہ چلنا ہوگا اور بیٹی کے سفر میں آسانی کے لیے اس نے ہتھیلیاں دعا کے لیے پھیلا دی تھیں۔

☆☆☆

سُر کی جنگ میں انڈیا اور پاکستان کو خوش آمدید، آج سے شروع ہونے والی ہے، انڈیا اور پاکستان کے سنگرز کے درمیان ایک زبردست سروں کی جنگ۔ پروگرام کا باقاعدہ آغاز کرنے سے پہلے آپ کو بتاتے چلیں کہ پروگرام آپ ہفتے میں دو بار یعنی ہر بدھ اور اتوار کی رات اسی وقت دیکھ سکیں گے، ہر تیسرے پروگرام میں دونوں ٹیموں کا گرینڈ ٹوٹل، یعنی اس ماہ کے تب تک ہو چکے سارے پروگرامز میں حاصل کردہ پوائنٹ دیکھے جائیں گے اور جس ٹیم کے مارکس کم ہوں گے، اسے ایلیمینیٹ کرنا پڑے گا اس

کا ایک جانباز، یعنی ہر پندرہ دن بعد ایک مقابلے میں حصہ لینے والا ہوگا۔ مطلب ہر ماہ ہم اپنے دوسنگرز کھودیں گے۔“

کمپیئر یہاں پہ ڈرامائی انداز میں رکی۔ آواز میں اداسی تھی۔

منگل کی رات تھی اور پروگرام کی ریکارڈنگ چل رہی تھی۔ جبکہ پروگرام نے اگلے دن یعنی بدھ کو، ٹیلی کاسٹ ہونا تھا۔ پروگرام لائیو کے بجائے ریکارڈڈ اس لیے تھا کیونکہ ججز نے مارکس بھی دینے تھے، جس میں ظاہر ہے، وقت کی قید نہیں رکھی جاسکتی تھی، ہوسکتا ہے کہ وہ فوراً فیصلہ لے لیتے، یہ بھی ہوسکتا تھا کہ انہیں مارکس دینے میں تھوڑا ٹائم لگتا، اس لیے ایڈیٹنگ ضروری تھی تاکہ ڈیڑھ گھنٹے کا پروگرام نشر ہوسکے، اسی ڈیڑھ گھنٹے میں، تین پاکستانی اور تین انڈینز،گلوکاروں نے پانچ پانچ منٹ کے گیت بھی گانے تھے۔

تو پروگرام کا باقاعدہ آغاز کرتے ہیں۔ کمپیئر مسکرائی۔

”میں اور ہمارے دونوں کپیٹنز ریسپیکٹڈ جیوری کو ویلکم کرتے ہیں۔“

”اور پروگرام کی شروعات کی اجازت چاہتے ہیں۔“

انجلی کھلکھلائی تھی۔ تو پاکستانی اور انڈین ججز بھی مسکرادیے تھے۔

جیوری میں کل چار رکن تھے۔ ایک پاکستانی موسیقار تھا اور اس کے ساتھ پاکستانی گلوکارہ تھی جبکہ دوسرا بھارت کا جانا مانا موسیقار تھا اور دوسری رکن گلوکارہ تھی۔ یوں دو رکن خواتین تھیں اور دونوں گائیک تھیں۔ جبکہ دونوں مرد رکن موسیقار تھے۔

”میشا جی! شروعات پاکستانی ٹیم سے ہوگی آپ کس سنگر سے پروگرام کی اوپننگ کروائیں گی۔“

کیمرہ اب کمپیئر سے گھوم کر اسٹیج پہ بیٹھے پاکستانی سنگرز پہ آیا تھا جو اس وقت اپنے آپ کو کمپوز کرنے میں مصروف تھے۔ یہ پروگرام اس لحاظ سے بھی بے حد اہم تھا کہ آج سے ہر گلوکار کو جیوری سے پوائنٹ ملنے تھے اور یہی پوائنٹ ٹوٹل ہوکر ٹیم اسکور بناتے۔

”میں شوکت حسین سے پروگرام کا آغاز کرواؤں گی۔“

میشا کے کہنے پہ شوکت اپنی جگہ سے اٹھ کر اسٹیج کے درمیان کمپیئر کی طرف بڑھا تھا اور ہال میں بیٹھے ناظرین نے اس کا پرجوش انداز میں استقبال کیا تھا۔

بیلا نے حسرت بھرے انداز میں اسٹیج کے بیچوں بیچ روشنیوں میں گھرے شوکت کو دیکھا۔

”کیا کبھی وہ بھی اسی اعتماد سے اسٹیج پہ کھڑے ہوکر گا سکے گی۔“ میشا نے فی الحال اسے اس پروگرام میں گانے سے منع کردیا تھا، وہ اور ٹیم کوچ ذوالفقار سر اسے کراؤڈ کا سامنا کرنے کے لیے تیار کررہے تھے۔ نانا جی سے بھی اس سلسلے میں اس کی تفصیلی بات چیت ہوئی تھی۔

بیلا کو لگتا تھا کہ اب اگر اسے موقع ملا تو وہ گالے گی، بہت اچھا گالے گی مگر یہ اعتماد صرف ایک پل کا ہوتا تھا۔ اگلے ہی پل پھر وہی ڈر اور خوف اس پہ حاوی ہوجاتا تھا وہ اپنی کیفیت سمجھنے میں خود بھی ناکام تھی۔ کبھی اس پہ مایوسی طاری ہوجاتی اور کبھی ایک دم ہی وہ پرجوش ہوجاتی۔

سر جھٹک کر اس نے پروگرام میں خود کو ذہنی طور پر حاضر کرنے کی کوشش کی، شوکت گانا گا چکا تھا اور اب ججز کے کمنٹس اور مارکس کا منتظر تھا۔

تبھی جج کے آگے مارکس والا پورشن روشن ہوا۔

”ٹیم پاکستان کا بہت اچھا اسٹارٹ رہا۔ چالیس میں سے اڑتیس مارکس۔ کیپٹن دل جیت آپ اب کسے بلانا چاہیں گے؟“

وہ اب انڈین کیپٹن سے مخاطب تھی۔

”میں جس سنگر کو بلاؤں گا، وہ میرا فیورٹ تو ہے ہی، میرے دادا جی، تارا سر کو بھی بہت پسند ہے اور ان کا شاگرد بھی ہے، افنان خان۔“

اس نے گلوکار کا نام بہت خوشی سے لیا تھا، بیلا

نے میشا کی طرف دیکھا، وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی، دل جیت، کرتار سنگھ (تارا سنگھ، وہ انڈسٹری میں اسی نام سے مشہور تھا) کا پوتا تھا اور نانا جی نے بیلا کو اسے ہرانے کے لیے بھیجا تھا اور اب مقابلے میں تارا سنگھ کا ایک شاگرد آ گیا تھا۔ یہ ایک نئی اطلاع تھی۔ بیلا کا دل ایک دم ہی پرجوش انداز میں دھڑکا، ہر طرف گھومتے بڑے بڑے کیمرے چمکتی دمکتی روشنیاں، ہال میں بیٹھے پرجوش انداز میں داد دیتے پاکستانی اور انڈین آڈینز وہ بڑا سا اسٹیج جس پہ وہ بیٹھے تھے اور ان کے سامنے بیٹھے انڈین گلوکار......

اس نے انہیں ہرانا تھا۔ ہاں ان سب کو ہرانا تھا اور وننگ لائن پہ پہنچنا تھا۔ اور وہ ایسا کر سکتی تھی۔ ایک دم ہی اس نے سارے ڈر و خوف کو اپنے دل سے نکلتے دیکھا۔

بیلا اب بہت غور سے ''افنان خان'' کو دیکھ رہی تھی۔ سُر میں وہ بھی بہت پکا تھا، مقابلہ سخت ہونے جا رہا تھا۔ اور بیلا پہ اس کا الٹا ہی اثر ہوا تھا۔ وہ اب بالکل بے خوف تھی وہ مقابلے کے لیے تیار تھی۔

☆☆☆

اور تین ماہ بعد افنان، دل جیت سنگھ سے کہہ رہا تھا۔ ''دل بھائی! پاکستانی ٹیم میں یہ لڑکی بیلا، بہت ٹف ٹائم دینے والی ہے بتا رہا ہوں میں آپ کو۔''

''ہاں بہت پکی ہے سروں میں وہ جیسے ساری زندگی ریاض کرتے ہی گزاری ہو، ویسے ابھی فی الحال تو ہم ہی لیڈ لے رہے ہیں، ہمارے صرف دو سنگر ایلی منیٹ ہوئے ہیں جبکہ وہ بس تین ہی بچے ہیں۔'' دل جیت نے مطمئن انداز میں کہا۔

''ہاں مگر، دل بھائی یہ بھی تو دیکھیں۔ وہ تینوں خاص کر بیلا اور شوکت کمال کے سنگر ہیں، گلا بھی خوب صورت اور سر میں بھی پکے، ویسے کم مایا بھی نہیں ہے، مگر ان دونوں کی بات ہی الگ ہے۔''

افنان کے انداز میں ستائش تھی۔

وہ دونوں اس وقت دل جیت کے بیڈ روم میں تھے اور ابھی اسٹوڈیو سے فارغ ہو کر آئے تھے۔ ان کی ٹیم کے باقی چاروں سنگرز، ارجن، مالتی، بونی اور کزان، ابھی تک ریاض کر رہے تھے۔ ہفتے میں دو دن پروگرام ہونے کی وجہ سے انہیں فرصت سے مل بیٹھنے کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ دو دن پروگرام کی تیاری میں گزرتے، ایک دن ریہرسل اور ریکارڈنگ اور پھر اگلے پروگرام کی تیاری۔

''اپنی ٹیم کم تو نہیں ہے۔ خاص کر ارجن مالتی اور تم سے تو کافی امید ہے مجھے اور دادا جی کو بھی......''

دل جیت نے مسکرا کر افنان کے کندھے پہ تھپکی دی۔

''واہ گرو دی سوں، ٹرافی اور تاج تم ہی لاؤ گے انڈیا......''

افنان مسکرا دیا تھا۔

''ٹرافی تو لے ہی آئیں گے، اسکور میں ہم شروع سے پاکستان کو لیڈ دے رہے ہیں، مگر فائنل میں تاج تو اس کے سر ہی سجے گا جو بیسٹ سنگر کا ٹائٹل جیتے گا۔''

''اور تمہارے خیال میں یہ ٹائٹل کون جیتے گا۔''

دل جیت نے بغور افنان کو دیکھتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

''مجھے لگتا ہے تاج بیلا لے جائے گی۔'' ابھی بھی وہ بیسٹ ہے، صرف باقی سنگرز کی وجہ سے ان کی ٹیم پیچھے ہے۔ ورنہ اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔''

افنان مسکرایا تھا۔

''آہم......'' دل جیت ہولے سے کھنکارا۔

''چنتا کا ہے کی، ہم تاج والی کو ہی انڈیا لے جائیں گے، تاج خود بخود انڈیا پہنچ جائے گا۔'' اس کا لہجہ شرارتی سا تھا۔

''کہ...... کیا مطلب......؟'' افنان بوکھلا گیا تھا۔

''مطلب......؟'' افنان کو بوکھلاتا دیکھ کر دل جیت کی ہنسی نکل گئی۔

''کیوں، اچھی نہیں لگتی بیلا تجھے؟'' وہ اب جیسے اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''دل بھائی! کیسی باتیں کر رہے ہو یار آپ؟ وہ پاکستانی، میں انڈین، یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟''

وہ جیسے اپنی چوری پکڑے جانے پہ ٹپٹا رہا تھا۔ وراس کی یہ بوکھلائی، ٹپٹائی حالت دل جیت کو مزہ دے رہی تھی۔

''کیوں، وہ ہماری ثانیہ مرزا کو نہیں لے اڑے پاکستان، ہم بھی ان کی بیلا لے جائیں گے اور ویسے بھی دل والے ہی دلہنیا لے جاتے ہیں۔''

دل جیت پوری طرح شرارت کے موڈ میں تھا۔

افنان نے آنکھیں سکوڑ کر بغور اسے دیکھا اور جیسے اس کی شرارت سمجھ کر کھل کر مسکرا دیا۔

''چلو پھر آپ ساتھ ہیں تو، مما اور ڈیڈ کو منانا پھر آپ کا کام ہے۔''

اس کے والد ایک مشہور انڈین سنگر اور مسلم تھے، جبکہ مما کرسچن تھیں اور مشہور فلم ایکٹریس رہ چکی تھیں، مذہب کے فرق کے باوجود دونوں میں بہت محبت تھی، افنان نے جان بوجھ کر ان کا حوالہ دیا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا، مما اس کی شادی اپنی بھانجی اور مشہور ماڈل کیتھی سے کروانا چاہتی تھیں، جو پچھلے سال مس انڈیا کا ٹائیٹل جیتتے جیتتے رہ گئی تھی اور دل جیت بھی یہ بات جانتا تھا۔

''او، مروائے گا یار تو......''

اب بوکھلانے کی باری دل جیت کی تھی۔

''مذاق کر رہا تھا میں تو......تو پروگرام کی طرف دھیان دے، اے آر رحمان اسپیشل ہے اور تو ریاض بھی ادھورا چھوڑ آیا ہے۔''

''ہاں، جانتا ہوں ویسے بھی میں نے اپنا گانا چینج کرنا ہے۔''

وہ کسلمندی سے بیڈ سے اٹھا۔

''کیا سونگ چینج کرنا ہے، اتنی مشکل سے تو سلیکٹ کیا تھا۔'' دل جیت نے حیرت سے اس کے انداز دیکھے۔

''ہاں، مگر اب میرا ہر گانا اس تاج والی نازنین کے نام۔'' اس نے دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلائے۔

''اب تک تو میں خود کو کنٹرول کر رہا تھا۔ مگر جب آپ ساتھ ہیں تو چنتا کیسی۔''

وہ گہرا پرسکون سانس خارج کرتا بیڈ پہ ڈھے گیا تھا اور تکیہ دونوں بازوؤں میں دبوچ لیا تھا۔

''او یار! مذاق کر رہا تھا میں۔'' دل جیت نے بوکھلا کر دوسرا تکیہ اٹھایا اور اس کے کندھے پہ دے مارا۔

''آہ، مار ڈالا دل بھائی۔''

افنان کی آہ و بکا اور دل جیت کی ہنسی باہر تک سنائی دے رہی تھی اور دروازے کے باہر کھڑی مالتی کے سینے میں آگ دہک اٹھی تھی۔

''اگر تمہارے گیت تاج والی کے نام ہیں افنان، تو پھر یہ تاج تمہیں میں اپنے سر پہ سجا کر دکھاؤں گی......'' اس نے ایک نظر دروازے پہ ڈالی اور دستک دیے بنا ہی لوٹ گئی۔

☆☆☆

''بس یار! کیا بتاؤں؟ بہت ہی بزی روٹین ہے، سچ میں مما، پاپا اور رانیہ سے بھی کئی کئی دن بات نہیں ہو پاتی ہے، دو دن گانے کی سلیکشن اور ریاض، ایک دن ریہرسل، ریکارڈنگ اور پھر وہی تھیم کے مطابق سانگ کی سلیکشن، کھانا کھانے کا ٹائم بھی نہیں ملتا۔''

بیا، فی بی اور نیا اسکائپ پہ اس سے بات کر رہی تھیں، جب ان کے کوئی بھی رابطہ نہ رکھنے کے شکوہ پہ، بیلا بلا تکان شروع ہو گئی۔ وہ اس وقت کافی ایزی ہو کر اپنے بیڈ پہ نیم دراز تھی اور لیپ ٹاپ گھٹنوں پہ سیٹ کیا ہوا تھا۔

''بیلا! تم پیاری تو پہلے بھی تھیں، مگر پروگرام میں تو کوئی شے لگتی ہو یار۔''

''ہاں کافی گرومنگ کی ہے انہوں نے ہماری، ریکارڈنگ سے پہلے دو، ڈھائی گھنٹے تو تیاری میں ہی لگ جاتے ہیں۔''

''وارڈ روب کون کر رہا ہے بیلا، ڈریسز بھی

کمال ہوتے ہیں۔'' بیا نے پراشتیاق انداز میں پوچھا، پروگرام شروع ہونے سے لے کر ان تین ماہ میں یہ ان کی پہلی تفصیلی ملاقات تھی۔

''سب کچھ ان کا دردسر ہے، ہم نے تو اپنی آواز کا جادو جگانا ہوتا ہے، گانے اور پروگرام کی تھیم کے مطابق ہمارے اسٹائلسٹ ہی ڈیسائیڈ کرتے ہیں کہ ہم نے کیسے کپڑے پہننے ہیں، کون سا اسٹائل ہوگا۔ میک اپ کیسا ہو۔ سب کچھ وہی ڈیسائیڈ کرتے ہیں۔''

بیلا مسکراتے ہوئے ان کا پرتجسس انداز دیکھ رہی تھی۔

''ویسے بیلا! اب تم سیلبریٹی بن چکی ہو یار، سوشل میڈیا پہ تمہارے فینز کی تعداد لاکھوں میں ہے، تو کیسا لگتا ہے اب...... نیا کے پوچھنے پہ بیلا نے نچلے لب کا کونا دانتوں میں دباتے پرسوچ انداز اپنایا۔

''آم...... کیسا لگے گا، ابھی نہ کہیں باہر گئے ہیں، نہ ہی فینز کا سامنا کیا ہے کہیں، ہوٹل میں کوئی مل جائے تو مل جائے، سوفی الحال کچھ پتا نہیں، کیسا لگے گا......''

''کیا مطلب کہیں گھومنے بھی نہیں گئے۔'' فی بی نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''کہاں...... عائشہ پھپھو کے گھر تک تو گئی نہیں میں۔'' بیلا نے منہ لٹکاتے ہوئے کہا۔

''بیلا! تمہارے دادا جی' ان سے بات ہوئی۔'' نیا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... وہ کال ہی اٹینڈ نہیں کرتے۔''

بیلا کا مسکراتا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔

''ڈونٹ وری بیلا، سب ٹھیک ہو جائے گا یار، تم بتاتی تھیں ہمیں، کتنا پیار کرتے تھے تم سے، اب کتنا ناراض رہ سکتے ہیں بھلا۔''

نیا نے تسلی بھرے انداز میں کہا، تو بیلا سر ہلا کر رہ گئی۔

''بائی دا وے، بیلا یہ تمہارا اور افنان کا کیا سین ہے۔''

اب پتا نہیں بیا نے سب کو چیئراپ کرنے کے لیے موضوع بدلا تھا، یا وہ واقعی اس بارے میں پرتجسس تھی، کہ پوچھے بغیر رہ نہیں سکی۔

''کیا مطلب، کیا سین چل رہا ہے......؟''

بیلا نے مصنوعی حیرت بھرے انداز میں کہا۔

''بنو مت اب بیلا، پروگرام دیکھ کر کوئی عقل کا اندھا بھی بتا سکتا ہے کہ وہ مرمٹا ہے تم پہ۔''

بیلا نے آنکھیں سکوڑ کر بیا کو دیکھا اور ابھی جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ فی بی کی اگلی بات پہ اس کا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔

''ہاں اور وہ جو اس نے گانا گایا تھا۔''

''اے نازنین سنو ناں......''

ہمیں تم پہ حق تو دو ناں......

گانا شروع تو فی بی نے کیا تھا، مگر پھر وہ تینوں کورس میں گانے لگی تھیں۔

''شٹ اپ۔'' بیلا جھنجلا گئی تھی۔

''بندہ برا نہیں ہے ویسے، سو ہینڈسم۔'' فی بی نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''بیلا بات چیت ہوتی ہے، افنان سے اور اس کے مما اور ڈیڈ سے۔''

''اف نہیں یار، ویسا کوئی سین نہیں ہے جیسا تمہارے مائنڈ میں چل رہا ہے، بتایا تو ہے، بزی ہوتے ہیں بہت۔'' بیلا جھلا گئی تھی۔

''مگر......''

''بس......'' نیا کے مزید کچھ کہنے سے پہلے بیلا نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا تھا۔

''دیر ہو گئی ہے کافی، ریسٹ کرنے دو، پھر ابھی بیشارریاض کے لیے بلا لے گی...... بائے۔''

اس نے جیسے اس موضوع سے جان چھڑائی تھی۔

''بائے بیلا اور ہاں مایا کو بھی ہیلو بول دینا ہمارا، بڑا مس کر رہے ہیں اسے یار اس کے بعد تو اس کے گروپ سے کوئی ٹاکرا ہی نہیں ہوا۔''

''ہاں، یہ دونوں ہی فسادی تھیں، دونوں گئی ہیں

واب امن ہی امن ہے۔“
”اور دیکھو ہمیں لڑواتی تھیں، خود تو ادھر بڑی دوستیاں ہو گئی ہیں۔“
وہ تینوں باری باری بول رہی تھیں اور بلا تکان شروع تھیں اور اب اس موضوع پر انہوں نے پندرہ، بیس منٹ تو مزید بولنا تھا۔ بیلا ٹھنڈی سانس بھر کر ایک دفعہ پھر ان کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

☆☆☆

میں نے جسے ابھی ابھی دیکھا ہے
کون ہے وہ انجانی
وہ ہے کوئی کلی یا کوئی کرن
یا ہے کوئی کہانی

بیلا نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں، اسے افنان کی آواز بہت قریب سے آئی تھی، جیسے..... جیسے وہ اس کے کان میں گنگنایا ہو۔
”او مائی گاڈ......“
اس نے تھک کر تکیہ اپنے کانوں پہ رکھا، جیسے ایسا کرنے سے خیالوں میں گنگناتا افنان رک جائے گا اور کروٹ بدل لی۔
یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ......وہ ایک دم بے قراری سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور تکیہ گود میں رکھ لیا۔ مگر وہ کیوں گانا گاتے ہوئے میری طرف دیکھتا ہے، بار بار کیوں کہتا ہے، میرا ہر گیت ایک خوب صورت لڑکی کے نام اور ایسا کہتے ہوئے جب میری طرف دیکھتا ہے تو کیوں باقی انڈین سنگرز، خاص کر وہ مالتی میری طرف کچا چبا جانے والے انداز میں دیکھتے ہیں۔
انڈین سنگرز میں سے افنان اور بونی کو چھوڑ کر، باقی سب کا رویہ ویسے بھی ان سے کچھ خاص اچھا نہیں تھا۔ کافی فارمل سا رویہ تھا۔ مگر اب کچھ دنوں سے وہ نوٹ کر رہی تھی کہ وہ کچھ زیادہ ہی روڈ ہوتے جا رہے ہیں، پروگرام کو لے کر ہلکی پھلکی نوک جھونک تو ویسے بھی ہوتی رہتی تھی اور چونکہ انڈین شروع سے لے کر ابھی تک لیڈ کر رہے تھے تو کچھ زیادہ ہی اکڑ دکھاتے تھے۔

چوتھے ماہ کے لاسٹ اپی سوڈ میں مایا بھی باہر ہو گئی تھی، ورنہ وہ اور بیلا آپس میں شیئر کر کے نہ صرف دل کی بھڑاس نکال لیتی تھیں، بلکہ ان کو اچھے خاصے کرارے جواب دے کر ان کی بولتی بھی بند کروا دیتی تھیں مگر، اب مایا کے جانے سے بیلا کو اچھا خاصا دھچکا لگا تھا، ایک تو اب وہ دو ہی پاکستانی گلوکار بچے تھے اور اب انہوں نے ہر حال میں انڈیا سے اسکور بھی برابر کرنا تھا اور خود کو پروگرام سے باہر ہونے سے بھی بچانا تھا۔ تو ایک یہ برڈن اور دوسرے شوکت سے اس کی کچھ خاص بے تکلفی بھی نہیں تھی اور وہ بیلا کے ساتھ مل کر انڈینز کی دھلائی پہ بھی تو کوئی توجہ نہیں دیتا تھا، بلکہ الٹا بیلا کو سمجھاتا تھا۔
”فوکس بہنا، فوکس! اپنے کام پہ دھیان دو، ان کی یوں ہی بولنے کی عادت ہے۔ بولنے دو انہیں۔“ اور اب یہ افنان......
کہیں یہ ایسے میرا فوکس تو ہٹانا نہیں چاہتے پروگرام سے، یہ ان انڈینز کی کوئی سازش نہ ہو اور میں خوامخواہ افنان کو کیوں سوچ رہی ہوں۔ اف، کیا کروں میں۔“
بیلا نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اپنے بالوں میں پھنسائیں اور ہلکے ہلکے جھٹکے دیے۔
”ایک تو اتنا ہینڈسم بھی نہ ہو کوئی۔“
مگر ہینڈسم تو بونی بھی بہت تھا، تو وہ کیوں نہیں اچھا لگ رہا تھا۔ خوب صورتی ہر انسان میں ہوتی ہے۔ خوب صورت ہر انسان ہوتا ہے، کوئی تھوڑا کم، تو کوئی کچھ زیادہ، مگر اچھا ہر کوئی نہیں لگتا، اچھا صرف وہی لگتا ہے، جس سے روح کہیں اور کسی اور مقام پہ مل چکی ہوتی ہے، اب چاہے وہ خوب صورتی کے مروجہ معیار پہ پورا اترے یا نہیں دل کو اچھا وہی لگتا ہے، مگر...... یہ بات ابھی بیلا کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ ابھی تو الجھی سی بیٹھی تھی۔
ویسے بھی افنان کے ساتھ کوئی اسکینڈل تو میں افورڈ کر ہی نہیں سکتی۔ دادا جی ابھی ابھی تک ناراض ہیں، اس کے بعد تو، پورا پاکستان ہی ناراض ہو جائے

گا۔

نہیں بھئی نہیں، ٹوٹلی امپاسبل، بس یہی رویہ ٹھیک ہے، نور سپانس۔ اب سو جاؤ بیلا۔"

اس نے خود کو مخاطب کر کے گہرا سانس لیا۔ تکیہ پہ سر رکھا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

"جی، جی پھپھو! آپ ڈرائیور کو بھیج دیں۔ میں بس تیار ہی ہوں۔"

بیلا آئینے میں اپنا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے، عائشہ پھپھو سے بات کر رہی تھی۔ خوشی سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ اس ماہ نہ صرف انہوں نے اپنا اسکور انڈین ٹیم کے برابر کر لیا تھا۔ بلکہ شوکت اور وہ باطر نکلنے سے بھی بچ گئے تھے۔

"بیلا آپی! آپ رکیں گی ناں ہماری طرف پھر کچھ دن، میں نے آپ کو اپنے کچھ فرینڈز سے بھی ملوانا ہے۔"

عاطف نے موبائل عائشہ پھپھو سے لے کر خود بات شروع کر دی تھی۔

"ہاں، ہاں موٹو! رہنے کے لیے ہی آ رہی ہوں، مگر پہلے تم مجھے یہاں سے نکلنے تو دو ناں......"

"اوکے، اوکے بائے۔ ہم ویٹ کر رہے ہیں آپ کا......" وہ جلدی سے بولا تھا۔

"اوکے بائے......"

بیلا نے ہنستے ہوئے کال کاٹ دی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے میشا سے پھپھو کی طرف دو دن رہنے کی اجازت لی تھی، کیونکہ اگلا پروگرام فائنلسٹ کی سلیکشن کے لیے تھا، فائنل میں صرف تین سنگرز نے جانا تھا، جبکہ وہ چار تھے، انڈیا سے افنان خان اور مالتی کپور، جبکہ پاکستان کی طرف سے بیلا اور شوکت تھے۔

"خیر......"

بیلا نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو ان خیالات سے آزاد کرنے کی شعوری کوشش کی، دو ہی پروگرام بچے تھے، اس پروگرام کی تیاری کے لیے انہیں دس دن ملنے تھے، وہ دو دن عائشہ پھپھو کی طرف رہ کر تھوڑی فریش ہو جاتی اور تھوڑا مائنڈ بھی چینج ہو جاتا ورنہ تو ان پانچ ماہ میں جو ایک مسلسل مقابلہ کی فضا قائم تھی اس نے تو دماغ کی دہی بنا کر رکھ دی تھی۔

اس نے ایک بار پھر آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ بلیک کلر کے سادہ سے سوٹ کے صرف گلے اور بازوؤں پر سلور اسٹونز کی پٹی سی بنی ہوئی تھی اور ان کی جگمگاہٹ نے اس کا چہرہ بھی روشن کر دیا تھا۔ سلور ہی کلر کے ٹاپس اور ہلکے سے میک اپ میں، وہ بلاشبہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اس نے بیگ کندھے پہ ڈالا اور باہر نکل گئی۔

"رابیل......"

ابھی وہ لفٹ سے کچھ فاصلے پر ہی تھی۔ جب پیچھے سے اسے کسی نے پکارا تھا، اور وہ مڑے بغیر بھی جان گئی تھی کہ وہ کون تھا۔

"اف کہاں سے ٹپک پڑا" وہ بڑبڑا کر رہ گئی، پھر اس نے ہلکا سا رخ موڑا اور افنان کی آنکھوں میں اپنے لیے ابھرتی ستائش صاف پڑھ لی۔

"جی......؟" اس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ سوالیہ انداز میں افنان کی طرف دیکھا۔

"وہ، تھوڑا سا سمے چاہیے آپ کا، ایکچوئلی! کچھ بات کرنی ہے آپ سے، ایک کپ کافی کے بارے میں کیا خیال ہے۔ وہیں بیٹھ کر بات بھی کر لیں گے۔"

وہ یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ بیلا کو الجھن سی ہوئی۔ اسے یہ بھی خیال نہیں کہ ہمارے اردگرد موجود لوگ اسے یوں میری طرف گھورتے دیکھ کر کیا سوچیں گے۔ اس کا موڈ آف ہوا تھا۔

"اصل میں، میں اپنی پھپھو کی طرف جا رہی ہوں۔ ڈرائیور آیا ہوا ہے مجھے لینے تو، آئی ایم سوری، میں ضرور سنتی آپ کی بات مگر ابھی جانا ہے مجھے۔" وہ بمشکل مسکراتے ہوئے بولی۔

"اٹس اوکے، کیا ہم باہر تک ساتھ جا سکتے ہیں۔ میں آپ سے بات بھی کر لوں گا، کوئی اتنی لمبی چوڑی بات نہیں کرنی ہے مجھے یا......" وہ ایک پل کو

رکا۔ ''آپ کچھ پل بھی ساتھ نہیں چلنا چاہتیں میرے ......''

اس کی سنہری آنکھوں میں جانے کیا تھا۔ بیلا بس ایک پل ہی دیکھ سکی، پھر نظریں جھکا کر رخ موڑ گئی تھی۔

''شیور، وائے ناٹ، چلیے......''

اس نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ لفٹ میں دو افراد اور بھی تھے، تو وہ دونوں خاموش رہے تھے، مگر لفٹ سے نکلنے کے بعد بھی افنان خاموشی سے اس کے برابر میں چلنے لگا تھا، کچھ پل گزرے پھر بیلا کو اس کی خاموشی سے الجھن سی ہوئی۔ اس نے ذرا سا رخ موڑ کر اپنے برابر چلتے افنان کو دیکھا۔

''آپ کو کچھ بات کرنی تھی مجھ سے شاید۔''

وہ دھیرے سے لب کاٹتے جیسے اسے یاد دلا رہی تھی۔

''آں، ہاں ......'' وہ جیسے کسی گہرے خیال سے چونکا تھا۔ ''جی، جی...... وہ میں نے پوچھنا تھا۔'' آپ سے کہ اس پروگرام کے بعد آگے کیا ارادہ ہے آپ کا؟

''آگے کیا ارادہ ہے مطلب......؟'' بیلا نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

''مطلب ہم سب کو مختلف میوزک کمپنیز سے آفرز آ رہی ہیں، مجھے بھی آئی ہیں۔ میں کانٹریکٹ کر رہا ہوں اپنے سولو البم کے لیے، آپ نے اگر ابھی تک کسی کے ساتھ کانٹریکٹ نہیں کیا تو، آپ اسی کمپنی کے ساتھ کانٹریکٹ کر لیں، مجھے خوشی ہو گی۔''

آخر میں اس کا لہجہ گمبھیر ہو گیا تھا۔ بیلا نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ایکچوئلی میں آگے اپنے کیریئر میں آپ کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتا ہوں۔'' بیلا کے یوں دیکھنے پہ وہ تھوڑا اگر بڑا گیا تھا۔

''مگر میں نے سنگنگ کو کیریئر نہیں بنانا۔ میں کوئی پروفیشنل سنگر نہیں ہوں اور نہ ہی بننا چاہتی ہوں، سو میں کسی کمپنی کے ساتھ کوئی کانٹریکٹ نہیں کر رہی۔'' بیلا نے عام سے لہجے میں کہا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ مطلب یعنی آپ؟''

وہ ایک دم سے رکا پھر اس کے سامنے آ کر ٹھہر گیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں حیرت زیادہ تھی یا الجھن بیلا اندازہ نہیں کر سکی۔

''آپ اس پروگرام کے بعد مزید نہیں گائیں گی......؟''

''جی، بالکل یہی بات ہے۔ ابھی میں نے اپنی ایجوکیشن کمپلیٹ کرنی ہے، ویسے بھی اس پروگرام کی وجہ سے کافی نقصان ہو گیا ہے میرا، ان فیکٹ پورا سمسٹر ڈراپ کرنا پڑ گیا ہے مجھے، سو میں اپنی اسٹڈی پہ فوکس کروں گی۔''

بیلا بمشکل خود کو کمپوز کیے ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہی تھی۔

''اچھا اب آگے سے تو ہٹیں، ڈرائیور ویٹ کر رہا ہو گا میرا۔'' اسے بدستور سامنے ایک چٹان کی طرح ایستادہ دیکھ کر، اس نے باور کرا دیا تھا کہ اسے دیر ہو رہی ہے۔

''ایک منٹ، پلیز......''

افنان نے ملتجی انداز میں اسے دیکھا، تو بیلا رک گئی تھی۔

''آپ جیسی سنگر ہیں تو لگتا ہے کہ آپ نے اپنی اب تک کی زندگی میں ریاض کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں کیا اور آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ نے اسے کیریئر نہیں بنانا یعنی آپ اس پروگرام میں شوقیہ آئی ہیں۔'' افنان کے انداز میں الجھن تھی۔

''اوں ہوں۔'' بیلا نے نفی میں گردن ہلائی۔

''شوقیہ نہیں، آپ صحیح سمجھے ہیں، میں نے اپنی اب تک کی ساری زندگی ریاض کرتے ہی گزاری ہے۔ پتا ہے کس لیے۔'' اس نے سوالیہ انداز میں افنان کو دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا، پھر اس نے نا سمجھی سے کندھے اچکائے۔

"کس لیے......؟ اس کے انداز میں تجسس تھا۔"

"کیونکہ مجھے اس پروگرام میں شرکت کر کے جیتنا تھا اور ایک پرانا قرض تھا جسے چکانا تھا ایک فرض تھا جسے نبھانا تھا۔"

بیلا نے ایک نظر افنان کو دیکھا اور اسے وہیں الجھن میں چھوڑ کر کی سائیڈ سے نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

بیلا سے ملنے اور تھوڑی دیر اس سے گپ شپ لگانے کے بعد عائشہ پھپھو کچن کا جائزہ لینے کے لیے اٹھ گئیں۔ انہوں نے اس کے پروگرام کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی تو بیلا کی بھی ہمت نہیں پڑی تھی۔ باقی سب کی طرح انہوں نے ناراضی کا اظہار نہیں کیا تھا اور بیلا کے لیے یہی بہت تھا۔ ان کے اٹھنے کے بعد وہ عاطف کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"اور سناؤ موٹو! کیا چل رہا ہے۔"

اس کے شرارتی انداز پہ عاطف نے برا سا منہ بنایا تھا۔

"بیلا آپی! اب تو آپ مجھے موٹو کہنا چھوڑ دیں۔ بڑا ہو گیا ہوں میں اور پہلے کی طرح موٹا بھی نہیں رہا اب۔"

"او کے، او کے، اچھا یہ بتاؤ، پاکستان بات ہوتی رہتی ہے۔"

بیلا نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا تھا۔

"جی ہو جاتی ہے کبھی کبھار۔ وہ میرا ادھر چپس کا پیکٹ پڑا تھا، کدھر چلا گیا۔"

وہ اب ادھر ادھر ہاتھ مار رہا تھا جبکہ آنکھیں کسی سرچ لائٹ کی طرح چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔

"اف ......کھانے سے دھیان تمہارا ہٹتا نہیں اور کہتے ہو موٹو نہ کہیں مجھے۔"

ڈرائنگ روم کے بجائے پھپھو اسے لاؤنج میں ہی لے آئی تھیں، اور اب سامنے کچن میں نظر آ رہی تھیں۔ بیلا چاہتی تھی کہ ان کے آنے سے پہلے وہ عاطف سے مطلوبہ معلومات حاصل کر لے۔

"پھر میرے بارے میں بات ہوتی ہے......؟"

"آپ کے بارے میں کیا بات......؟"

وہ اب اٹھ کر صوفے کے پیچھے جھانک رہا تھا۔

"عاطف کے بچے ادھر آؤ، مل جائے گا چپس کا پیکٹ تمہیں، بلکہ میں تمہارے لیے ڈھیر سارے چاکلیٹ لائی ہوں، وہ دیتی ہوں۔ پہلے بات تو سن لو میری۔" بیلا جھلا گئی تھی۔

"اچھا......" چاکلیٹ کا سن کر وہ فوراً بیلا کی بات سننے پہ آمادہ ہو گیا تھا۔ دس سالہ عاطف اکلوتا تو تھا ہی اور عائشہ پھپھو کی شادی کے پورے بارہ سال بعد پیدا ہوا تھا، اس لیے سب کا ہی لاڈلا تھا۔

"میں پوچھ رہی تھی کہ دادا جی سے بات ہوتی ہے تمہاری۔" بیلا اب براہ راست مطلب کی بات پر آ گئی تھی۔

"جی بیلا آپی! ہوتی رہتی ہے کیوں؟"

"وہ میری کب سے بات نہیں ہوئی ناں دادا جی سے۔" بیلا نے منہ لٹکاتے ہوئے کہا۔

"اچھا، مگر میرے دادا جی سے آپ بات کرتی ہی کیوں تھیں۔" وہ اب الجھ کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"اف، بدھو۔ اپنے دادا جی کی بات کر رہی ہوں۔ یعنی تمہارے نانا جان، قاری عبدالوہاب صاحب۔" بیلا جھنجھلا کر دانت پیس رہی تھی۔

"اوپس، سمجھ گیا۔" عاطف تھوڑا شرمندہ ہوا۔

"مگر کیوں......؟ وہ تو دو، تین دن سے زیادہ آپ سے بات کیے بنا رہ ہی نہیں سکتے تھے۔" عاطف حیران ہوا تھا۔

"وہ بس تھوڑا ناراض ہیں ناں مجھ سے۔ تم ایسا کرو، اپنا لیپ ٹاپ لے آؤ اسکائپ پہ بات کرتے ہیں دادا جی سے، بلکہ نہیں، ایسا کرتے ہیں تمہارے روم میں چلتے ہیں۔"

عائشہ پھپھو کو دیکھتے ہوئے بیلا نے فوراً ہی پروگرام میں تبدیلی کی تھی۔

"ہاں چلیں پھر۔ مگر پہلے چاکلیٹ تو دے

یں۔'' عاطف چلنے پہ تو فوراً آمادہ ہو گیا تھا مگر ساتھ
ں اسے چاکلیٹ بھی یاد آ گئی تھیں۔
''تم چلو تو...... دے دوں گی تمہیں۔'' بیلا نے
سے آگے کی طرف دھکیلا۔
''اوکے۔'' وہ سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔
''ارے کدھر جا رہے ہو؟ بیلا! کھانے میں تو
کچھ دیر ہے، جوس لا رہی ہوں تمہارے لیے۔''
ھوپھو انہیں اوپر جاتا دیکھ کر کچن سے نکلی تھیں۔
''رہنے دیں پھوپھو! کھانا بنوائیں اچھا سا۔
کھانا ہی کھائیں گے بس۔'' بیلا سیڑھیاں چڑھتے
ہوئے مڑے بغیر بولی۔
''ارے عاطف! کدھر لے جا رہے ہو اسے،
بھی تو آئی ہے۔ پھر اسے کوئی فضول چیز دکھائی ہو گی
بچی۔'' پھوپھو اب عاطف پہ ناراض ہو رہی تھیں۔
''مما میں تو...... یہ بیلا آپی......''
''اچھا کچھ نہیں کہہ رہیں پھوپھو! چلو۔'' بیلا
نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اس کا ہاتھ کھینچا۔ عائشہ
پھوپھو۔ نے حیرت سے ان کے انداز ملاحظہ کیے۔
''یہ آج کل کے بچے......''
ان کا پسندیدہ موضوع شروع ہو چکا تھا مگر ان
کی سننے کے لیے فی الحال کوئی نہیں تھا۔ سو وہ دل
مسوس کر رہ گئیں۔

☆☆☆

اپنے بیڈ روم میں وہ بہت دل شکستہ سے بیٹھے
قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے، ویسے بھی بیلا
کے دبئی جانے کے بعد وہ بے حد خاموش سے ہو گئے
تھے۔ اور انہوں نے خود کو بیڈ روم اور عبدالرحمٰن
صاحب کے پورشن میں بنائی گئی اپنی لائبریری تک ہی
محدود کر لیا تھا۔ پوتے، پوتیاں زیادہ اصرار کرتے تو
ان کے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھ جاتے مگر عمر کے آخری
حصے میں انہیں جو دھچکا لگا تھا، وہ یہ سہ نہیں پا رہے
تھے۔
بیلا کا گلوکارہ بننا ہی وہ سہ نہیں پائے تھے اوپر
سے اس انڈین گلوکار کے ساتھ سامنے آنے والا اس

کا اسکینڈل...... وہ بے خبر تو نہیں تھے، رہ بھی نہیں سکتے
تھے۔ جب سے بیلا دبئی گئی تھی، وہ جیسے اس کے پل
پل کی خبر رکھ رہے تھے اور اس کا اسٹائل، بے حد
ماڈرن لک دیتے کپڑے اور میک اپ۔ وہ اندر ہی
اندر کڑھتے رہتے تھے۔
پتا نہیں کیا کوتاہی ہوئی تھی مگر جو سزا مقدر بنی تھی
وہ بہت کڑی تھی۔ قرآن پاک کی تلاوت کرتے
ہوئے کب ان کی آنکھوں میں آنسو آئے، انہیں پتا
ہی نہیں چلا۔
تب ہی ان کے دروازے پر دستک ہوئی
تھی۔ انہوں نے نظر اٹھا کر وال کلاک کی طرف
دیکھا، ظہر کی نماز میں کچھ ہی دیر تھی۔ انہوں نے
قرآن پاک بند کیا۔ چشمہ اتار کر آنکھوں کو ہلکے سے
تھپتھپایا گویا اپنے آنسوؤں کے نشانات کو مٹایا تھا۔
''آجاؤ۔'' قرآن پاک کو غلاف میں لپیٹتے
ہوئے انہوں نے اجازت دی تھی۔
''دادا جی! یہ عاطف بات کرے گا، اسکائپ پہ
آپ سے۔'' خولہ لیپ ٹاپ اٹھائے اندر آئی تھی۔
''عاطف......'' ان کے لبوں پر مسکراہٹ آئی۔
اپنا یہ نواسا انہیں بے حد عزیز تھا۔ خولہ نے لیپ ٹاپ
ان کے آگے سیٹ کر دیا تھا۔
''السلام علیکم گرینڈ پا! کیسے ہیں آپ؟''
عاطف مسکراتے ہوئے انہیں دیکھ رہا تھا۔
''وعلیکم......'' اور ان کا جواب منہ میں ہی رہ گیا
تھا۔
''السلام علیکم دادا جی!'' عاطف کو ایک طرف
کر کے بیلا اب اس کے ساتھ بیٹھ رہی تھی۔
''تم......؟'' وہ ایک پل کو ہکا بکا رہ گئے مگر اگلے
ہی پل سنبھل بھی گئے تھے۔ خولہ نے چونک کر ان کے
پھیکے پڑتے چہرے کو دیکھا تھا۔
''وعلیکم السلام...... عاطف بیٹا! میری نماز کا
وقت ہو رہا ہے، پھر بات کرتے ہیں۔'' وہ دانستہ بیلا
کو دیکھنے سے گریز کر رہے تھے۔
''مجھ سے بات کریں دادا جی! میں آپ کی

اجازت سے ادھر آئی ہوں، پھر یہ ناراضی کیسی؟''
بیلا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ عبد الوہاب صاحب کے دل کو کچھ ہوا۔ جس اولاد کے ہمیشہ لاڈ اٹھائے ہوں، ہمیشہ محبت دی ہو، وہ لاکھ ناراضی کے باوجود دل سے نہیں نکلتی۔ پورے طمطراق سے دل میں براجمان رہتی ہے۔ نکال سکتے ہو تو دل سے نکال کر دکھاؤ، لاکھ کوشش کرو، نکلتی نہیں۔ درد بن کر، روگ بن کر دل میں ہی رہتی ہے۔ بیلا بھی ان کے دل کا اب ایسا ہی درد اور روگ بن چکی تھی اور یہ درد دل سے نکلنے والا نہیں تھا۔
''نماز کو دیر ہو رہی ہے، بیٹا...... فی امان اللہ۔''
وہ چاہ کر بھی اپنا لہجہ سپاٹ نہیں رکھ سکے تھے۔ اسے اللہ کے سپرد کرتے ان کی آواز کپکپائی تھی۔ رخ موڑ کر انہوں نے خولہ کی طرف دیکھا۔
''لے جاؤ اسے۔''
ان کا اشارہ لیپ ٹاپ کی طرف تھا۔ جہاں سے بیلا کی سسکیوں کی آواز آ رہی تھی اور ان کے دل کا درد بھی، بڑھتا جا رہا تھا۔ لیپ ٹاپ آف کر کے خولہ نے ان کی طرف دیکھا اور پھر ان کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر بوکھلا گئی تھی۔

☆☆☆

''بیلا بیٹا! ٹھیک سے کھاؤ، کھانا اچھا نہیں لگ رہا کیا؟'' عائشہ پھوپھو نے بیلا کو بے دلی سے چمچہ پلیٹ میں ادھر سے اُدھر چلاتے ہوئے دیکھا تو پیار سے کہا۔
''نہیں...... نہیں پھوپھو! بہت اچھا بنا ہے کھانا۔ خاص کر بریانی بہت مزے کی بنی ہے۔'' بیلا نے فوراً انہیں تسلی دی تھی۔ اب کیا بتاتی کہ دادا جان کے بات نہ کرنے کی وجہ سے وہ بے حد ڈسٹرب ہو گئی تھی۔ کچھ اس نے انہیں دیکھا بھی بہت عرصہ بعد تھا اور وہ اسے بہت کمزور لگے تھے، تو کیا وہ بیمار تھے؟
''ہاں بیٹا! تمہاری وجہ سے آج ہمیں بھی ان کے ہاتھ کی بنی بریانی نصیب ہو گئی ہے ورنہ تو وہی کک کے بنے ہوئے بدمزا کھانے کھانا پڑتے ہیں۔'' امجد انکل نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تھا۔
''جی، جی...... اتنے ہی مظلوم ہیں نا آپ۔'' عائشہ پھوپھو نے انہیں ہنستے ہوئے گھورا تھا۔ تب ہی کچن سے موبائل کی رنگ ٹون سنائی دی۔
''ارے میرا موبائل کچن میں ہی رہ گیا شاید۔'' عائشہ پھوپھو نے ڈائننگ روم سے ملحقہ کچن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''دیکھوں تو، پتا نہیں کس کی کال ہے؟'' وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولیں۔
''رہنے دیں، کھانا کھائیں آرام سے۔ بعد میں کال بیک کر لیجیے گا۔'' امجد انکل نے کہا تو عائشہ دوبارہ بیٹھ گئیں۔ موبائل بھی بج بج کر خاموش ہو چکا تھا۔
تب ہی امجد انکل کے موبائل پہ کال آنے لگی۔
''اوہو......'' وہ سائیڈ پاکٹ میں ہاتھ ڈالتے بدمزا سے ہوئے۔
''کھانا کھاتے ہوئے موبائل آف رکھنا چاہیے ویسے...... کیوں بیلا!'' موبائل نکالتے ہوئے انہوں نے بیلا کو بھی شامل گفتگو کیا تھا۔
''عبد الباسط بھائی کی کال......'' موبائل پہ بلنک ہوتے نام کو دیکھ کر وہ تھوڑا حیران ہوئے۔ عائشہ نے بھی چونک کر انہیں دیکھا۔
''اٹینڈ تو کریں کال، پتا نہیں کیا بات ہے۔''
''ہاں......'' انہوں نے اثبات میں جواب دیا اور اٹھ کر ایک دو قدم آگے چلے گئے۔ بیلا اور عاطف بھی ان ہی کی طرف متوجہ تھے۔
''ہیلو...... جی السلام علیکم بھائی......'' وہ ایک پل کو خاموش ہوئے اور دوسری طرف سے آنے والی آواز کو بغور سنا۔
''جی، جی اللہ کا شکر ہے۔ خیریت ہے۔ کھانا کھا رہے تھے۔ آپ سنائیں...... جی......؟ کیا......؟ اچھا...... مگر کب؟ جی...... ٹھیک ہے۔ اوکے...... اوکے۔ فکر مت کریں اللہ خیر کرے گا۔'' وہ پریشانی

سے کہتے تھوڑا سائیڈ پہ چلے گئے۔
"جی...... ہم پہلی دستیاب فلائٹ سے آتے ہیں۔"
"پہلی دستیاب فلائٹ سے آتے ہیں؟"
عائشہ پھوپھو نے ان کے الفاظ دہراتے ہوئے بیلا کو دیکھا۔ وہ خود بھی خوف زدہ انداز میں انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔
"اللہ خیر کرے۔"
وہ پھر امجد صاحب کی طرف متوجہ ہوئیں، جو فون بند کر کے اب ان کی طرف ہی آرہے تھے۔
"کیا ہوا، خیریت؟" عائشہ نے بے قراری سے پوچھا۔ عاطف بھی کھانا چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔
"ہاں، وہ قاری صاحب......" وہ ایک پل کو رکے۔
"کیا ہوا...... بابا جان کو کیا ہوا...... وہ ٹھیک تو ہیں؟" عائشہ پھوپھو بے قراری سے بولی تھیں جبکہ بیلا یک ٹک انہیں دیکھے جارہی تھی۔
"ہاں وہ انہیں...... ہسپتال لے گئے ہیں تو عبد الباسط بھائی کہہ رہے تھے کہ اگر آسانی سے آسکتے ہو تو عائشہ کو ملوانے لے آؤ۔ بابا جان یاد کر رہے ہیں۔"
"ہسپتال لے گئے ہیں، کیوں؟ کیا ہوا ہے انہیں؟ کل تک تو ٹھیک تھے۔ بات ہوئی ہے میری کل ان سے۔" عائشہ پھوپھو بے قراری سے بولیں۔
"جی پاپا! ماما ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ گرینڈ پا تو بالکل ٹھیک ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو میری اور بیلا آپی کی بات ہوئی ہے ان سے۔ ہے ناں بیلا آپی!"
عاطف نے معصومیت سے بیلا کی طرف دیکھا۔
"جی انکل۔ دادا جی تو بالکل ٹھیک تھے، ابھی تھوڑی دیر پہلے بات ہوئی ہے ہماری۔" بیلا بمشکل بولی تھی۔
"ہاں...... وہ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔"
امجد انکل کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔
"امجد...... میرے بابا...... سچ بتائیں، انہیں کیا ہوا۔ ایسے تو نہیں آپ پاکستان جانے پہ راضی ہو گئے۔ ورنہ چھ ماہ ہو گئے ہیں، آپ سے کہہ رہی ہوں۔ سچ سچ بتائیں، کیا ہوا ہے میرے بابا کو۔"
عائشہ پھوپھو، امجد انکل کا بازو پکڑے انہیں اپنی طرف موڑتے، بے ربطی سے بولتے، اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھیں۔ ان کی بات سن کر اب تک چپ کھڑے بیلا اور عاطف رونے لگے تھے۔
"پاگل ہوئی ہو کیا؟ سنبھالو خود کو۔ بچوں کو دیکھو، ڈرا دیا ہے تم نے انہیں۔ کچھ نہیں ہوا۔ دعا کرو اللہ سے بہتری کی۔ ہسپتال لے گئے ہیں انہیں۔ حالت خطرے میں ہے مگر خدانخواستہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ حوصلہ کرو۔" انہوں نے عائشہ پھوپھو کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کہتے ہوئے جھنجوڑا تو وہ ان کے بازو سے سر ٹکا کر رونے لگی تھیں۔
"ارے بھئی بیلا! سنبھالو بھئی اپنی پھوپھو کو۔ کچھ نہیں ہوا، خدانخواستہ۔ میں ذرا فلائٹس کا پتا کرتا ہوں۔ کمال ہے۔" وہ جھلا گئے تھے۔ انہوں نے دھیرے سے عائشہ پھوپھو کو خود سے الگ کیا۔
"انکل......" بیلا نے عائشہ پھوپھو کے قریب جا کر ان کے کندھے پہ تسلی دینے کے انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے امجد انکل کو مخاطب کیا۔
"جی بیٹا؟" وہ موبائل پہ نمبر ملاتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔
"میری سیٹ بھی اپنے ساتھ کنفرم کروا دیں۔"
"جی، جی بیٹا۔ میں کروا رہا ہوں۔"
عائشہ پھوپھو نے آنسو بھری آنکھوں سے بیلا کو دیکھا، اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔
"تمہارا پروگرام؟" انہوں نے دھیرے سے کہا۔
"دادا جی سے زیادہ اہم تو نہیں ہے۔" بیلا ہونٹ کاٹ کر رہ گئی
"اب کیا فائدہ بیلا!" وہ کہنا چاہتی تھیں، مگر جانے کیا سوچ کر چپ رہ گئیں
☆☆☆

میشا ایرپورٹ پر تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد بیلا کی پاکستان کی فلائٹ تھی اور وہ اسے ایک آخری بار سے سمجھانا چاہتی تھی۔ جب سے بیلا نے اسے اپنے پاکستان جانے کا بتایا تھا، وہ اور شوکت تب سے اسے سمجھا رہے تھے کہ اس اسٹیج پہ اس کا دبئی چھوڑ کر جانا بے حد نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے مگر وہ کچھ سننے پر راضی ہی نہیں ہو رہی تھی۔

جب دل میں غم کی آگ دہک رہی ہو، کسی بہت عزیز ہستی کے بچھڑ جانے کا ڈر ہو تو کسی نفع، نقصان کی پروا نہیں رہتی۔ انسان کچھ سمجھنا تو کیا سننا بھی نہیں چاہتا۔ وہ بھی نہ کچھ سننا چاہتی تھی نہ سمجھنا۔ میشا نے ابھی تک نانا جی کو یوں بیلا کے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان واپس جانے کے بارے میں نہیں بتایا تھا مگر کب تک؟ وہ بیلا کے ساتھ ہی بیٹھی، پریشانی کے عالم میں لب چباتے ہوئے بات کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہی تھی۔ فون پہ او جھل رہ کر صرف آواز سن کر بات کرنا آسان تھا مگر یوں آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرنا، جبکہ اس کی سوجی ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی ہے اور اس کے ساتھ بیٹھی پھوپھو کی آنکھوں سے اب بھی وقفے وقفے سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

اب وہ انہیں کیسے سمجھاتی کہ جیسا وہ سمجھ رہی ہیں، ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس نے اپنے ذرائع سے پتا کروایا تھا، نیلم خود جا کر ہسپتال میں انہیں دیکھ کر آئی تھیں، وہ زندہ تھے اور ان کا علاج چل رہا تھا۔ اگرچہ ان کی حالت ابھی خطرہ سے باہر نہیں تھی اور وہ ابھی کسی سے ملنے یا بات کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھے مگر......

ان کی چلتی سانسیں، دل کی دھڑکن اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ زندہ ہیں۔ بھلے بے ہوش تھے، کسی سے بات کرنے تو کیا یہ دیکھنے کی بھی پوزیشن میں نہیں تھے کہ ان کے پاس ان کے اپنوں میں سے کون موجود ہے اور کون آیا ہی نہیں۔ تو ایسے میں اگر بیلا چلی بھی جاتی تو کیا کر سکتی تھی۔ صرف ہسپتال میں ان کے کمرے کے سامنے بیٹھ کر ان کے لیے دعا کرنے کے تو دعا تو وہ یہاں بھی کر سکتی تھی اور یہ بات وہ اسے پہلے بھی سمجھا چکی تھی اور اب ایک آخری کوشش کرنے پھر ایرپورٹ پہ چلی آئی تھی۔

''بیلا......'' آخر اس نے گہری سانس لے کر بیلا کو مخاطب کیا۔

''تمہارا کانٹریکٹ ہوا تھا باقاعدہ۔ تم اس بات کی پابند ہو کہ پروگرام کے لاسٹ ایپی سوڈ تک تم ان کی پرمیشن کے بغیر دبئی چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتیں۔''

''تو......؟'' بیلا نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے آپ سے کہا تو تھا کہ ایمرجنسی کا کہہ کر پرمیشن لے لیں، ان سے آپ نے بات نہیں کی پھر۔''

''میں نے بات کی تھی۔ ابھی بھی کوشش کر رہی ہوں مگر سمجھنے کی کوشش کرو، یہ کوئی اتنی ایمرجنسی نہیں ہے۔ تمہارے دادا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے، خدانخواستہ وہ کوئی......''

وہ ایک پل کو رکی، جیسے کچھ کہنے یا نہ کہنے کے درمیان معلق ہو، پھر جیسے بات بدل گئی۔

''اور نانا جی۔ ان کا بھی تو سوچو، ان کی پوری زندگی کی خلش، ان کی خواہش......ان کو کیا جواب دو گی تم؟''

میشا نے دزدیدہ نظروں سے عائشہ پھوپھو کو دیکھتے ہوئے بات مکمل کی تھی۔ اگرچہ وہ میشا کے بات شروع کرتے ہی عاطف کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں مگر یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اتنے پاس بیٹھے انہوں نے اس کی بات سنی ہی نہیں ہو۔

''میں کوئی پروگرام چھوڑ تو نہیں رہی۔'' بیلا جھلا گئی تھی۔

''ویسے بھی ابھی تو دس دن ہیں۔ میں خود اپنی آنکھوں سے دادا جی کو دیکھ لوں، تسلی کر لوں اپنی۔ پھر آ جاؤں گی واپس۔ آئی پرامس۔'' اس نے میشا کا ہاتھ پکڑ لیا اور رو دی۔

"ابھی جانے دو مجھے پلیز...... پلیز......" وہ اب ہچکیوں سے رو رہی تھی۔
میشا نے بے بسی سے اسے دیکھا۔
"اوکے، اوکے...... تم جاؤ۔" وہ ہولے سے اس کے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے بولی۔
"میں کوشش کرتی ہوں، مما سے بھی بات کرتی ہوں۔ کرتی ہوں کچھ...... پلیز رونا بند کرو اب۔ پبلک پلیس ہے۔ دیکھ رہے ہیں سب، ویسے بھی سلیبریٹی بن گئی ہو تم۔ کسی نے ویڈیو بنالی تو مشکل ہو جائے گی۔"
میشا نے دانستہ ہلکا پھلکا لہجہ اختیار کیا تھا اور بیلا دونوں ہتھیلیوں سے آنسو صاف کرتی خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔
☆☆☆
ایر پورٹ پر ولی انہیں لینے آیا تھا۔ تھکا ہوا اور نڈھال سا۔ بیلا کو دیکھ کر پھیکا سا مسکرایا۔ بیلا کو لگا کچھ کہنا چاہتا تھا شاید مگر کہتے کہتے رک گیا تھا۔
"بابا کیسے ہیں ولید!" عائشہ پھوپھو بے قراری سے بولی تھیں۔
"دعا کریں پھوپھو! اگلے بارہ گھنٹے کافی کریٹکل ہیں۔ ہوش آ گیا تو ٹھیک، ورنہ کومے میں بھی جا سکتے ہیں۔" بالوں میں ہاتھ چلاتا ولی، بے چین سا تھا۔
"آپ چلیں...... میں آپ کا سامان لے کر آتا ہوں۔"
"سامان نہیں ہے ولی! بس یہی ہینڈ بیگ ہیں۔" عائشہ پھوپھو نے اسے روکا۔
"تم مجھے بابا جان کے پاس لے چلو بس۔"
"جی چلتے ہیں۔ حوصلہ رکھیں پھوپھو۔" وہ ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر ان کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔
"امجد انکل نہیں آئے۔" اس نے دانستہ بات بدلی تھی۔
"ہاں۔ بس یہی تین سیٹیں تھیں اس فلائٹ میں تو...... وہ اگلی فلائٹ سے آ رہے ہیں۔" وہ دھیرے سے بولیں۔ پھر گاڑی میں بیٹھنے تک وہ خاموش ہی رہے تھے۔
"ولی! تم گھر کیوں جا رہے ہو۔ ہسپتال چلو۔" ولی کو گھر کی طرف جانے والی سڑک کا موڑ کاٹتے دیکھ کر عائشہ پھوپھو نے گاڑی میں چھائی خاموشی کو توڑا تھا ورنہ ابتدائی بات چیت کے بعد سے وہ سارا راستہ خاموشی سے باہر دیکھتے رہے تھے۔
"آپ لوگ پہلے ریسٹ کر لیتے تو......" ولی دھیرے سے بولا۔
"نہیں، نہیں ولی...... تم ہمیں ہسپتال لے چلو۔ ریسٹ ہی کرتے آئے ہیں۔ پیدل تو نہیں آئے۔" بیلا بے قراری سے بولی تو ولی نے گہرا سانس لیتے ہوئے گاڑی واپس موڑ لی۔
"رانیہ اور مریم آنٹی بھی گھر پر تھے تو میں اس لیے کہہ رہا تھا۔ ان سے بھی مل لیتیں۔"
"مل لوں گی ان سے بھی......اور بابا وہ گھر پر ہیں یا ہسپتال میں؟"
وہ گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے بے چین سی تھی۔ یوں جیسے گاڑی سے نکل کر، اڑ کر دادا جی کے پاس پہنچنا چاہتی ہو۔
"وہ ایمن اور تانیہ آپی کے لیے رک گئے تھے۔ ان کے ساتھ آئیں گے، پہنچ رہے ہیں تھوڑی دیر تک۔" ولی نے دھیرے سے اسے آگاہ کیا تھا۔
اور پھر ہسپتال پہنچنے تک خاموشی رہی تھی۔ سب ہی جیسے اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ حتیٰ کہ عاطف بھی اپنی ساری شوخی بھلائے سہما سا بیٹھا تھا۔
☆☆☆
"دادا جی کی یہ حالت تمہاری وجہ سے ہوئی ہے بیلا!"
بیلا نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں اور تڑپ کر سیدھی ہوئی۔ گھڑی کی ٹک ٹک میں وہی آواز تھی۔
"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے بیلا......!

تم...... تم ہو وجہ۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔
سامنے دیوار پہ لگی پینٹنگ میں بیٹھا پرندہ اچانک بول اٹھا۔
"تمہاری وجہ سے ہوا بیلا...... تم ہو ذمہ دار اس سب کی۔"
"نہیں ہوں میں ذمہ دار۔ کچھ نہیں کیا میں نے۔" وہ چیخ اٹھی۔ پھر خود ہی اپنی آواز سے سہم گئی۔
دیواریں جیسے اس پر چڑھتی آرہی تھیں۔
"نہ تم اس پروگرام میں جاتیں...... نہ تم اس پروگرام میں...... نہ تم......"
"کچھ نہیں کیا میں نے...... کچھ نہیں کیا۔"
وہ اب گھٹنوں میں منہ دے کر ہچکیوں سے رو رہی تھی۔
"خولہ! میں نے کچھ نہیں کیا۔"
وہ جیسے ایک بار پھر وہیں ہسپتال کے ٹھنڈے کوریڈور میں جا پہنچی تھی، سب کے بیچ مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔
"کیوں کیا تم نے دادا جی کو فون۔ دل تو پہلے ہی توڑ دیا تھا تم نے ان کا۔ جان لینا چاہتی تھیں کیا...... تو لو...... لے لی تم نے ان کی جان۔"
"خولہ!"
اس کی بات پہ ایک دم بیلا کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔
"کیا ہو گیا ہے خولہ! حوصلہ کرو۔" شہریار بھائی نے خولہ کو بازو سے تھاما۔
"دیا......" پھر انہوں نے روتی ہوئی خدیجہ کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ تو وہ بے اختیار بیلا کی طرف بڑھی۔
"دیا! دادا جی...... دادا جی...... دیا۔" بیلا ایسے تڑپ کر روئی کہ خدیجہ کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔
"کچھ نہیں ہوا انہیں۔ ٹھیک ہیں وہ۔ دعا کرو تم۔" خدیجہ نے اسے ساتھ لگا کر جیسے حوصلہ دیا تھا۔
"میں نے کچھ نہیں کیا دیا! یقین کرو میرا...... میں تو صرف بات کرنا چاہتی تھی دادا جی سے......"

وہ رک رک کر آنسوؤں کے درمیان کہتی، خدیجہ کو بہت قابل رحم لگی تھی۔
"بالکل یہی بات ہے۔ کوئی کسی کی وجہ سے بیمار تھوڑی ناں ہوتا ہے۔ تم کیوں اتنا......"
"ہاں، مگر دادا جی کی بیماری کی وجہ یہی ہے۔ یہ رابیل عبدالرحمن ذمہ دار ہے اس سب کی۔" خولہ نے خدیجہ کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی تھی۔ "اگر دادا جی کو کچھ ہوا......"
"خولہ......!"
تب ہی عبدالواحد صاحب کی آواز پر وہ چونکے۔ وہ ابھی ڈاکٹر سے عبدالوہاب صاحب کی کنڈیشن کا پتا کر کے آئے تھے۔ جب خولہ کی آواز ان کے کانوں میں پڑی تو انہوں نے بے اختیار اسے ٹوکا تھا۔
"یہ آپس میں جھگڑنے کا کون سا وقت ہے بیٹا۔" وہ ان سب کی روئی روئی نڈھال صورتیں دیکھ کر بے حد ضبط سے بولے۔
"خیر کی دعا کرو اللہ سے۔ عائشہ، عاطف بیٹا! بابا سے تو ملنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ تم لوگ جاؤ، ریسٹ کر لو۔ جاؤ بیلا بیٹا! آپ بھی پھوپھو کے ساتھ جاؤ۔"
"بھائی جان!" ان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہی عائشہ سسک اٹھی تھیں۔
"بابا جان!"
"نہیں ہے کوئی اتنا سیریس مسئلہ۔ ٹھیک ہو جائیں گے وہ۔ اللہ خیر کرے گا، دعا کرو۔"
انہوں نے ان کا سر تھپکتے ہوئے تسلی دی تھی اور بیلا ایک طرف کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔
اس نے شدت سے نوٹ کیا تھا۔ عبدالواحد صاحب کے انداز میں پہلے سا پیار مفقود تھا۔ وہ اور بھی ڈسٹرب ہوئی تھی پھر گھر آ کر سب سے ملنے کے بعد بھی وہ ڈسٹرب ہی رہی تھی۔ ابھی بھی رانیہ اسے تھوڑی دیر آرام کرنے کا مشورہ دے گئی تھی۔ پھر پاپا، ایمن اور تانیہ آپی آ جاتیں تو ان کے ساتھ ہسپتال

چلے جاتے۔ شاید تب تک دادا جی کو ہوش آ جاتا لیکن...... اگر...... دادا جی کو ہوش نہ آیا تو...... وہ دل کہہ رہا تھا کہ وہ کوما میں چلے جاتے۔

یہ صرف دادا جی کے بچھڑ جانے کا خوف نہیں تھا جس نے اسے بے چین کیا ہوا تھا۔ یہ ایک طرح کا احساس جرم تھا۔ دادا جی کی اس حالت کا ذمہ دار، وہ کہیں نہ کہیں...... لاشعوری طور پر خود کو ہی سمجھ رہی تھی اور اب خولہ کے باقاعدہ الزام نے اس احساس جرم کو لاشعور سے شعور میں لا پٹخا تھا۔

☆☆☆

نیلم اور ایشاع پریشانی کے عالم میں ہسپتال کے ویٹنگ روم میں بیٹھی تھیں۔ استاد امانت علی کو انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔ وہ دونوں لاہور میں تھیں اور استاد صاحب کے گھر ہی مقیم ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ ہی ہسپتال آئی تھیں۔ اگرچہ ڈاکٹرز نے انہیں کافی تسلی دی تھی اور ان کی حالت کو اب خطرے سے باہر قرار دیا تھا مگر ان کا دل ڈر سے کانپ رہا تھا۔ شاید انہیں بیلا کے دادا جی کا خیال آ گیا تھا۔ انہیں بھی تو ہارٹ اٹیک ہی ہوا تھا اور اب وہ کوما میں تھے اور پتا نہیں انہیں کب تک کوما میں ہی رہنا تھا اور اب...... پتا نہیں بابا کو کیا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹرز تو کہہ رہے تھے کہ معمولی سا انجائنا کا اٹیک ہوا تھا اور خطرے کی کوئی بات نہیں ہے مگر......

''مما!'' تب ہی ایشاع کی آواز پہ نیلم اپنے خیالات سے باہر آئی تھیں۔

''ہاں؟'' انہوں نے چونک کر ایشاع کو دیکھا۔

''کہیں نانا جی نے اسٹریس تو نہیں لیا؟ آئی مین بیلا ابھی تک واپس دبئی نہیں گئی اب تو پروگرام میں صرف دو دن ہی رہ گئے ہیں اور اس نے کوئی تیاری کی نہ ہی واپس جانے کا کہا ہے۔'' وہ ایک پل کو رکی۔

''ابھی کل میری نانا جی سے بات ہوئی تو وہ بہت ڈسٹرب لگے مجھے۔ وہ کہتے نہیں مما! مگر اس پروگرام میں جیت بیلا کی ہو، بہت خواہش ہے ان کی۔''

ایشاع جیسے بہت سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔ نیلم ایک پل کو چپ کی چپ رہ گئیں۔

''لیکن بیلا نے یہ تو نہیں کہا کہ پروگرام چھوڑ رہی ہے اور وہ ایسے چھوڑ بھی نہیں سکتی۔ کانٹریکٹ کیا ہے اس نے اتنا بڑا پروگرام...... کوئی مذاق تو نہیں کہ ایسے ہی چھوڑ دے۔ میں بات کرتی ہوں اس سے۔ میں ابا جی کو اس عمر میں کوئی صدمہ اسے دینے نہیں دوں گی۔'' نیلم نے لب چباتے ہوئے کہا۔

''مما! تو پھر یہی صحیح وقت ہے، آپ ابھی بیلا کو فون کریں۔ اور اسے نانا جی کے بارے میں بتائیں۔ جتنا اسے اپنے دادا جی سے پیار ہے، اتنا ہی نانا جی سے بھی ہے۔ اگر وہ سمجھتی ہے کہ دادا جی اس کی وجہ سے اس حال کو پہنچے ہیں تو اس کے مائنڈ میں یہ بات ڈال دیں کہ اگر اس نے پرگرام نہیں کیا تو نانا جی کا بھی وہی حال ہو سکتا ہے۔'' ایشاع نے پرخیال انداز میں کہا۔

''ایشاع ...... مگر......'' نیلم تذبذب کا شکار تھیں۔

''وہ پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہے۔ یہ تو اسے پریشرائز کرنے والی بات ہو گی اور بابا تو ٹھیک ہیں بالکل۔ ابھی انہیں روم میں شفٹ کر دیں گے تو میں ایسے کیسے۔'' نیلم کا دل نہیں مان رہا تھا۔

''آپ چاہتی ہیں کہ بیلا اس پروگرام کو جاری رکھے تو آپ کو اسے اس بات کا یقین دلانا ہو گا کہ اس کی جیت سے ہی نانا جی کی زندگی مشروط ہے۔ ورنہ اگر وہ گئی بھی تو ایسے ہی بددلی سے گائے گی اور ہار کر آ جائے گی۔ اس کے فائنل تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ جیتنے کے لیے پوری جان لگا دے اور یہ اسی صورت میں ہی ممکن ہے جب آپ اس سے ایسے بات کریں گی۔'' ایشاع جیسے انہیں سمجھا رہی تھی۔

''بابا کو شفٹ کر دیا ہے روم میں۔ ہوش میں ہیں وہ۔ اب مل سکتے ہیں ان سے۔'' غلام حسین نے آ کر انہیں اطلاع دی تو وہ دونوں جیسے پرسکون سی

ہو گئیں۔

"شکر ہے میرے اللہ تیرا۔" نیلم مسکرا کر اٹھیں۔

"مریم کو بتایا؟" وہ اب غلام حسین سے مخاطب تھیں۔

"نہیں، ابھی نہیں بتایا۔ ویسے بھی وہ کراچی میں ہے ابھی تو...... میں نے سوچا، پہلے بابا کو شفٹ کر دیں روم میں تو تسلی سے بتاؤں گا اسے۔ ویسے بھی بڑی جلدی پریشان ہو جاتی ہے وہ۔ جھلی نہ ہو تو...... ابھی کال کرتا ہوں۔"

وہ نیلم اور ایشاع کے ساتھ استاد صاحب کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے ہلکا سا مسکراتے ہوئے بتا رہے تھے۔

"انکل! آپ کال مت کریں، میں بتاتی ہوں انہیں۔ پہلے نانا جی سے مل لیں۔" ایشاع نے انہیں موبائل نکالتے دیکھ کر دانستہ روکا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے پھر۔ بیٹا تسلی سے، آرام سے بتانا۔ پہلے ہی وہ بیلا کے دادا جی کی وجہ سے پریشان ہیں سارے۔ ٹھیک ہے ناں، آرام سے، طریقے سے۔" انہوں نے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے ایشاع کو سمجھایا تھا۔

"جی جی۔ آپ بے فکر رہیں۔" ایشاع نے مسکراتے ہوئے انہیں تسلی دی اور ان کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گئی۔

☆☆☆

بیلا نڈھال سی قالین پر بیٹھی تھی اور سر بیڈ کی پٹی سے ٹکایا ہوا تھا۔ دادا جی کوما میں چلے گئے تھے اور بیلا کو لگ رہا تھا کہ ایسا اس کے گلوکارہ بننے کی وجہ سے ہوا...... اگر وہ اس پروگرام میں نہ جاتی، وہاں گانا نہ گاتی تو شاید...... اور اس نے سوچا کہ وہ یہ پروگرام چھوڑ دے۔ ہاں یہ مقابلہ اگرچہ اس کے لیے اہم تھا، بہت اہم...... مگر اس کے دادا جی سے زیادہ اہم تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے پتا تھا پروگرام اس اسٹیج پہ چھوڑنے کا کیا نتیجہ نکلنا تھا۔ اسے ملک بھر میں شدید تنقید کا نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ شاید وہ بھی گلوکارہ نہ بن سکتی، شہرت کی ان بلندیوں کو نہ چھو سکتی جن کا خواب وہ ہمیشہ سے دیکھتی آ رہی تھی مگر وہ اس شرمندگی کے ساتھ بھی تو نہیں جی سکتی تھی۔ دادا جی کو اگر کچھ ہو جاتا تو...... کیا وہ خود کو کبھی معاف کر سکتی؟"

وہ ایک دم سے اٹھی۔ آئینے کے سامنے جا کر چہرہ تھپتھپایا۔ بالوں کو گول مول کر کے جوڑے کے انداز میں لپیٹا اور دوپٹہ سر پر ڈال کر باہر نکل گئی۔ چار سے چھ دادا جی سے ملنے کا ٹائم تھا اور ابھی شام کے پانچ ہی بجے تھے، وہ اگر تیزی سے جاتی تو انہیں دیکھ سکتی تھی۔ ان سے مل سکتی تھی۔ کیا پتا وہ اس کی آواز سن لیتے، انہیں پتا چل جاتا کہ وہ لوٹ آئی ہے۔

"بیلا! کہاں جا رہی ہو۔" اسے تیزی سے گیراج کی طرف جاتا دیکھ کر لان میں بیٹھی مریم اور تائی جی نے حیرت سے اسے دیکھا پھر مریم نے پوچھ لیا۔

"میں دادا جی سے ملنے......" وہ ذرا کی ذرا رک کر بولی۔

"مگر ابھی ولید اور عبدالرحمٰن جا رہے تھے، تب تو تم نے منع کر دیا تھا۔" مریم نے الجھے ہوئے انداز میں اس کے ٹوٹے بکھرے وجود کو دیکھا اور انہیں دکھ ہوا تھا۔ یہ کیا حال بنا لیا تھا اس نے۔

"ہاں بس وہ......" وہ پتا نہیں منہ ہی منہ میں کیا بڑبڑائی تھی۔ مریم کو ٹھیک سے سنائی نہیں دیا۔ ان کی نگاہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

"بھابھی! خولہ نے اچھا نہیں کیا۔ پہلے ہی وہ ابا جی کی وجہ سے پریشان تھی۔ اوپر سے اتنی باتیں سنا کر، اس نے بیلا کو احساس جرم کا شکار کر دیا ہے۔ بہت بے چین ہے میری بچی۔" مریم کے شکوہ کناں انداز پر بلقیس شرمندہ سی ہو گئی تھیں۔

"سمجھایا ہے اسے سب نے۔ عبدالواحد نے تو ڈانٹا ہے بہت۔ بس ٹینشن میں تھی تو جو منہ میں آیا بول دیا۔ ورنہ بیلا کو تو پروگرام کرتے، پانچ ماہ ہونے کو آئے ہیں۔ بس ایک تکلیف تھی مقدر میں تب ہی مل

گئی۔“
بیٹی کی وجہ سے بلقیس کو بھی کافی شرمندگی کا سامنا تھا۔ ابھی بھی وہ تسلی بھرے انداز میں مریم کا ہاتھ تھپتھپاتے شرمندہ سی لگ رہی تھیں۔ مریم نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر ان کے چہرے پر موجود شرمساری کے آثار دیکھ کر لب بھینچ کر رہ گئیں۔

☆☆☆

عبدالرحمٰن صاحب ایک طرف موجود صوفے پر بیٹھے تھے۔ ولی باہر ڈاکٹر سے کچھ رپورٹس ڈسکس کرنے گیا ہوا تھا اور بیلا یک ٹک عبدالوہاب صاحب کے چہرے پر نظریں جمائے سورۃ رحمٰن کی تلاوت کر رہی تھی جب اس نے ان کی پلکوں کو دھیرے سے لرزتے دیکھا۔

ایک پل کو اس کا جی چاہا، وہ تلاوت چھوڑ کر ایک طرف صوفے پر بیٹھے عبدالرحمٰن صاحب کو ان کی طرف متوجہ کرے مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے تلاوت جاری رکھی۔

قرأت کا یہ انداز اسے قاری صاحب نے ہی سکھایا تھا اور اس کی بے حد خوب صورت آواز میں تلاوت کی جانے والی قرآن کی وہ آیات جیسے دل میں اترتی جا رہی تھیں۔

”سب آسمان اور زمین والے اسی سے مانگتے ہیں۔“

(یا اللہ میرے دادا جی کو ٹھیک کر دے، انہیں ہوش آ جائے)

دل ہی دل میں اس نے رب کو پکارا تھا۔

”ہر روز وہ ایک شان میں ہے۔“

قاری صاحب نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

”اور تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔“ (آیت 30)

قاری صاحب کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے نکلے۔ وہ یک ٹک چھت کو دیکھ رہے تھے اور ان کی کھلی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”پاپا......“

بیلا کی روتی ہوئی آواز پہ عبدالرحمٰن صاحب نے حیرت سے بیلا کو دیکھا۔ اس نے تلاوت درمیان میں ہی چھوڑ دی تھی۔

مگر کیوں؟

”پاپا...... دادا جی کو ہوش آ گیا ہے۔ پاپا...... دادا جی نے آنکھیں کھول دی ہیں...... دیکھیں......“

عبدالرحمٰن صاحب نے چونک کر قاری صاحب کو دیکھا اور پھر ان کی کھلی آنکھیں دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے۔

☆☆☆

”رحمٰن صاحب! آپ کی تسلی کے لیے میں نے دوبارہ سے چیک اپ کر لیا ہے مگر میں ابھی ولی سے بھی یہی ڈسکس کر رہا تھا۔ دراصل یہ کوما میں ہی ہیں۔“ ڈاکٹر عثمان کمرے سے باہر جاتے ہوئے عبد الرحمٰن صاحب کو سمجھا رہے تھے۔

”مگر ڈاکٹر صاحب......“ بیلا تڑپ کر آگے بڑھی۔ ”میں نے خود انہیں آنکھیں کھولتے دیکھا تھا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ انہوں نے میری آواز سنی تھی، ڈاکٹر صاحب! یہ کوما تو نہیں ہے پھر۔ وہ ہوش میں آ گئے تھے۔“

”جی، جی بیٹا۔ میں......“ وہ کچھ کہتے کہتے رکے تھے۔

”وہ آپ کی آواز سن سکتے ہیں۔ آپ جو کچھ بھی ان سے بولیں گی، وہ سنیں گے اور کسی حد تک شاید سمجھ بھی لیں۔ مگر ابھی رسپانس نہیں دے سکتے آپ کو۔“ پھر انہوں نے عبدالرحمٰن صاحب کو دیکھا۔

”دراصل رحمٰن صاحب!“ وہ اب باہر کی طرف جاتے ہوئے عبدالرحمٰن صاحب سے مخاطب تھے۔

”یہ کوما کی ہی ایک قسم ہے۔ اسے ہم Vogetative Coma کہتے ہیں۔ اس میں پیشنٹ......“ دروازہ بند ہوا تو ان کی آواز بھی آنا بند ہو گئی۔

بیلا نے پیچھے مڑ کر دادا جی کی طرف دیکھا، وہ آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔

''دادا جی......!'' اس نے نیچے فرش پہ دوزانو بیٹھ کر ان کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔

''میں نے پروگرام چھوڑ دیا ہے دادا جی! میں دوبارہ کبھی گانا نہیں گاؤں گی۔ آپ اٹھیں...... میرا نام تو لیں دادا جی! بھلے سے ڈانٹ لیں، مجھ سے ناراض ہوں مگر اٹھیں...... مجھ سے بولیں دادا جی...... مجھے ایک دفعہ بیلا بیٹا کہہ دیں پلیز......''

ان کا ہاتھ پکڑ کر روتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی مگر عبدالوہاب صاحب ابھی کسی بات کا جواب دینے والے نہیں تھے۔ تب ہی موبائل کی بیل نے اس کی توجہ بانٹ لی تھی۔

''ایشاع کالنگ۔'' موبائل پہ ایشاع کا نمبر دیکھ کر اس کی پیشانی پہ سلوٹیں سی پڑ گئی تھیں۔

☆☆☆

''بیلا! کیا تم کر پاؤ گی؟'' میشا نے لب چباتے ہوئے بیلا سے کہا۔ وہ بے حد ٹینس لگ رہی تھی۔

''لائیو پروگرام ہے اور فائنل کے لیے سنگرز کی سلیکشن ہونی ہے تو آڈینز بھی بہت زیادہ ہوں گے۔'' اس کا چہرہ پھیکا پڑا تھا۔ بیلا نے ایک نظر اسے دیکھا۔ پھر پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

''آج تم میری زندگی کی بیسٹ پرفارمنس دیکھو گی۔''

اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی سی۔ پروگرام کے لیے اتنا تیار ہونے کے باوجود وہ تروتازہ لگنے کے بجائے تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔ مگر اس کی آواز میں جو ایک عزم تھا، اس سے میشا کے دل کو ڈھارس سی ملی تھی۔ اگرچہ میشا جانتی تھی گائیکی میں بیلا کو ہرانا آسان نہیں ہے مگر......

وہ پروگرام سے صرف ایک دن پہلے ہی دبئی پہنچ پائی تھی اور جہاں باقی سنگرز نے دس دن تک، دن رات ایک کر کے پریکٹس کی تھی۔ وہاں بیلا کی پریکٹس صرف چند گھنٹوں کی ہی تھی۔

دادا جی کی بیماری کے بعد اس نے پروگرام چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر ایشاع کی کال نے اسے جیسے دوراہے پہ لا کھڑا کیا تھا۔ اس کے دو پیارے رشتے، دو مخالف انتہاؤں پہ کھڑے اسے اپنی طرف بلا رہے تھے۔ دادا جی کو مانیں تھے اور نانا جی...... اس کی ایک عزیز ہستی اس کے گائیک بننے کی وجہ سے زندگی اور موت کی کشمکش میں تھی اور دوسرا عزیز رشتہ، گائیکی چھوڑنے پہ اسی حال میں پہنچ سکتا تھا۔ وہ ڈر گئی تھی بہت زیادہ اور پھر نانا جی سے ملنے کے بعد فیصلہ ہو گیا تھا۔ وہ انہیں اس حال میں نہیں دیکھ سکتی تھی جس حال میں دادا جی کو چھوڑ کر آئی تھی۔

اسے یہ پروگرام کرنا ہی تھا اور پھر پہلی دستیاب فلائٹ سے جب وہ دبئی پہنچی تو پروگرام شروع ہونے میں چند گھنٹے ہی باقی تھے اور پروگرام لائیو تھا۔ اس نے یہ چند گھنٹے پریکٹس کرتے ہوئے گزارے تھے لیکن......

کیا اس کی یہ چند گھنٹوں کی پریکٹس اسے دن رات ریاض کرتے ان سنگرز سے آگے لے جا سکتی تھی جو اسے مات دینے کے لیے ہی میدان میں اترے تھے میشا پریشان تھی تو کچھ ایسے اچنبھے کی بات بھی نہیں تھی، اگر بیلا اچھی گائیک تھی تو باقی سب بھی کم نہیں تھے خاص کر افنان مگر......

''بیلا!''

میشا کی آواز پہ بیلا خیالوں کی دنیا سے واپس لوٹی تھی۔ وہ اس وقت بیک اسٹیج تھے۔ کوئی لمحہ گزرتا جب انہیں اسٹیج پہ بلا لیا جاتا۔

''ہوں۔'' اس نے سوالیہ انداز میں میشا کو دیکھا۔

''ایک پاکستانی اور ایک انڈین سنگر کو لازمی سلیکٹ ہونا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو آج تمہارا مقابلہ صرف شوکت سے ہے۔ اگر وہ اچھا نہیں گائے گا، تو مجبوری کو تمہیں لازمی سلیکٹ کرنا ہی پڑے گا۔'' میشا کی آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔ ویسے بھی وہاں اتنے لوگ اور شور تھا کہ اگر وہ اونچا بھی بول لیتی تو شاید ہی کوئی اس کی طرف متوجہ ہوتا۔ اس شور میں فی الحال کوئی اسے سننے والا نہیں تھا۔

''اور شوکت تمہارے لیے پیچھے ہٹ رہا ہے۔''
اس نے کچھ فاصلے پر کھڑے شوکت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''کیا؟'' بیلا حیرت سے اچھل پڑی۔
''نو نو میشا! اٹس ٹوٹلی رسک۔ اگر ایسا ہوا تو شوکت کے باہر ہونے کے ساتھ ہی ہمارے ٹیم اسکور میں سے پندرہ پوائنٹس مائنس ہو جائیں گے اور ہم نے جو اتنی مشکل سے اسکور برابر کیا تھا، اس میں پھر سے پیچھے ہو جائیں گے اور ان پوائنٹس کو فائنل میں برابر کرنا تقریباً ناممکن ہو گا کیونکہ انڈیا کے ٹیم اسکور میں اس کے دو سنگرز کے پوائنٹس جائیں گے جبکہ پاکستانی ٹیم اسکور میں صرف میرے پوائنٹس...... ایسا بالکل بھی نہیں ہونا چاہیے۔ شوکت کو اپنا بیسٹ دینا ہو گا۔'' وہ پریشان ہو گئی تھی۔
''میں ابھی اس سے بات کرتی ہوں۔'' وہ شوکت کی طرف بڑھی۔
''بیلا......!'' میشا نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر...... اسی وقت انہیں اسٹیج پہ بلانے کے لیے اناؤنسمنٹ کی جانے لگی تھی۔ میشا نے بے بسی سے خود سے دور جاتی بیلا کو دیکھا۔ وہ اب شوکت کے پاس کھڑی اس سے کچھ کہنے میں مشغول تھی اور میشا جانتی تھی اسے کیا کہنا تھا۔

☆☆☆

بیلا اس وقت اسٹیج پر پرفارمنس کے لیے موجود تھی۔ مائیک ہاتھ میں لیے کھڑی بیلا کا رخ ناظرین کی طرف تھا جبکہ اس میں عقب میں موجود دیوار دراصل ایل ای ڈی اسکرین تھی جس پر منظر گانے کی تھیم کی مطابق بدلتے تھے۔ سامنے آڈینس کی اگلی رو میں جیوری کے سات ارکان تھے اور اوپر چھت پر ڈرون کیمرے تھے جو پورے ہال میں چکر کاٹتے تھے اور جن کی پھڑ پھڑاہٹ کی آوازیں لمحاتی در آنے والی ڈرامائی خاموشی میں، کانوں کو سنائی دیتی تھیں۔ آج کے پروگرام میں پوائنٹس نہیں تھے بلکہ سب گائیکوں کی پرفارمنس دیکھ کر جیوری نے فیصلہ کرنا تھا کہ فائنل میں کون سے تین گلوکار جائیں گے۔
ایک گلوکار پروگرام سے باہر ہوتا اور اس کی باہر ہونے کے ساتھ ہی اس کی ٹیم کے ٹوٹل میں سے پندرہ پوائنٹ مائنس ہو جاتے۔
بیلا کی پرفارمنس آخر میں تھی اور اس سے پہلے تینوں سنگرز کی پرفارمنس ججز کو بہت پسند آئی تھی اور ان کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ پاکستان اور انڈیا کے ان چوٹی کے موسیقاروں اور گائیکوں کو فیصلہ کرنے میں مشکل کا سامنا تھا۔
بیلا کے سمجھانے پر شوکت نے بھی اپنی بہترین پرفارمنس دی تھی لیکن ناظرین اور جیوری پر جو جادو افنان نے کیا تھا، جیسی فیلنگو سے اس نے گایا تھا، اس کا وہ گانا اس کے دل کی آواز لگ رہا تھا۔
''کبھی تو نظر ملاؤ......
کبھی تو قریب آؤ......
اس کی آواز میں ایک گلہ تھا۔ بیلا کو دیکھتی اس کی نگاہوں میں ایک شکایت سی تھی۔
گاتے ہوئے اس کی نظریں بیلا کا طواف کر رہی تھیں جیسے وہ اس کے لیے گا رہا تھا اور اس نے جیسے پورے ہال پر سحر پھونک دیا تھا۔ اس کا گانا ختم کرنے کے بعد ہال کافی دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا تھا۔
اور اب اسٹیج پر کھڑی بیلا سوچ رہی تھی کہ وہ کیا وہ اس کے سحر کا توڑ کر پائے گی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور سارے خیالات سر سے جھٹکنے کی کوشش کرتے اپنا پورا دھیان گانے کی طرف لگا دیا۔ اس نے جو گانا منتخب کیا تھا، وہ میل ورژن تھا اور فی میل سنگر کا اسے گانا اور پھر اس میں فیلنگز لانا مذاق نہیں تھا۔
۔ایک نظر بے تابی سے گانا سننے کے منتظر ناظرین کو دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اب اسے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے محبوب کو لانا تھا۔ اس سے اپنی محبت کو محسوس کرنا تھا اور چونکہ فی الحال اس کا کوئی محبوب نہیں تھا تو ظاہر ہے یہ احساسات اور جذبات اس نے کسی خیالی محبوب کے لیے اپنے اوپر طاری کرنے تھے مگر

آنکھیں بند کرتے ہی وہ خیالوں ہی خیالوں میں اپنے دادا جی کے پاس پہنچ گئی تھی۔ وہاں ہسپتال کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھی، ان سے ایک نظر دیکھنے کی التجا کرتی، ان سے اپنا نام پکارنے کی درخواست کرتی۔ وہ پوری کی پوری پسینے میں نہا گئی۔ یہ کیا ہوا تھا اس کے ساتھ......اس کے ذہن میں نانا جی کی آواز گونجی۔

''بیلا! گاتے ہوئے تمہارے جذبات، تمہارے احساسات، گانے کے ساتھ ہم آہنگ ہونے چاہئیں۔ جو تم گا رہی ہو، اسے تم دل سے کہیں اندر سے محسوس کرو۔ گانے کے بول اور تمہارے جذبات اور احساسات کا تال میل ہی تمہارے گانے میں سچائی لائے گا۔''

اس کا ذہن خالی ہو گیا بالکل بلینک۔ جو وہ گانے والی تھی اس کے احساسات اس کا کبھی بھی ساتھ نہ دیتے۔ اس نے بے بسی سے میشا کو دیکھا، وہ مسکرا کر اسے دیکھتے اس کے گانے کی منتظر تھی اور سامنے موجود پاکستانی آڈینس اس کے جیتنے کے......

ایک پل کو اس کا جی چاہا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ وہاں سے بھاگ جائے، مگر نہیں۔ فرار کوئی حل تو نہیں تھا۔ اسے اس سب کا سامنا کرنا ہی تھا۔ پسینے میں بھیگی اس کی انگلیوں سے مائیک پھسل رہا تھا۔ اس نے اس پھسلتے مائیک پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کی۔ حلق کو تر کرتے اس نے گانا شروع کر دیا۔ اگر اس کے جذبات اور احساسات گانے سے ہم آہنگ نہیں تھے تو اس نے گانوں کو ان سے ہم آہنگ کر دیا تھا، اس نے عین وقت پر گانا بدل دیا تھا۔

ہونٹوں پہ کبھی ان......
میرا نام ہی آئے......
میرا نام ہی آئے......

اس کے گانا شروع کرتے ہی ہال خاموشی میں ڈوبا تھا۔ یہ آواز کی خوب صورتی اور ترنم نہیں تھا جس نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ یہ ایک درد تھا۔ ایک التجا تھی جس نے مسمرائز کر دیا تھا۔

آئے تو سہی......آئے تو سہی

بر سر الزام ہی آئے......ہونٹوں پہ کبھی ان کے......

بیلا جیسے وہاں پہ تھی ہی نہیں۔ وہ تو ہسپتال کے اس ٹھنڈے فرش پہ دوزانو بیٹھی تڑپ رہی تھی۔

''دادا جی میرا نام لیں۔ بھلے مجھے ڈانٹ دیں۔''

حیران ہیں لب بستہ ہیں......
دل گیر ہیں غنچے......
خوشبو کی زبانی......
خوشبو کی زبانی کوئی پیام ہی آئے......
ہونٹوں پہ کبھی ان کے......میرا نام ہی آئے......
میرا نام ہی آئے......

وہ گا تو نہیں رہی تھی۔ وہ تو جیسے سحر پھونک رہی تھی۔ اتنی خوب صورت آواز، سُر اور لے کی اتنی پرفیکشن......اور اتنی فیلنگز......سننے والوں نے سانس روک لی تھی اور میشا نے اپنی کب کی رکی سانس پرسکون انداز میں خارج کی تھی۔

آج بیلا کا دن تھا۔ اس نے اپنی اب تک کی بہترین پرفارمنس دی تھی اور شاید آج ہی لوگوں نے اور اس نے خود بھی اپنے اندر چھپی گلوکارہ کو صحیح معنوں میں دریافت کیا تھا۔ ساری نظروں کا رخ اس پہ تھا، سارے کیمرے اس پر ہی مرکوز تھے۔ ہال میں بیٹھے لوگ اور اپنے اپنے گھروں میں ٹی وی کے آگے بیٹھے ناظرین، سب پہ سکتہ طاری تھا۔ اس کا گانا ختم ہو چکا تھا مگر ہال دیر تک ویسے ہی خاموشی میں ڈوبا رہا تھا اور جب لوگوں کا سکتہ ٹوٹا تو ہال تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔

اس نے جیوری کو بھی کھڑا ہو کر داد دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ افنان کا سحر توڑنے میں کامیاب رہی تھی۔ آڈینس اور جیوری کی حد تک تو وہ کامیاب رہی تھی۔ انہیں وہ افنان کے سحر سے نکال لائی تھی مگر...... کیا وہ خود کو اس تاثر سے نکالنے میں کامیاب ہو پائی تھی، جو افنان کا گانا سننے کے بعد اس پہ طاری ہوا تھا؟

یہ اب آنے والے وقت نے بتانا تھا۔ فی الحال آج کا دن بیلا کا تھا۔ رابیل عبدالرحمٰن کا۔

☆☆☆

مالتی، بیلا اور افنان کو فائنل کے لیے منتخب کرلیا گیا تھا اور افنان نے وہیں اسٹیج پر ہی بیلا کو مبارک باد دی تھی۔ جبکہ مالتی جو کہ غالباً اسی وقت افنان کو مبارک باد دینے کے لیے اس کی طرف بڑھی تھی، اسے نظر انداز کردیا تھا اور افنان کے مالتی کو نظر انداز کر کے بیلا کی طرف بڑھنے پر انڈیا سوشل میڈیا پر کافی لے، دے ہوئی تھی۔

کہا جارہا تھا کہ اسے مالتی کے احساسات کا خیال کرتے ہوئے مبارک باد دینے کے لیے پہلے اس کے پاس جانا چاہیے تھا مگر وہ بیلا کے پاس کھڑا ہنس ہنس کر اس کی تعریفوں میں مشغول تھا۔

اس کا دومنٹ بیلا کے پاس ٹھہر کر بات کرنا بھی براشت نہیں کیا جارہا تھا اور اس میں بھی مذہبی بنیاد پرستی کو گھسیٹ لیا گیا تھا۔

بیلا کیا کہہ سکتی تھی، اس نے تو افنان کو مجبور نہیں کیا تھا کہ وہ مالتی کو چھوڑ کر اس کے پاس آئے۔ وہ خوش تھی۔ دادا جی کے لیے پریشانی اپنی جگہ، مگر انیس بیس برس کی عمر میں مل جانے والی شہرت اور عزت اسے آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرنے پر مجبور کررہی تھی۔ فائنل پروگرام کی تفہیم سے انہیں اسی وقت ہی آگاہ کردیا گیا تھا، ہر فائنلسٹ نے اپنا کمپوز کیا ہوا گیت گانا تھا۔ اب تک وہ مشہور سنگرز کے گیت گاتے آئے تھے مگر اب فائنل میں انہوں نے اپنا گیت گانا تھا۔ ایک ایسا گیت جو ان سے پہلے کسی نے نہ گایا ہو اور یہ مشکل تھا بہت مشکل۔ دوسروں کی کاپی کرنے اور اپنی کمپوزیشن کرنے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

''نانا جی! بیلا کو پھر کس قسم کا گیت گانا چاہیے اور راگ...... راگ وہی ہوگا ناں؟''

بیشا نے تصدیق طلب انداز میں استاد صاحب کو دیکھا تھا۔ وہ اور بیلا اس وقت استاد امانت علی اسکائپ پر بات کررہی تھیں۔

''ہاں بیلا میرا کمپوز کیا ہوا گیت گائے گی اور راگ وہی ہوگا۔'' استاد صاحب نے پرسکون انداز میں کہا۔

''جی......'' بیشا اور بیلا پہلے سے جانتی تھیں کہ ایسا ہی ہوگا۔ اس لیے ان کے انداز میں حیرت مفقود تھی۔

''اب وقت آگیا ہے کہ وہ راگ دنیا کے سامنے لایا جائے۔ شاید اسی وقت کے لیے وہ مقابلہ دہلی میں نہیں ہوا تھا۔ میرے اور کرتار کے درمیان شروع ہوا مقابلہ۔ بیلا اور افنان نے ختم کرنا تھا۔''

وہ ایک پل کو رکے۔ بیشا اور بیلا سانس روکے انہیں سن رہی تھیں۔

''اور یقیناً جو گیت وہ گائے گا، وہ اس راگ میں ہوگا جو آج سے تریسٹھ برس پہلے کرتار نے تخلیق کیا تھا اور اس کو کمپوز بھی کرتار کرے گا۔''

''اور مالتی؟'' بیلا نے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

''اونہوں۔ مقابلہ تمہارے اور افنان کے درمیان ہوگا۔ بلکہ سمجھ لو تم اور افنان ہتھیار ہو۔ اصل مقابلہ میرے اور کرتار کے درمیان ہے اور تم مجھے ہارنے نہیں دو گی کیونکہ تمہاری ہار میں برداشت نہیں کرسکوں گا۔''

ان کے لہجے میں جانے کیا تھا، بیلا کانپ کررہ گئی۔

☆☆☆

افنان، مالتی اس وقت دل جیت کے کمرے میں بیٹھے فائنل پروگرام ڈسکس کررہے تھے۔ فائنل میں صرف چند دن رہ گئے تھے۔ مالتی کا گیت دل جیت نے کمپوز کیا تھا جبکہ افنان تارا سنگھ کا کمپوز کیا ہوا گیت گارہا تھا۔

''ایٹ لیسٹ اب تو مجھے افنان کا گیت سنوا دیں، میں تو ٹیم کا حصہ ہوں پھر مجھ سے کیوں اتنا چھپا رہے ہیں۔'' مالتی کے لہجے میں تجسس تھا۔

''ابھی کچھ خامیاں ہیں۔ دادا کی کمپوزیشن کا تو

پتا ہے ناں۔ کافی مشکل کمپوزیشن ہے۔ ویسے ہی یہ پریکٹلی گائے گا، سب سے پہلے اس کا گانا تم ہی سنو گی۔'' دل جیت نے تسلی دینے کے انداز میں کہا تو مالتی کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''ویسے شوکت۔ کے مقابلے سے باہر ہونے سے ایک فائدہ ہوا ہے۔ ٹرافی تو اب ہماری ہے۔ ہماری ہی ٹیم کو ملے گی اور جب افنان کرتار سر کا کمپوز کیا ہوا گیت گائے گا تو تاج بھی یہی لے جائے گا۔ وہ پاکی تو دیکھتے رہ جائیں گے۔''

مالتی نے بظاہر مسکرا کر کہا تھا مگر اس کے مسکراتے چہرے پر پاکستانیوں کے ذکر پر آجانے والا تنفر صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ افنان نے بغور اسے دیکھا۔

''رابیل کو ہلکا مت لو۔ اس کے اب تک کے گائے ہوئے سارے گیت ہم سے بہتر تھے۔ مجھے نہیں لگتا کہ بیسٹ سنگر کا تاج وہ ہم میں سے کسی کے سر پہ سجنے دے گی۔''

افنان کے واشگاف انداز میں کہنے پر مالتی کا چہرہ پھیکا پڑ اٹھا۔

''چلو، مجھے تو تم فائنل میں پہنچنے کے بعد بھی کسی گنتی میں نہیں رکھتے۔ مگر خود کو تو اتنا ڈی گریڈ مت کرو افنان! تم اس سے کم نہیں ہو۔'' مالتی کے لہجے میں ہلکا سا غصہ تھا۔

''اوہوں۔'' افنان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''رابیل نے ابھی کھل کر گایا ہی نہیں۔ اس نے جتنے بھی سونگ گائے ہیں، ان میں اپنے فن کا اظہار ٹھیک سے کر ہی نہیں سکی۔ کوئی چیز تھی جو اسے روک رہی تھی، الجھا رہی تھی...... مگر......'' وہ پرسوچ انداز میں کہتے ہوئے ایک پل کو رکا۔

''جو آخری گیت اس نے گایا ہے ناں، لگتا ہے وہ اپنی اس الجھن کو شکست دے چکی ہے۔ اب فائنل میں تمہارا مقابلہ ایک نئی رابیل عبدالرحمٰن سے ہوگا اور اس سے جیتنا آسان نہیں ہوگا۔''

افنان کے کھل کر رابیل کی تعریف کرنے پر مالتی کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔

''تم......'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ ایسا کہتی کہ بات بگڑ جاتی، اب تک خاموشی سے سنتا دل جیت بول اٹھا۔

''اور پتا بھی ہے کہ وہ کس کا کمپوز کیا ہوا گیت گا رہی ہے۔''

''کس کا؟''

افنان اور مالتی دونوں نے پرتجسس انداز میں اسے دیکھا۔ تینوں فائنلسٹ ہی اپنا گیت ایک دوسرے سے چھپا کر تیار کر رہے تھے۔ مالتی اور افنان ایک ٹیم میں ہونے کی وجہ سے اتنا تو جانتے تھے کہ ان کے ساتھی کا گیت کون کمپوز کر رہا ہے لیکن بیلا کے مخالف ٹیم میں ہونے کی وجہ سے اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی اور اب دل جیت کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ جان گیا ہے کہ بیلا کس کا کمپوز کیا ہوا گیت گا رہی ہے، سو وہ پرتجسس انداز میں دل جیت کو دیکھ رہے تھے۔

''سر امانت علی کا......'' دل جیت نے دھماکا کیا تھا۔

''واٹ؟''

حیران مالتی بھی ہوئی تھی مگر افنان تو جیسے اچھل پڑا تھا۔

''سر امانت علی۔ وہی دل جیت...... وہی سر امانت علی جو......؟'' لفظ اس کے لبوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے تھے اور کانوں میں بیلا کی آواز گونج رہی تھی۔

''ایک پرانا قرض جسے چکانا تھا، ایک فرض تھا جسے نبھانا تھا۔''

وہ کون تھی؟ امانت سر سے اس کا کیا رشتہ تھا؟ افنان کو لگا رابیل عبدالرحمٰن کو جاننے میں اسے ابھی زمانے لگیں گے۔ وہ اتنا تو جانتا تھا کہ ایشاع سر امانت کی نواسی ہے۔ تو کیا رابیل بھی...... شاید تریسٹھ برس پہلے شروع ہوئے مقابلے کا انت آ پہنچا تھا۔ اس نے دل جیت کو دیکھ کر کچھ کہنا چاہا مگر پھر مالتی کی وجہ سے چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

☆☆☆

وہ گومگو کی حالت میں بیٹھے تھے۔ سُر کی جنگ پروگرام کے میگا فائنل میں انہیں مدعو کیا گیا تھا۔ کتنا ڈھیر سارا وقت گزرا، انہوں نے کسی بھی پروگرام میں جانا چھوڑا ہوا تھا اور تقریباً گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ کوئی اور پروگرام ہوتا تو وہ صاف انکار کر دیتے مگر......اور پھر......

ایک ایڈوانٹیج بھی تھا۔ انہیں بیس بونس پوائنٹ دینے کا حق دیا گیا تھا۔ کوئی ایک سنگر جو انہیں متاثر کرتا اسے وہ بیس پوائنٹ دے سکتے تھے اور یہ پوائنٹ ججز کے پوائنٹس سے ہٹ کر ہوتے۔

تو کیا انہیں جانا چاہیے۔ بیلا کو جتوانے کا قدرت ایک موقع انہیں دے رہی تھی۔ تو کیا اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ تریسٹھ برس پہلے تارا سنگھ نے جو دھوکا دیا تھا، کیا اس کا جواب دینے کا وقت آ گیا تھا۔ مگر......

یہ ضروری تو نہیں تھا کہ بیلا ہی سب سے اچھا گاتی، اگر افنان یا مالتی میں سے کوئی بیلا سے زیادہ اچھا گا لیتا۔ خاص کر افنان......تو کیا وہ پھر بھی بیلا کو ہی پوائنٹ دیتے۔ یہ ان کے فن کی آزمائش تھی، کیا وہ اس میں کھرے اتر پاتے یا......تارا سنگھ کی طرح پھسل جاتے تو پھر......؟ کیا وہ انکار کر دیں؟

وہ گومگو کی حالت میں بیٹھے تھے اور جانے کب تک بیٹھے رہتے جب موبائل کی بیل نے ان کی توجہ بانٹ لی۔

''نیلم کالنگ......''

اسکرین پر نیلم کا نام پڑھ کر وہ تھوڑا ٹھٹکے تھے۔ کیا اس تک بھی یہ خبر پہنچ گئی تھی یا کوئی اور بات......اسکرین کو بغور دیکھتے ہوئے انہوں نے کال اٹینڈ کر لی تھی۔

''ہیلو......''

''السلام علیکم بابا!'' نیلم نے سلام کیا۔

''بابا! آپ کو سُر کی جنگ پروگرام میں انوائٹ کیا گیا ہے؟'' نیلم نے بنا انہیں کسی بات کا موقع دیے، جھٹ سے پوچھا تھا اور اس کا لہجہ سوالیہ نہیں تھا، جیسے وہ کنفرم تھی۔

''ہاں......مگر میں سوچ رہا تھا کہ......''

''نہیں بابا!'' نیلم نے ان کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی تھی۔ ''آپ انکار نہیں کریں گے کیونکہ ہم انکار کرنے کی پوزیشن میں ہیں ہی نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ حیران ہوئے۔

''تارا سنگھ کو بھی پروگرام میں مدعو کیا گیا ہے اور آپ کی طرح اسے بھی کسی ایک سنگر کو بیس پوائنٹ دینے کا حق حاصل ہوگا۔''

نیلم کی بات سن کر وہ چپ کے چپ رہ گئے تو ان کا اور تارا سنگھ کا تریسٹھ برس بعد ایک میدان میں اکٹھا ہونا پہلے سے طے شدہ تھا۔ واقعی انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی اور انہوں نے اس پروگرام میں اب جانا ہی تھا۔

☆☆☆

بے حد کھلے گھیر کی پھولی پھولی سی ویسٹرن اسٹائل کی سفید رنگ کی میکسی جس پر سلور کام کیا گیا تھا اس کے پیروں کو چھو رہی تھی۔ کانوں میں نفیس سے ڈائمنڈ ٹاپس تھے جبکہ گلے میں موجود نازک سا ڈائمنڈ نیکلس گردن کی شان بڑھا رہا تھا۔ لمبے سلکی بال ہلکے گولڈن رنگ میں ڈائی کیے گئے تھے۔ اوپر سے سیدھے نیچے سے کرل کیے گئے بال کچھ آگے کی طرف بھی ڈال دیے گئے تھے۔

سارا اسٹائل ویسٹرن تھا مگر......خوب صورت نیٹ کا دوپٹہ جس پر کہیں کہیں سلور رنگ جھلملا رہے تھے، لباس کو مشرقی لک دے رہا تھا اور ذرا سا سر پر ٹکا، باقی سارا پیچھے کو چھوتا نیچے تک جا رہا تھا۔ وہ ایک شہزادی تھی جو اپنی رسم تاج پوشی میں شرکت کے لیے دربار میں آ پہنچی تھی۔ اس کی انٹری ہی اتنی زبردست تھی کہ ہال تالیوں اور سیٹیوں سے گونج اٹھا تھا اور اس کی تیاری دیکھ کر مالتی کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ وہ ساڑھی میں ملبوس تھی اور اس نے بھی اپنی تیاری میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا مگر بیلا تو لگتا تھا تاج لے جانے کے ارادے سے آئی تھی۔ ایسی ملکہ جس کے سر پر بس تاج کی کمی تھی تو کیا وہ تاج آج اس کے سر پر سجنا تھا۔ بہت زیادہ تیاری کے باوجود پتا نہیں کیوں مالتی کو اپنا مورال ڈاؤن ہوتا محسوس ہوا۔ وہ مخالف ہو کر بھی بیلا کو دیکھ کر متاثر ہوئی تھی تو وہ جو پہلے ہی اس پر مرمٹا تھا۔

اس نے بے ساختہ افنان کو دیکھا۔ وہ بیلا کو ہی

دیکھ رہا تھا جواب اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی اور اس کی نظروں میں جانے کیا تھا، مالتی کو دھچکا لگا تھا۔

''تاج اور یہ شہزادہ دونوں تم لے جاؤ۔ ایسا میں ہونے نہیں دوں گی بیلا! ان میں سے ایک میرا مقدر ہوگا۔ یہ شہزادہ نہ سہی، مگر تاج میں تمہارے سر پر سجنے نہیں دوں گی۔''

اس نے دل ہی دل میں اپنا عہد دہرایا اور کمپیئر کی طرف متوجہ ہوگئی جو پروگرام کی شروعات کے لیے ابتدائی کلمات کہہ رہی تھی۔ لائیو پروگرام کی ٹرانسمیشن شروع ہوچکی تھی اور اس پروگرام کی خاص بات یہ تھی کہ جیوری نے سنگرز کو پوائنٹس تو دینے تھے مگر ان کے پاس صرف دو آپشن تھے یا تو وہ سنگر کو فل مارکس دیتے یا پھر زیرو۔ بیچ میں کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ پروگرام شروع ہوچکا تھا اور ہال میں بیٹھے ناظرین کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے ٹی وی اسکرین کے آگے بیٹھے لوگ بھی سانس روکے موسیقی کے اس مقابلے کا انت دیکھنے کو بے تاب تھے۔

☆☆☆

وہ بڑی مشکل سے خود کو کمپوز کیے، اپنا سارا دھیان پروگرام کی طرف لگا رہے تھے مگر کرتار سنگھ کا رویہ انہیں حیران کررہا تھا۔ وہ شخص جو ان کے خیال میں سامنا ہونے پر ان سے نظریں ملانے کے قابل نہیں تھا، وہ پروگرام کی شروعات میں جس والہانہ انداز میں ان کی طرف بڑھا تھا، اس کا وہ رویہ ہی انہیں ٹھٹکانے کے لیے کافی تھا مگر وہ تو قدم قدم پر انہیں حیران کرنے پر تلا تھا۔ اس وقت بھی اپنی حیرت کو بمشکل چھپاتے انہوں نے معانقے کے لیے اس کے بڑھتے بازوؤں کو جھٹک کر صرف ہاتھ ملانے پر ہی اکتفا کیا تھا مگر اس کا پھیکا پڑتا چہرہ دیکھ کر نہ جانے کیوں اندر کہیں ان کے دل میں بھی کچھ چبھا تھا۔

اور پھر پروگرام کے دوران جب مالتی کو جیوری کے ساتوں ارکان (فائنل میں سات جج کو بلایا گیا تھا) کی طرف سے زیرو پوائنٹ ملے تھے تو یہ انڈین ٹیم کے لیے ایک بڑا دھچکا تھا۔

پاکستان اور انڈیا کے گرینڈ ٹوٹل میں صرف پندرہ پوائنٹس کا فرق تھا۔ اگر مالتی کو تھوڑے سے بھی پوائنٹس مل جاتے تو پاکستانی ٹیم کے لیے جیتنا ناممکن ہوجاتا اور یہ کچھ پوائنٹس کرتار اسے دے سکتا تھا بلکہ جب وہ مالتی کی تعریف کررہا تھا تو انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ایسا ضرور کرے گا مگر اس نے مالتی کو بونس پوائنٹ نہیں دیے تھے تو کیا وہ بونس پوائنٹس افنان کو دے گا۔ کیا وہ تاج اپنے شاگرد کے سر پر سجا دیکھنا چاہتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کیونکہ وہ یہ پوائنٹس کسی ایک سنگر کو ہی دے سکتے تھے۔

اس کے بعد ان کا یہ حق ختم ہوجاتا۔ اب چاہے اگلا گلوکار کتنا بھی اچھا کیوں نہ گالیتا۔ وہ یہ حق دوبارہ استعمال نہیں کرسکتے تھے تو کیا وہ بیس پوائنٹس دینے کا اپنا یہ حق افنان کے لیے بچانا چاہتا تھا۔ کیونکہ افنان اس کا وہ شاگرد تھا جس نے شاید نہیں یقیناً آج اس کے بنائے راگ میں، اسی کا بنایا ہوا گیت گانا تھا اور پھر افنان نے گانا گایا تھا اور بلاشبہ وہ گیت، وہ راگ قابل ستائش تھا۔ جیوری میں بیٹھے چوٹی کے موسیقار و گلوکار دنگ رہ گئے تھے۔

حیران وہ بھی ہوتے اگر جو انہوں نے بیلا کو اپنا راگ گاتے نہ سنا ہوتا۔ افنان کا گیت...... انہوں نے ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہوکر ایک موسیقار کے زاویے سے سوچا تھا 'اچھا تھا مگر......

اگر آج بیلا ان کا راگ ویسے ہی گالیتی جیسے کہ انہوں نے اسے سکھایا تھا تو افنان کا جیتنا ناممکن تھا۔ افنان کو جیوری کی طرف سے فل مارکس ملے تھے۔ اگر کرتار سنگھ اسے بونس پوائنٹ دے دیتا تو انڈین ٹیم نے پاکستانی ٹیم سے پینتیس پوائنٹس آگے بڑھ جانا تھا اور پھر ان کا بیلا کو بیس نمبر دینے کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔

کرتار سنگھ نے اٹھ کر افنان کو گلے لگایا تھا، اس کا ماتھا بھی چوما تھا مگر......

اس نے بونس پوائنٹ افنان کو بھی نہیں دیے تھے اور اب...... اگر بیلا جیوری سے فل مارکس لینے میں کامیاب ہوجاتی اور وہ اسے بونس پوائنٹ بھی دے دیتے تو پاکستانی ٹیم پانچ پوائنٹس سے جیت سکتی تھی۔

''وہ ایسا گاسکے گی کہ وہ اسے بونس پوائنٹ

دے سکیں۔"
انہوں نے کسی شہزادی کی شان سے اسٹیج کی طرف بڑھتی بیلا کو پرسوچ انداز میں دیکھا کیا۔ تارا سنگھ کو اسی کے سکوں میں ادائیگی کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ کیا آج تریسٹھ برس پہلے کی گئی بے ایمانی اور دھوکا دہی کا بدلہ لینے کا وقت تھا۔ اگر آج وہ بیلا کو افنان سے کم تر گانے کے باوجود پوائنٹ دے دیتے تو کون تھا انہیں روکنے والا۔ مگر پھر کیا وہ واقعی جیت جاتے اور کیا دنیا ان کی یہ جیت مان لیتی۔
انہیں ایک دم سے سینے میں گھٹن کا احساس ہوا۔ نہیں۔ آج...... کم از کم آج کے دن کوئی بے ایمانی اور دھوکا نہیں ہو سکتا تھا، مقابلہ شفاف ہونا تھا۔

☆☆☆

وہ گا رہی تھی اور سننے والے مسحور ہو رہے تھے۔ اس کی آواز میں جادو تھا اور وہ سننے والوں پر سحر پھونک رہی تھی۔ اسٹیج کی سب روشنیاں صرف اس پر مرکوز تھیں اور اندھیر ساری روشنیوں میں آواز کا جادو جگاتی وہ ایک اپسرا لگ رہی تھی۔ باقی ہال اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور سمجھنا مشکل تھا کہ اس کے سامعین کی تعداد اور تاثرات کیا ہیں۔
وہ ڈوب کر گا رہی تھی۔ یا اردگرد کی ہر شے اس کی لے میں ڈوب رہی تھی، سمجھنا مشکل تھا۔ اس کی لے میں امید تھی، خوشی تھی اور جوش تھا۔ آواز ایسی تھی کہ سننے والے جھوم اٹھے تھے، راگ وہ تھا کہ مسحور کر رہا تھا۔ سُر، تال اور آواز کا ایسا مکمل ملاپ تھا کہ حقیقت کی سرحدوں سے پرے گمان کا شبہ ہو رہا تھا۔ کیا وہ اسی دنیا کی تھی؟ حقیقت تھی؟ پھر دیکھنے والوں کو اپنی نظر کا دھوکا کیوں لگ رہی تھی۔ اس کی آواز تھی یا جادو جو دلوں کو پرجوش کر رہا تھا۔
آخر وہ خاموش ہوئی اور ہال کی روشنیاں جل اٹھیں۔ سامعین کی تعداد ہزاروں میں تھی اور وہ سب کھڑے ہو کر اسے داد دے رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے تو کیا آج اس نے وہ پا لیا تھا جس کی تمنا شعور سنبھالتے ہی اس کے دل میں جاگ اٹھی تھی۔ جاگ اٹھی تھی یا جگائی گئی تھی اور اگر جگائی گئی تھی تو کیا یہ درست تھا۔ کیا اس کی خواہش مناسب تھی؟
اس کا فیصلہ آنے والے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ فی الحال تو وہ اسٹیج پر آنکھوں میں آنسو لیے بیٹھی تھی۔ ہال میں موجود ناظرین، جیوری کے ساتوں ارکان، انڈین اور پاکستانی ٹیم کے گلوکار، کپتانز اس کے نانا جی اور کرتار سنگھ......
ہاں وہ کرتار سنگھ ہی تھا جو سب کے ساتھ کھڑے ہو کر اس کے لیے تالیاں بجا رہا تھا۔ اسے داد دے رہا تھا۔ کمپیئر آگے بڑھ کر اب اسے اٹھا رہی تھی۔ کچھ بول رہی تھی، مگر وہ شاید ابھی کچھ سننے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ وہ صرف دیکھ رہی تھی، جیوری کے ساتوں ارکان نے اسے فل مارکس دیے تھے۔ پندرہ پوائنٹس کا فرق ابھی برقرار تھا۔ کیا نانا جی اسے بونس پوائنٹ دیں گے؟ اس نے نانا جی کی طرف دیکھا مگر بزر مخالف سمت سے بجا تھا۔ وہ کرتار سنگھ تھا جس نے اسے بیس پوائنٹ دے کر تاج اور ٹرافی دونوں کا حق دار بنا دیا تھا۔
وہ دنگ رہ گئی تھی تو استاد امانت علی بھی کم حیران نہیں تھے۔ آج شاید بہت سی حقیقتوں سے پردہ اٹھنے کا وقت آ پہنچا تھا۔

☆☆☆

سر پر تاج سجائے، ہاتھ میں ٹرافی تھامے وہ فوٹو شوٹ کروا رہی تھی۔ پھول ابھی بھی وقفے وقفے سے اس پر برس رہے تھے۔ اسٹیج پر وہ جگہ جہاں وہ ٹھہری تھی، سرخ و سفید گلاب کی پتیوں سے بھر گئی تھی۔ اس سے پہلے وہ نانا جی سے مل کر ان کے قدم چھو چکی تھی اور پھر نانا جی کے کہنے پر تارا سنگھ کے قدم چھونے بڑھی تھی مگر وہ خود اس کی طرف بڑھ آئے تھے اور اپنے پاؤں بیلا کو چھونے نہیں دیے تھے۔
"امانت علی کی نواسی میرے قدم چھوئے، یہ زیبا نہیں۔" انہوں نے بے ساختہ اسے سیدھا کھڑا کرتے اس کے ماتھے پہ بوسہ دیتے کہا تھا۔
تو کیا وہ جانتے تھے کہ بیلا، امانت علی کی نواسی ہے۔ کب سے؟

بیلا کی حیرت بجاتی ہی تھی اگرچہ اس نے بتایا نہیں تھا مگر یہ اکیسویں صدی تھی۔ اس جدید دور میں اگر ان کو بیلا اور استاد امانت علی کے درمیان موجود رشتے کا پتا تھا تو یہ کوئی ایسی اچنبھے کی بات تھی بھی نہیں۔

حیرت کے ابتدائی جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد اس نے نانا جی کو دیکھا۔ وہ یک ٹک کرتار سنگھ کو دیکھ رہے تھے اگر برسوں پہلے وہ سب کچھ ان کے ساتھ کرتار سنگھ نے مقابلہ جیتنے کے لیے کروایا تھا تو پھر آج اس سے کہیں زیادہ بڑے پیمانے پر ہوئے اس مقابلے میں، جس کے بارے میں اخبارات چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ یہ انڈیا اور پاکستان کے نو آموز گلوکاروں کا نہیں بلکہ موسیقی کے دو بڑے ناموں تارا سنگھ اور امانت علی کا مقابلہ ہے۔

آج اس نے انہیں کیوں جتوایا تھا اور ان کی جیت پر ان سے زیادہ خوش کیوں تھا۔ دراصل ان کی جیت کو ''یقینی فتح'' کرتار سنگھ نے ہی بنایا تھا۔

اگر وہ بیلا کو بونس پوائنٹ دیتے تو ایک پنڈورا باکس کھل جانا تھا۔ انڈیا کا متعصب طبقہ یہ بات ڈنکے کی چوٹ پر کہتا کہ بیلا بے ایمانی سے جیتی ہے مگر تارا سنگھ کے اس اقدام کی وجہ سے ان کی جیت پر اب کوئی انگلی اٹھانے والا نہیں تھا۔ مگر سوال پھر وہی تھا اس نے ایسا کیوں کیا؟

کیا وہ اتنے برس کسی غلط فہمی کا شکار رہے تھے۔ کیا حقیقت وہ نہیں تھی جو وہ سمجھتے رہے تھے۔ بیلا کو ایک طرف ہٹاتے وہ کرتار سنگھ کی طرف بڑھے تھے۔ بیلا نے کچھ کہنا چاہا۔

مگر پھر اسے فوٹو شوٹ کے لیے بلوایا جانے لگا تو وہ اسٹیج کی طرف بڑھ گئی اور اب اسٹیج سے بھی اس کی نگاہیں گاہے بگاہے نانا جی اور کرتار سنگھ کا جائزہ لے رہی تھیں، وہ کچھ دیر اکٹھے بیٹھے پھر اکٹھے ہی ہال سے باہر نکل گئے۔ شاید بار بار ملنے کے لیے آنے والے پرستار انہیں ڈسٹرب کر رہے تھے۔

ہال سے کچھ لوگ جا چکے تھے، کچھ ابھی تک ٹھہرے ہوئے تھے۔ انڈین اور پاکستانی ناظرین میں کچھ ہاتھا پائی بھی ہوئی تھی۔ پورے دل سے مسکراتے بیلا نے ایک فوٹو گرافر کے کہنے پر تھوڑا رخ بدل کر ٹرافی والا ہاتھ تھوڑا اونچا کیا۔ مگر پھر اپنی طرف بڑھتے افنان کو دیکھ کر اس کی مسکراہٹ سمٹی تھی۔ ہاتھوں میں سرخ گلاب لیے اپنی طرف بڑھتے افنان کو دیکھ کر وہ تھوڑا گھبرا گئی تھی۔ شاید وہ مجھے مبارک باد دینے آرہا تھا۔

اس نے خود کو تسلی دی تھی مگر......

ڈھیر سارے کیمروں اور ہزاروں لوگوں کے آگے، وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا، سرخ گلاب کا پھول اس کی طرف بڑھائے، اسے پرپوز کر رہا تھا۔ پروگرام ابھی تک لائیو ٹیلی کاسٹ ہو رہا تھا۔ ایک دنیا یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ بیلا کا چہرہ تپ رہا تھا، سانس الجھ رہی تھیں اور دھڑکنیں......

دھڑکنوں میں تلاطم برپا تھا۔

پھولوں کے ڈھیر پر کھڑی وہ شہزادی یک ٹک اپنے سامنے پھولوں پر بیٹھے، پھول اپنی طرف بڑھائے اس شہزادے کو دیکھ رہی تھی۔ کیمرے دھڑا دھڑ یہ مناظر فلم بند کر رہے تھے۔ رپورٹرز کو اگلے دن کے لیے ایک چٹ پٹی سرخی مل گئی تھی۔

بیلا نے جلتی آنکھوں سے افنان کی طرف دیکھا اور بنا کچھ کہے تقریباً دوڑتی ہوئی بیک اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔ افنان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ سرخ گلاب اس کے ہاتھوں سے چھوٹا اور ان ڈھیر سارے پھولوں میں شامل ہو گیا۔ جنہیں ابھی ابھی بیلا روند کر گئی تھی۔

☆☆☆

''یہ کیا حرکت تھی افی؟''

افنان اپنے کمرے میں دروازہ لاک کیے جیسے پوری دنیا سے چھپا بیٹھا تھا اور ابھی دل جیت کے بار بار دستک دینے پر بمشکل خود کو اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرتے اس نے دروازہ کھولا تھا۔ اور وہی ہوا تھا جس کا اسے ڈر تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی اس کی بیلا کو پرپوز کرنے والی حرکت پر بات کی تھی۔

''کیا...... کیسی حرکت؟'' رخ موڑے افنان جیسے بمشکل خود پر ضبط کر رہا تھا۔

''ادھر دیکھ میری طرف۔'' دل جیت نے اسے

کندھے سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔
''اسے لائیو پرپوز کرنا ہی تھا تو پہلے ساری سیٹنگ کرتے، اتنے سال شوبز کو قریب سے دیکھنے کے باوجود تم میں اتنا سینس نہیں کہ اس طرح کے لائیو تماشے نرا ڈراما ہوتے ہیں۔ سب سیٹ ہوتا ہے پہلے سے۔''
اگرچہ دل جیت غصے میں آیا تھا مگر افنان کا چہرہ دیکھ کر اس نے بمشکل خود پر ضبط کیا تھا۔
''کچھ سوچ کر ہی کیا ہے دل بھائی! ڈونٹ وری۔ سیٹ ہو جائے گا سب۔ نخرے دکھانے اسے تھوڑے، اتنا ایٹی ٹیوڈ تو بنتا ہے۔'' کمرے کا دروازہ دوبارہ سے لاک کرتے افنان بمشکل مسکرایا تھا۔
''کرتار سر کی بات ہوئی امانت سر سے۔'' اس نے جیسے دانستہ بات بدلنے کی کوشش کی تھی۔
''اور پرپوز کسے کیا ہے تم نے؟'' اس کی بات بدلنے کی کوشش کو دل جیت نے ناکام بنا دیا تھا۔ اس کی سوئی وہیں پہ اٹکی تھی۔
''پاکستانی لڑکی۔'' ''اور ایسی لڑکی جس نے تمہیں بمشکل آدھا گھنٹہ پہلے بری طرح مات دی تھی۔'' دل جیت کو جیسے نئے سرے سے تپ چڑھی تھی۔
''کچھ اپنے دیش کی جنتا کا ہی خیال کیا ہوتا، پتا بھی ہے، کتنے جذباتی ہیں...... اور معاملہ پاکستان سے ہار کا ہو تو ان کے جذبات آسمان کو چھونے لگتے ہیں۔ کچھ ان کے ردعمل کا ہی خیال کرنا تھا۔''
افنان سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ، سر جھکائے اپنے پیر کے انگوٹھے سے کارپٹ کو کریدنے لگا۔
''موبائل آن کر۔'' دل جیت تھکے تھکے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔
''کیا مطلب؟''
''موبائل آن کر۔ کبیر سر بات کرنا چاہتے ہیں تجھ سے۔'' دل جیت نے اس کے والد کا نام لیا۔
''میں......'' افنان نے انکار کرنا چاہا مگر دل جیت نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔
''پھر او' ہوا ہے تیرے گھر پر۔ کم از کم ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے تو تیرا انہیں کال کرنا بنتا ہے کہ نہیں۔'' ابرو سوالیہ انداز میں اوپر اٹھاتے اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔
''کیا......'' افنان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔

☆☆☆

جگجیت اور کرتار سنگھ کے لیے سب سے بڑی مشکل اس وقت کھڑی ہوئی تھی جب امانت علی کی طرف سے مقابلے میں شرکت کے اشتہارات چھپے تھے۔ پہلے ہی ان کی برادری کے شرپسند لوگ اس بات پر نالاں تھے کہ شفقت علی اور اس کے خاندان کے لوگ باحفاظت دہلی سے کیسے نکل گئے بلکہ وہ شک کر رہے تھے کہ ان کے یوں نکلنے میں جگجیت سنگھ اور کرتار کا ہاتھ ہے۔
اب ان اشتہارات نے ان کا اشتعال اور بھی بڑھا دیا تھا۔ حالات اس نہج پر پہنچ گئے تھے کہ انہیں اپنے ساتھ کا یقین دلانے کے لیے امانت علی کے گھر پر ہونے والے بلوہ میں کرتار اور ان کے والد کو بھی شریک ہونا پڑا تھا اور اب ان کے آگے سب سے بڑا مسئلہ امانت علی کی باحفاظت پاکستان روانگی کا تھا جس کا وچن وہ شفقت علی کو تو دے چکے تھے مگر امانت کے غائب ہونے اور پھر مقابلے کو برقرار رکھنے کے معاملات بے حد پیچیدہ کر دیے تھے۔
جس رات مقابلہ تھا، اس دن عصر سے ہی شرپسندوں کی ٹولیاں میدان کی طرف جانے والے ہر راستے پر گھات لگا کر بیٹھ چکی تھیں۔ جس میدان میں پنڈال سجایا گیا تھا، اس کی طرف تین راستے جاتے تھے، شہر کی کسی بھی سمت سے آتے، پنڈال تک پہنچنے کے لیے ان تینوں میں سے کسی ایک راستے سے لازمی گزرنا پڑتا۔
ایک راستے پر ٹولی کے ساتھ جگجیت، دوسرے پر کرتار اور تیسرے پر امانت اور کرتار کا بہترین دوست اور راز دار جیتندر بیٹھا تھا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

آخر دسمبر کا دھند میں لپٹا ملگجا سا دن تھا۔ دھرتی نے کئی دن سے دھوپ کی صورت نہ دیکھی تھی۔ دوپہر کا تو پتا ہی نہ لگتا۔ صبح سیدھی شام کے گلے ملتی اور رات کی بکل اوڑھ کر سو جاتی۔ دو بجنے میں پانچ منٹ تھے...... اور...... گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول کی سرخ عمارت کے باہر سینکڑوں آنکھیں بیزاری بھرے انتظار کے ساتھ اسکول کے کھلے گیٹ پر لگی تھیں۔ رش بہت تیزی سے بڑھنے لگا۔ رکشہ، ویگنیں، موٹر سائیکل...... سائیکل...... دو کا گھنٹہ بجا۔ گیٹ کی اوٹ سے بھنبھناہٹیں بے تاب آوازوں کا روپ دھارنے لگیں۔

"انکل! گیٹ کھول دیں۔"

"انکل جلدی کریں...... گھنٹی تو بج گئی......"

باہر موجود ریڑھی والوں نے اپنی اپنی سوغات پر سے جالی دار کپڑے ہٹا دیے تھے۔ گیٹ کھلا...... سفید شلوار دوپٹے اور نیلی قمیصوں کا ریلا باہر آیا۔ فضا بھنے ہوئے بھٹوں، گرما گرم شکر قندی، مونگ پھلی، چپس، چاٹ کی ملی جلی خوشبو سے بھر گئی۔ رکشے، ٹیکسیوں والے اپنی اپنی سواریاں پوری کرنے میں لگے اور لڑکیاں ان ریڑھیوں

راحت جبیں

زندگی ہم تجھے گزاریں گے




PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

کی طرف مکھیوں کی طرح ٹوٹی تھیں۔ آج یوں بھی اسکول کا آخری دن تھا۔
پھر سردیوں کی چھٹیاں شروع ہو جاتی تھیں۔
''زمین!'' افشاں نے تیزی سے نکلتی زمین کا دوپٹا کھینچا تو اسے رکنا پڑا۔ ''اپنے ابا سے کہہ کر شکر قندی ہی کھلا دے۔''
زمین نے گردن موڑ کر اپنے ابا کی ریڑھی تلاش کی۔ سفید سرمئی کھچڑی بالوں والے ابا جی، لنڈے کا لمبا کالا کوٹ اور کانوں تک کالی ٹوپی پہنے...... کتنی لڑکیوں کے جھرمٹ میں کھڑے تھے۔ ان کے بوڑھے نیلی نسوں والے ہاتھ سرعت سے شکر قندی کی چاٹ بنا بنا کر بیچ رہے تھے۔ وہ عمر سے اتنے بوڑھے نہیں تھے، جتنا حالات نے انہیں بنا دیا تھا۔ ان کے چہرے کی ایک ایک سلوٹ میں مشقت...... مشقت اور صرف مشقت رقم تھی۔
سات پیٹ کھانے والے اور بس یہ دو ہاتھ کھلانے والے......
''یار! ابا نے مجھے بھی ساتھ ہی کاٹ کر ڈیں بنانے ہیں، نمک مرچ اور کھٹا ڈال کر تمہیں سپلائی کر دینا ہے۔''
زمین کے بے چارگی سے کھینچے نقشے پر افشاں کو بھر جھری ہی آ گئی۔
''ویسے کہہ دو نہیں کھلانی...... ایسا بھیانک نقشہ کھینچنے کی کیا ضرورت ہے۔'' نمک، مرچ اور کھٹے میں لپٹی زمین کو سوچ کر افشاں کو ابکائی آنے لگی تھی۔
''سامنے سے آؤ گڈی! سامنے سے...... کتنا بار کہا ہے، ریڑھی کے اس طرف نہیں آنا۔'' ٹاٹ کے ٹکڑے کے نیچے سے جھانکتے دس بیس کے نوٹ خطرے میں پڑ گئے تھے۔ تب ہی انور حسین نے حلاوت بھرے لہجے میں ٹوکا تو زمین کھلکھلا اٹھی۔ کسی اور کے مغالطے میں ابا اسے گڈی کہہ بیٹھے تھے۔
''کیا تکلیف ہے؟'' انور حسین اسے دیکھ کر جھنجلا گیا۔
زمین نے للچائی نظروں سے شکر قندی کی طرف اشارہ کیا۔
''دفع ہو، نہ گھر میں تیری زبان رکتی ہے نہ یہاں۔ بھاگ جا...... میری گاہکی خراب نہ کر۔'' جن سے پیسے لے چکے تھے وہ لڑکیاں ریڑھی پر چڑھی آ رہی تھیں۔
''اتنا رش ہو گیا ہے ابا جی! میں مدد کرواتی ہوں۔''
زمین چھری پکڑ کر کاٹنے لگی۔ انور حسین نے کھٹا نمک مرچ ڈال کر سپلائی شروع کی۔ پانچ فٹ چھ انچ قد والی نمکین سلونی لڑکی...... جس کے کندھوں سے نیچے بال، سیدھی مانگ نکال کر چٹیا میں گندھے تھے۔ جس کے ہونٹوں کے کناروں پر دبی دبی مسکان ہمیشہ کھلی رہتی۔ باپ کے ساتھ ریڑھی پر ہاتھ بٹاتی میٹرک کی اس اسٹوڈنٹ کو کسی نے بھی حیرت سے نہیں دیکھا تھا۔
یہاں آنے اور یہاں سے گزرنے والے لوگ اس منظر کو دیکھنے کے عادی تھے۔ اس کی اسکول فیلوز بھی جانتی تھیں کہ وہ انور حسین ریڑھی والے کی بیٹی ہے۔ شروع شروع میں وہ لپک کر اس کے باپ کی ریڑھی پر آتی تھیں۔ بیٹی کی سہیلی ہونے کے ناتے ہو سکتا ہے کچھ ٹکڑے زیادہ مل جائیں۔ مگر انور حسین تو بنیا تھا بنیا...... کہیں سے چار چھلیاں ٹل جاتیں تو بچوں کو کھلانے کے بجائے بھون کر ریڑھی پر رکھ لیتا۔
ادھر رش ٹوٹا...... انور حسین نے ذرا رک کر سکون کا سانس لیا۔ ادھر زمین نے بڑی سی شکر قندی اچکی...... اور افشاں کے ساتھ دوڑ لگا دی۔
انور حسین کا ہاتھ جوتی تک گیا، پھر ارد گرد دیکھ کر کھسیانا سا ہو کر سیدھا ہوا اور آج کی کمائی سنبھالنے لگا۔

☆☆☆

کالونی کی آخری سڑک عبور کرتے ہی منظر بدلنے لگا تھا۔ خوب صورت گھروں کی جگہ اب چھوٹے موٹے کچے پکے گھروں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ بھینسوں کا باڑا، اس کی مخصوص بو، باڑے میں موجود پندرہ بیس بھینسیں

ڈی سے بے زار، بڑی سست روی سے پونچھیں ہلاتیں، مکھیاں اڑاتیں، جگالی کر رہی تھیں۔ اس سے آگے
ڈں کی سڑک پر ان کے اسکول کے جوتے کھٹ کھٹ بج رہے تھے۔
''سوچ لیا ہے بس دسویں کر کے میں نے نہیں پڑھنا۔''
''تو کیا کرو گی؟''
''کالونی میں نیا دستکاری اسکول کھلا ہے، وہاں داخلہ لوں گی۔ سلائی سیکھوں گی۔'' افشاں کی پلاننگ مکمل تھی۔
''کالونی سے باہر نکلنے کو تمہارا دل نہیں چاہتا۔'' زرمین نے پلٹ کر خوب صورت کوٹھیوں کو دیکھا، جن کے
منے خوب صورت گھاس کے قطعے پر گیندے کے پیلے رنگ بکھرے تھے۔
''وہ دنیا ہماری نہیں ہے۔'' زرمین نے اپنے راستے پر نگاہ کی۔
''اللہ چاہتا تو ہم بھی کسی خوب صورت گھر میں پیدا ہو سکتے تھے۔'' افشاں کی حسرتیں ہی کم نہ ہوتی تھیں۔
''اللہ چاہتا تو ہم وہاں بھی پیدا ہو سکتے تھے......'' زرمین کی آنکھ کے اشارے پر افشاں نے دیکھا۔ کونے
ں کھمبے کے گرد کوڑے کا ڈھیر تھا...... پانچ چھ سال کے ایک ہی سائز کے چار بچوں کو کوڑے میں پھینکے گئے گلے
ے انار مل گئے تھے۔ وہ دائرہ بنائے انہیں چھیل رہے تھے۔ دانے بانٹ کر کھا رہے تھے۔
افشاں نے جھرجھری لے کر گردن سیدھی کی اور شرمندگی سے بات بدل دی۔
''دسویں کے بعد تم نے کیا کرنا ہے؟''
''میں نے......'' زرمین کے ہونٹوں کے کناروں میں مسکراہٹ گہری ہوئی۔ اس نے سامنے دیکھا۔
اس دو منزلہ سفید قلعی والے گھر کے سامنے وہ نیا نکور رکشہ آج بھی کھڑا تھا۔
''میں نے تو رکشہ چلانا ہے۔''
افشاں کا منہ کھل گیا۔
زرمین بھاگ کر رکشے کا ڈرائیور بن گئی۔
''تو کیا پاگل ہو گئی ہے؟''
''ذرا سوچو افشاں! یہ رکشہ میرا ہو اور میں ہر روز تمہیں اسکول چھوڑنے جاؤں۔''
''لڑکیاں رکشے کب سے چلانے لگیں؟'' افشاں گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی تاکہ ہونے والی ممکنہ بے عزتی
ندازہ لگا سکے۔
''پہلے تو لڑکیاں موٹر سائیکل بھی نہیں چلاتی تھیں، اس دن بسم اللہ بیکری کے سامنے موٹر سائیکل والی لڑکی
ی تھی نا۔ کس مزے سے اپنے بہن بھائیوں کو شاپنگ کروا رہی تھی۔''
بیٹھک کے جالی دار دروازے کے باہر ہونے والی ہلچل کو اس نے بے زاری سے دیکھا...... بس تھوڑی دیر
م کرنے ہی تو آیا تھا مگر باہر کھڑے نئے نکور رکشے کے ساتھ بچے وہی سلوک کرتے جو نئی نویلی ووہٹی کے
ھ کرتے ہیں۔ اس کی نیم وا آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔
وہاں بچے نہیں بچیاں تھیں۔ وہ بھی بڑی بڑی......
''زرمین! خود بھی مار کھائے گی اور مجھے بھی کھلائے گی۔ اب آجا...... گھر چلیں۔ اب بہت دیر ہو گئی ہے۔
ئے کا مالک آجائے گا۔''
افشاں کی آواز گھٹ گئی۔ اس کی نظروں کے عین سامنے جالی کا دروازہ کھل گیا تھا۔
''تو آجائے...... میں پوچھ تو لوں، رکشہ چلا نے کی پہلی شرط کیا ہے۔''
''زرمین بھاگ......'' افشاں نعرہ لگاتی وہاں بھاگ لی تھی۔ زرمین نے بھی ہرنی کی طرح قلانچیں بھرنی

چاہیں، مگر اس کی کلائی مراد کی گرفت میں تھی۔
"پہلی شرط یہ ہے کہ رکشہ آپ کا اپنا ہو۔"
نرمین نے زور لگا کر کلائی چھڑانی چاہی۔
"اور دوسری...... سکھانے والا میرے جیسا..." ا تھ ہی اس نے چیخ ماری کیونکہ نرمین نے دانت اس کی کلائی میں گاڑ دیے تھے۔ پھر ہرنی غائب ہو گئی۔
"کیا جنگلی بلی تھی۔" اس کے ہاتھ پر گڑ... دانتوں کے نشان تکلیف دے رہے تھے۔ "کھا تھوڑی جاتا...... بس ڈرانے ہی تو لگا تھا۔"
تب ہی اس کی نگاہ رکشے میں پڑے اسکول بیگ پر پڑی۔ تو وہ بے ساختہ ہنسا۔
دونوں گھر کے دروازے پر جا رکیں۔
"ذلیل نہ ہو تو...... کیسے زور کی کلائی پکڑلی۔" نرمین نے پھولی سانس درست کرتے اپنی کلائی پر پڑے نشان کو دیکھا۔
"ہائے...... کیسے نشان پڑ گیا ہے۔"
"نشان تو میں ڈال کر آئی ہوں...... یاد ہی کرے گا۔"
"نرمین! تمہیں بھی بڑا شوق ہے پنگے لینے کا۔ کیا ضرورت تھی، خواہ مخواہ اس کے رکشے میں جا کر بیٹھ گئیں۔ آئندہ ایسی کوئی حرکت کی تو میں تمہارے ساتھ اسکول نہیں جاؤں گی۔" افشاں نے اپنا بیگ ایک سے دوسرے کندھے پر منتقل کیا تو نرمین کو ایک دم اپنے خالی کندھوں کا احساس ہوا۔
"افشاں......!" نرمین کا رنگ اڑ گیا تھا۔
"اب کیا ہے......؟" افشاں اپنے گھر کی کنڈی کھٹکھٹا چکی تھی۔
"میرا بیگ......"
دروازہ نرمین کے گھر کا کھلا تھا اور سوال ثمینہ نے کیا تھا۔
"کیا ہوا تمہارے بیگ کو......؟"
دونوں کی بولتی بند ہو گئی۔ نرمین نے مدد طلب نگاہوں سے افشاں کو دیکھا۔ مگر افشاں کی چھوٹی بہن نے دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ نظریں چراتے غڑاپ سے اندر غائب ہو گئی۔
"نمو! بیگ کہاں ہے؟"
"وہ امی جی...... پیچھے کتا لگ گیا تھا۔ ہم نے بھاگ کر جان بچائی تو بیگ گلی میں گر گیا۔" اس نے اٹک اٹک کر بہانا گھڑا۔
"حد کرتی ہے نمو! کوئی اس طرح اپنی کتابیں پھینک کر آتا ہے، اب کیا کریں؟ یہاں تو کوئی ہے بھی نہیں......" ثمینہ نے ادھر اُدھر گلی میں جھانکا۔
"امی جی! بیگ کوئی اٹھا کر لے جائے گا۔ میں بس یوں گئی اور یوں آئی۔"
"تمہارے ابا نے میری گردن اتار دینی ہے۔" ثمینہ فکر مندی سے باہر نکل آئی۔ تب ہی گلی کے نکڑ سے ہاتھ میں کچھ کتابیں لیے وہ نمودار ہوا۔ دبلا پتلا، لمبا تڑنگا...... جس کے بال بنانے کے باوجود ماتھے پر بکھرے رہتے تھے۔ فرخ جمال...... گورنمنٹ بوائز کالج میں ایف ایس سی کا اسٹوڈنٹ......
"کیا ہوا چاچی؟" اس نے دور سے ہی پوچھ لیا۔ بھلا چاچی ثمینہ کہاں گلیوں نکلتی دکھائی دیتی تھی، سوائے اشد ضرورت کے۔ اسے تو سبزی بھی لینا ہوتی تو چھوٹے والے کو ہی بھیجتی تھی۔
"فرخ! جا میرا بچہ...... بھاگ کر اس نرمین کے ساتھ جا...... یہ اپنا بیگ کہیں گرا آئی ہے۔"

”بیگ تھا یا پال پوائنٹ...... جو گرا بھی آئی اور پتا بھی نہ چلا۔“
کان میں انگلی چلاتے اس نے نرمین کو دیکھا۔ جس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ سرپٹ دوڑ لگائے، جبکہ وہ خراماں خراماں چل رہا تھا۔
”تیز نہیں چل سکتے۔ اللہ نے اتنی لمبی ٹانگیں کس لیے دی ہیں۔“ نرمین تنک کر بولی۔
”کتنا تیز جتنا شادی کا کھانا کھا کر بھاگے تھے۔“ بچپن کی ایک ایک یاد فرخ کی فنگر ٹپس پر تھی۔ جب وہ کالونی کی ایک شادی میں عین کھانے کے وقت بن بلائے گھس گئے، اور بھانڈا پھوٹنے پر جس طرح چکن پیس لے کر بھاگے تھے۔
نرمین کو بھی ہنسی آ گئی۔
”تمہیں اب بھی یاد ہے۔“
”مجھے تو ایک ایک بات یاد ہے۔“ فرخ نے گردن موڑ کر نرمین کو دیکھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور دوپٹا ٹھوڑی کے نیچے دبوچ رکھا تھا کہ تیز چلنے سے اڑ نہ جائے۔
”تمہاری یادداشت کو سلام۔ اب چلنا ہے تو چلو۔“ وہ مزید تیز ہوئی۔
”اتنی تیزی پڑھائی میں دکھائی ہوئی تو آج تم بھی کالج میں ہوتیں۔“
نرمین نے زیر لب اسے گالیوں سے نوازا جو باقی باتوں کی طرح یہ بھی نہ بھولتا تھا کہ ابتدائی کلاسوں میں وہ دوبار فیل ہوئی تھی۔ ایک ہی محلے میں رہنے کا یہی تو نقصان تھا۔
نرمین کے قدم مقررہ جگہ پر رکے۔
وہاں نہ رکشہ تھا نہ رکشے والا......
”یہ...... یہیں تو تھا۔“ وہ روہانسی ہوگئی۔
”بیگ کا کیا قصہ ہے؟“
”کوئی قصہ نہیں۔ یہاں ایک رکشہ تھا جس میں میرا بیگ تھا۔“
”رکشے میں تمہارا بیگ کیا کر رہا تھا؟“
”انڈے دے رہا تھا۔“ نرمین جھنجلائی تو فرخ اچھل پڑا۔
”تمہارا بیگ انڈے بھی دیتا ہے؟“
نرمین نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا تو مزے سے ہاتھ جھاڑ کر بولا۔
”رکشے والا انڈوں سمیت تمہارا بیگ لے کر بھاگ گیا ہے۔“
”ہائے فرخ! اب میں کیا کروں گی؟“ وہ رونے والی ہوگئی۔ امی ابا کی متوقع مار کا خوف اعصاب پر طاری ہوگیا۔ لتے بولتے رکشے کا پورا حلیہ بیان کر دیا۔ ظاہر ہے رکشے کو ہی آتے جاتے اتنے پیار سے دیکھتی تھی کہ ازبر ہوگیا تھا۔
”وہ رکشہ تو مراد بھائی کا ہے۔“
”تم اسے جانتے ہو۔ پلیز میرا بیگ لا دو فرخ!“ لہجہ ملتجی ہوگیا۔
”اچھا رات کو دیکھوں گا، رکشہ نہیں ہے، مطلب وہ گھر پر نہیں ہیں۔“ فرخ نے گھر کے بند دروازے کو دیکھا۔
”مراد بھائی اکیلے رہتے ہیں...... اور میں نے کہا نا، میں رات کو آ کر لے جاؤں گا۔ انہوں نے تمہارا بیگ ہ کر کیا کرنا ہے۔“
فرخ کے تسلی دینے پر وہ ڈوبتے دل کے ساتھ گھر واپس آئی تھی۔ جہاں افشاں یونیفارم بدلے، دیوار سے ا بیگ کا پوچھ رہی تھی۔ نرمین نے اس کو ہاتھ کے اشارے سے لعنت دکھائی اور کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

سردراتوں کی نیم خاموشی میں کاکے کے ہوٹل پر حدت بھی تھی اور رونق بھی۔ چکن کڑاہی اور تیز پتی کی چائے......
چھوٹا ایک ہی بڑی سی میز کے گرد چکرار ہاتھا جہاں بازی جمی تھی اور چائے کا دور چل رہا تھا۔ کا کا بس نام کا کا تھا۔ ورنہ بھاری بدن، لمبا قد، نکلی ہوئی توند...... بھاری مونچھیں، سانولی رنگت، ہلکے گھنگھریالے بال، جواب گھنگھریالے کم اور ہلکے زیادہ تھے۔ وہ سرعت سے لوہے کی کڑاہی میں مرغی بھون رہا تھا۔ یہاں سب اکثر ہی جمع ہوتے۔ کچھ احتیاط سے ایک آدھ بازی لگا، چائے پی۔ گپ شپ لگا کر اپنا کھیسہ (جیب) بچا نکل جاتے تھے۔
اور کچھ وہ بھی ہوتے، جیسے جیسے رات گہری ہوتی طبیعت رواں ہوتی۔ جذبہ بڑھتا۔ سادہ سی تاش کی بازیاں جوئے میں ڈھل جاتیں۔ جیبیں خالی ہوتیں اور دل و دماغ پچھتاووں سے بھر جاتے۔ ''دن بھر کی کمائی کیسے منٹوں میں اڑ گئی؟'' یہ خجالت گھر جا کر بیویوں کو مار کر کم ہوتی۔ جو پوچھ لیتی تھیں۔
''ساری رات کون سی کمائی کر کے آئے ہو۔''
ان ہی میں ایک، وہ تھا...... جس نے ایک حد مقرر کر رکھی تھی۔
کسی کا طنز، کسی کا بہلاوا...... یا کسی کا بھی طعنہ اسے اس حد سے باہر جانے پر آمادہ نہ کر سکا تھا۔
آج بھی اس نے پتے پھینکے اور کھڑا ہو گیا۔
''چل یار! ابھی تو رات شروع ہوئی ہے۔'' رفیق نے اسے حیرت سے دیکھا، وہ ہر روز اسے اسی حیرت سے دیکھتا تھا۔
''پر اسے یہاں ختم کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔'' وہ مبہم سا مسکرایا اور سب اس کی مسکراہٹ پر اٹک گئے۔
''تو پھر کہاں ختم کرنے کا ارادہ ہے۔'' منشی اکرام نے معنی خیزی سے کہا تو قہقہہ لگا کر اس کی طرف جھکا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔
''جہاں تمہاری صبح ہوتی ہے۔'' اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا۔ اکرام کا رنگ اڑ گیا۔
اینٹوں کے بھٹے پر نیا خاندان کام کرنے آیا تھا۔
ان کی بڑی بہو چھلکتی بھرتی صراحی تھی۔ ابھی تو اس کی خبر بھٹے والوں کو بھی نہ ہوئی تھی۔ یہ کم بخت، کم عمر نوجوان رکشہ ڈرائیور کہاں سے خبر اڑا لایا۔
''کم از کم وہاں نہیں۔''
اکرام کے اچھی طرح پسینے چھڑا کر مراد نے جملہ پورا کیا تھا۔
اکرام نے غیر محسوس انداز میں سانس باہر نکالی۔ اس کی حالت پر سب کو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔
''شرم کر مرادے! اپنی اور میری عمر دیکھ۔''
''یہی تو میں کہہ رہا ہوں چاچا! اپنی اور میری عمر دیکھ......'' وہ کہہ کر ہاتھ ہلا کر چلا گیا۔
''اپنی بات کا پکا ہے۔''
''رہن دے۔ ہیرو بننے کی کوشش کرتا ہے۔'' اکرام نے خجالت مٹانے کو گالی دی۔
''اس چائے والے کی طرح...... رکشے والے کی بھی کوئی تصویر لے لے تو ہیرو ہی بن جائے گا۔ قد بت، شکل و صورت...... بی اے کے پرچے دے دیتا تو آج گریجویٹ کہلاتا۔'' کا کا ویسے بھی مراد کو پسند کرتا تھا۔ تب ہی کڑاہی پر ہرا مسالا ڈالتے بول اٹھا۔
''بن گئی ہے تو لے آ...... یا بھوکا مارے گا۔'' اکرام نے بات بدل دی۔ یہاں مراد کو پسند کرنے والوں کی تعداد خاصی تھی۔ بات بدلنے میں ہی عزت تھی۔

☆☆☆

پورے دن کی روٹین ایسی نہیں تھی کہ وہ تھک کر چور بستر پر گرے اور سو جائے۔ بلکہ ابھی تو زندگی کی سختیاں کچھ کم ہوئی
ئیں۔ تب ہی تو وہ مسکرانے لگا تھا۔ دوستوں میں وقت گزارنے لگا تھا۔ نہا کر کپڑے بدل کر، کمرے میں آیا تو الماری کے
س رک گیا۔ اس کی بی اے کی کتابیں ایک ترتیب سے رکھی تھیں۔ کبھی کبھی آدھی رات کو یہ کتابیں سانس لینے لگتیں۔ ان کی
رگوشیاں شکایتوں میں ڈھل جاتیں۔ وہ تو اس کی زندگی کا مقصد تھیں، وہ کیسے انہیں الماری میں بند کر کے بھول گیا تھا۔

"بھولا کہاں ہوں، بس کچھ خواب طاقچوں میں سجنے کے لیے ہوتے ہیں۔"

اس کی ٹھنڈی پوروں نے مقدس صحیفے سمجھ کر ان کتابوں کو چھوا۔

("تو صرف نام کا مراد نہیں ہے میرا بچڑا! تو میرے دل کی مراد ہے۔ ایک دن آئے گا، جب ترکھانوں کے بوہے پر ماسٹر مراد علی کے نام کی تختی سجے گی)۔

"تمہارا ماسٹر مراد...... رکشے والا مراد بن گیا ہے ابا جی!"

وہ کرلاتا ہوا پلنگ پر آ بیٹھا۔

اسی لیے تو گھر جلدی نہ آتا تھا۔

اس کے آنے سے پہلے یہاں علی بخش ترکھان، پیڑھی ڈال کر بیٹھ جاتا تھا۔

اپنی چھدری داڑھی کھجاتا، باتوں کے رندے پھیر کر ڈھلتی رات کو تیلی پتنگ کر دیتا۔ صبح مراد علی کا سارا بستر
توں کے بورے سے اٹا ہوتا۔ اسے ہر روز بستر کی چادر جھاڑ کر علی بخش ترکھان کو بصد احترام اور بصد اصرار
خصت کرنا پڑتا۔ ورنہ اس کا بس نہ چلتا۔ چک 59 سے اپنا سامان اٹھا کر یہیں قیام پذیر ہو جاتا۔

مراد نے چونک کر گردن گھمائی۔

بستر پر پڑے بیگ کو دیکھ کر ایک لمحے کو یاد ہی نہ آیا کہ کہاں سے آیا تھا۔

دوسرے لمحے ہاتھ پر پڑا آدھا ادھورا چاند نمایاں ہو گیا۔

"کیا تیز دانت تھے...... جنگلی بلی......" اس نے بیگ پاس کھینچ کر کھولا۔ وہی ساری چیزیں جو میٹرک کی سٹوڈنٹ کے بیگ میں ہو سکتی تھیں۔ کتابیں، کاپیاں، جیومیٹری باکس...... اس نے یوں ہی بے خیالی میں ایک کاپی کھولی۔ پہلے صفحے پر بہت خوب صورت لکھائی میں نام لکھا تھا "نرمین فاطمہ والد انور حسین"۔

"مراد علی ولد علی بخش۔"

ماسٹر ہدایت اللہ کی پاٹ دار آواز پورے کلاس روم میں گونجی۔

وہ جو چالیس بچوں کی کلاس میں سب سے آخری رو میں بیٹھا تھا، مزید سمٹ گیا۔

ماسٹر صاحب کی پکار وہ پکار تھی جس کے بعد ننھے منے دلوں اور جسموں پر قیامت ہی ٹوٹتی تھی۔ مگر افسوس
نیٹر نے اسے کالر سے پکڑ کر ماسٹر صاحب کے روبرو پیش کر دیا تھا۔

"ادھر سیدا ہو نالائق......!"

نالائق نے اپنی ننھی منی ہتھیلی ان کے سامنے پھیلا کر اسی لمحے ماسٹر صاحب کو دل کا دورہ پڑنے کی دعا بھی کر ڈالی۔

"کیا لکھائی ہے...... کیا خوش خطی ہے...... جیسے موتی پروئے ہیں۔ ایسی لکھائی تو میرے ابے کی تھی۔"

حالانکہ ماسٹر صاحب کے ابا جی نے کبھی الف بھی لکھ کر نہ دیکھا تھا۔ مگر بس یہ ماسٹر صاحب کی تعریف کی انتہا تھی۔

مراد نے پٹ سے آنکھیں کھولیں۔

ماسٹر صاحب اس کی کاپی کے صفحے کو دیکھ کر سر دھن رہے تھے۔

"سچ سچ بتا...... کس نے تیرا نام لکھا ہے؟"

"میں نے لکھا ہے جی......" ننھا منا سینہ چوڑا ہو گیا۔

''کیا بات ہے..... تیرا خط کس نے درست کروایا ہے مرادے؟''
''میرے ابا جی نے.....'' اس نے مزید چوڑا ہو کر بتایا۔
کاپی کے کھلے صفحے پر اس کا نام ٹکے والی قلم کے ساتھ لکھا جگمگا رہا تھا۔
مراد علی ولد علی.....
''دیکھو نالائقو!..... یہ ہوتی ہے لکھائی۔ اس طرح لکھا جاتا ہے۔ ڈوب مرو چوہدریو..... ترکھانوں کا لڑکا بازی لے گیا۔'' ماسٹر صاحب کاپی لہرا لہرا کر جماعت کے دوسرے لڑکوں کو غیرت دلا رہے تھے۔
ترکھانوں کا لڑکا ہواؤں میں اڑنے لگا ہی تھا کہ غبارے سے ہوا نکل گئی۔
ہانپتا کانپتا بشیر نائی اپنی دھوتی سنبھالتا کلاس میں گھستا چلا آیا۔
''مراد علی..... اوہ مراد علی.....!''
ماسٹر صاحب نے جھک کر اپنے کھسے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
''تیرے ابے کو دل کا دورہ پڑا ہے۔''
ماسٹر صاحب جھکے کے جھکے رہ گئے۔
اور مراد علی حیرت سے سوچ رہا تھا، ماسٹر صاحب کے لیے مانگی گئی دعا ابو جی کو کیسے لگ گئی۔
مراد نے تیزی سے کاپی بند کر کے بیگ میں گھسیڑی اور بیگ اٹھا کر کرسی پر پھینک دیا تھا۔ ماضی تکلیف دہ تھا، بہت زیادہ تکلیف دہ.....!

☆☆☆

کوئی چار دن کے بعد ہلکی سی دھوپ نے شکل دکھائی تو ہر گھر کا صحن اور چھتیں دھلے کپڑوں، نہائے دھوئے بچوں اور دھلی ہوئی گندم سے بھر گئے۔ نرمین نے بھی سارے کپڑے ماں کے ساتھ مل کر دھوئے تھے۔ اس سے چھوٹی ثمرین بھاگ بھاگ کر تاروں پر ڈالتی رہی۔ چھوٹے دونوں کی خوب رگڑ رگڑ کر بدن اور سر پر مالش کی۔ حذیفہ اور طلحہ دونوں جڑواں تھے۔ پانچ سال کی عمر میں اب جا کر اسکول میں داخل ہوئے تھے۔
''گرم پانی رکھ دے ثمو! دھوپ جا رہی ہے، ان کو تو نہلا دوں۔'' ثمینہ نے آواز لگائی۔ دونوں اب لنڈے کے پائجامے پہنے چارپائی پر اچھل رہے تھے۔ پاس ہی ثمرین سے چھوٹی فضہ ٹاٹ بچھائے اپنے کپڑے کی گڑیاں رکھے بڑی سنجیدگی اور انہماک سے انہیں دو کا پہاڑہ یاد کروا رہی تھی۔ جو کبھی اسے خود بھی یاد نہ ہوا تھا۔
''امی جی! کام ختم ہو گیا تو میں تھوڑی دیر خالہ خدیجہ کی طرف ہو آؤں۔''
خدیجہ فرخ کی امی تھیں..... اور اسے فرخ سے اپنے بیگ کا پتا کرنا تھا۔ بیگ نہ ملا تو وہ چھٹیوں کے بعد کیا کرے گی۔ سوچ کر ہی دل ڈوب جاتا تھا۔
''چلی جانا..... جا دیکھ، اس نے پانی گرم رکھا ہے۔''
خدیجہ خالہ صحن کے بیچ پیڑھی کھینچے بال بکھیرے سر میں تیل کی مالش کر کے بال گوندھنے کی تیاریوں میں تھیں۔
''سلام خالہ جی.....''
''کتنے دنوں کے بعد خالہ کی یاد آئی ہے۔ نہ تمہیں فرصت ملتی ہے نہ تمہاری ماں کو۔'' انہوں نے سلام کا جواب دے کر پیار سے شکوہ کیا۔
''چھوٹے چھوٹے دن ہیں خالہ جی! کب گزر گئے، پتا ہی نہیں چلتا۔'' نرمین نے ان کے ہاتھ سے تیل کی شیشی لے لی۔ صاف ستھرا گھر خاموش خاموش تھا۔ پاس ہی دھلی ہوئی گندم چارپائی پر سوکھنے کو ڈال رکھی تھی۔ فرخ کا گھرانہ ان چند خوش قسمت گھروں میں سے تھا جو سال بھر کے لیے گندم ایک ساتھ خرید لیتے تھے۔

"تمہاری ماں سے کہا بھی تھا، کبھی کبھار آ کر گندم وغیرہ دھو جایا کرے۔ کچھ چھوٹے موٹے کام کر جائے تو چار پیسے ہی بنیں گے۔"
"ابو جی کو اچھا نہیں لگتا۔" نرمین کا لہجہ مدھم ہو گیا۔ حالات ہمیشہ سے تو ایسے نہ تھے کبھی وہ بھی گندم خریدا کرتے تھے۔
"اتنے جی کھانے والے، خود کیا کیا کرے گا۔ محنت میں کیا عار۔" خدیجہ خالہ کے لہجے میں ہمدردی اور ترس تھا۔ نرمین نے تیزی سے تیل لگا کر چٹیا گوندھ دی۔ ساتھ ساتھ محنت کی عظمت پر لیکچر بھی سن لیا۔
"خالہ جی! فرخ گھر پر نہیں ہے۔ مجھے ایک کتاب کا پوچھنا تھا۔" اس نے تیل کی شیشی طاقچے میں رکھتے، ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
"اندر ہی پڑھنے بیٹھا تھا۔ چھٹیوں کے بعد پرچے ہیں نا۔" انہیں سبزی والے کی آواز آنے لگی۔ "جاؤ، پوچھ لو۔"
وہ خود سبزی والے کو آوازیں دیتی باہر کی طرف لپکیں۔
"فرخ...... فرخ......!" وہ کھلے دروازے سے آوازیں دیتی اندر گھسی۔ اس کے عقب میں دروازہ کھڑاک کے ساتھ بند ہوا۔ کمرے میں اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ نرمین کی جان نکل گئی۔

☆☆☆

صحن میں دو بوریاں پڑی تھیں۔ ایک موسمبیوں سے بھری اور دوسری کچی مونگ پھلی سے۔ بچوں کا بس نہ چلتا تھا کہ ان میں کہیں سے سوراخ ہو جائے تو کم از کم دیدار تو نصیب ہو۔ مگر ابا اور ماموں سہیل کے ہوتے یہ ممکن ہی کہاں تھا۔ دونوں چارپائیوں پر بیٹھے باتوں میں مگن تھے۔ سہیل کے پیروں میں ثمینہ کا جہیز کا سفید کھیس اور سر تلے کڑھائی والا تکیہ تھا۔ وہ لیہ سے یہ سوغاتیں ہر سال لے کے گھر پہنچا تا۔ ثمینہ اپنے محدود مسائل کے ساتھ بھائی کی خاطر مدارت میں لگی تھی۔ وہ ایک لمبے قد کی دبلی پتلی پھرتیلی سی عورت تھی۔ مگر جڑواں بچوں کی پیدائش پر وہ جس طرح بیمار رہی۔ اس سے جلدی تھکنے لگی تھی۔
"نرمین کہاں ہے گڈی......؟" سہیل اب بھی ثمینہ کو گڈی کہتا تھا۔
"یہیں محلے میں گئی ہے۔" وہ انڈے ابال رہی تھی۔ گھر کی مرغیاں پالنے کا یہی تو فائدہ تھا، مہمانوں کے سامنے بھرم رہ جاتا تھا۔ ماں باپ تو تھے نہیں۔ جن کے سامنے اپنے حالات کا رونا روتی۔ بھائی تھے جو سال کے سال آ کر میکے کے ہونے کا احساس دلا جاتے تھے۔
"اب بڑی ہو گئی ہے، محلے میں اس طرح اکیلے نہ بھیجا کر گڈی۔" سہیل نے نرمی سے ٹوکا۔ "ابا کا یاد ہے، کبھی جو تم لوگوں کو محلے میں نکلنے دیا ہو۔"
"میں بھی سمجھاتا رہتا ہوں۔ اب بڑی ہو گئی ہے۔" انور حسین نے ثمینہ کو گھورا۔
"کہاں جاتی ہے۔ خدیجہ کے گھر تک گئی ہے۔" ثمینہ چائے کی ٹرے لیے کچن سے نکلی۔
"جا ثمو! بہن کو بلا کر لا۔ کہنا، ماما جی آئے ہیں۔"
ثمرین اپنی چھوٹی سی لوئی (گرم چادر) سنبھالتی باہر کی سمت بھاگ لی۔
"دکان چھڑا لی انور......" چائے دیکھ کر سہیل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
"وہ بھی چھوٹ جائے گی۔" انور خجالت مٹانے کو ہنسا۔
ثمینہ جلدی سے بھائی کے سامنے چائے رکھنے لگی۔ چھوٹی سی کریانے کی دکان تھی۔ مگر بہت اچھا گزارا ہو رہا تھا۔ مگر جب ثمینہ کے ہاں جڑواں بچوں کی پیدائش دائیوں کی تمام تر تجربہ کاریوں اور کوششوں کے باوجود گھر میں نہ ہو سکی تو اس کی حالت خراب ہونے پر اسپتال لے جایا گیا تو ڈاکٹرز نے آپریشن بتایا تھا اور جتنی رقم بتائی تھی۔ وہ انور حسین کے

لیے بندوبست کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ تب اس نے اپنی دکان اکرام کے ہاتھ گروی رکھ دی۔ چھوٹے سے علاقے کی دکان بہت مہنگی تو نہیں تھی مگر ثمینہ اپنے بیٹوں کے ساتھ خیر خیریت سے گھر واپس آ گئی۔

تب سے اب تک وہ دکان دار سے ریڑھی دار تھا۔

بچوں کی تعداد کے ساتھ اخراجات بھی بڑھے۔ اب ہر مہینے بس سود کی رقم ادا ہوتی تھی۔ اصل رقم اپنی جگہ کھڑی تھی۔

''اچھی بھلی دکان سے ریڑھی پر آ گیا۔ دیکھ کر دل ڈوبتا ہے۔''

سہیل نے گرم گھونٹ کے ساتھ آہ بھری۔

''حالات لے آئے ورنہ کس کا دل چاہتا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ حالات بھی اچھے ہو جائیں گے۔''

ثمینہ نے ہنس کر بات ٹال دی اور فضہ کو دیکھنے لگی۔ وہ برآمدے میں بھائیوں کو قابو کیے بیٹھی تھی۔ ورنہ مہمان کے سامنے سے سارے انڈے غائب ہو چکے ہوتے۔

☆☆☆

''خالہ..... خالہ.....''

اندھیرے میں گھبرا کر نرمین کو نہ دروازہ کا لاک سوجھ رہا تھا نہ دیوار پر لگا سوئچ بورڈ۔ کمرہ تھا کہ تہہ خانہ..... نہ کوئی کھڑکی نہ روشن دان......

کمبل میں محو خواب فرخ ہڑبڑا کر جاگا۔

''کون ہے؟''

''خالہ!'' نرمین کو فرخ کی آواز میں کسی بھوت کے مشابہ ہی لگی تھی۔ خالہ کا سبزی والا دور نکل گیا تھا۔ وہ چار گھر چھوڑ کر اس سے لڑنے میں مصروف تھیں کہ وہ ان کی آواز پر رکا نہیں۔

''کیا ہوا..... کون ہے۔'' فرخ گھبرا کر پاس آیا۔ اس سے کہیں زیادہ گھبرا کر نرمین نے چیخنا شروع کر دیا۔

گھبراہٹ میں ہاتھ مار کر فرخ نے لائٹ جلائی۔

باہر ثمرین نے ان کے چیخنے کی آوازیں سنیں تو الٹے قدموں باہر بھاگی۔

''خالہ..... خالہ..... جلدی آئیں۔ کمرے میں نمو اور فرخ بھائی چیخیں مارے جا رہے ہیں۔'' ثمرین نے اپنے مخصوص انداز میں دہائی دے کر خالہ کے قدموں تلے سے زمین نکال دی۔ سبزی والا ہاتھ روک کر انہیں دیکھنے لگا۔

خالہ اپنے بھاری جثے کے ساتھ ساری گلی کو ہلاتی گھر کی طرف بھاگیں۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کیوں چلا رہی ہو۔''

''دروازہ بند ہو گیا تھا.....'' وہ چھپکلی کی طرح دروازے سے لپٹی تھی۔

فرخ نے دانت کچکچا کر اسے بازو سے کھینچ کر پیچھے کیا اور ساتھ ہی آٹو میٹک لاک گھما کر کھول دیا۔

''تو اس میں گھبرانے والی کیا بات ہے۔''

''کنڈی نہیں ہل رہی تھی۔'' وہ جیسے کسی قبر سے باہر آئی۔

''آئی کیا کرنے تھی؟''

''میں تو بیگ کا پتا کرنے آئی تھی۔ پتا نہیں دروازہ کیسے بند ہو گیا۔''

نرمین نے شرمندگی سے دوپٹے کے پلو سے ماتھا صاف کیا۔

وہ نظریں چرا رہی تھی۔

فرخ نے ایک دم خود کو بڑا پڑا محسوس کرتے نرمین کو غور سے دیکھا۔
"بند دروازے سے ڈری تھی یا مجھ سے......؟"
"تم سے کیوں ڈروں گی؟ بندر نہیں کے......" وہ تنک کر بولی تو فرخ بدمزا ہو گیا۔
"گیا تھا...... مگر مراد بھائی گھر پر نہیں تھے۔ جب ملیں گے تو لے آؤں گا۔"
"کیا ہوا؟ یہ ثمرین کیا کہہ رہی ہے......؟" ثمرین کے ساتھ خالہ افتاں و خیزاں نازل ہوئیں۔
نرمین نے ثمرین کا ہاتھ پکڑا اور سلام کرتی تیزی سے نکل گئی۔
باقی سوال جواب فرخ خود ہی بھگت لیتا۔
"آپا! تم اور فرخ بھائی کمرے میں کیوں چلا رہے تھے۔"
تیز تیز چلتے ثمرین کی چپل اتر گئی۔ پہنتے پہنتے معصومیت سے پوچھنے لگی۔ نرمین کے قدم ٹھٹھک کر رکے۔
(بند دروازے سے ڈری تھی یا مجھ سے)
"ہم نے چھپکلی دیکھ لی تھی۔ پر یہ بات کسی اور سے نہ کہنا۔"
"کیوں......؟"
"سب کہیں گے، ثمو کی آپا ڈرپوک ہے۔"
"نہیں کہوں گی......"
"شاباش......" نرمین اس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگی۔
"فرخ بھائی بھی چھپکلی سے ڈرتے ہیں۔"
"ہاں......" وہ مسکرائی۔ "بتاؤ، ماما جی کیا کیا لائے ہیں۔"
نرمین کے بات بدلنے پر ثمرین جوش میں تفصیل بتانے لگی۔

☆☆☆

"مراد بھائی......" گھر لاک کر کے وہ رکشے میں بیٹھا ہی تھا کہ فرخ سامنے آ گیا۔
"ہاں لمبو! کیا حال ہے۔ کدھر غائب ہوتا ہے۔" مراد نے خوش دلی سے پوچھا۔ میٹرک میں فرخ نے اس سے میتھس پڑھا تھا۔ استاد ہونے کے ناتے وہ مراد کی عزت بھی بہت کرتا تھا۔
"کدھر غائب ہونا ہے۔ یہیں ہوتا ہوں۔ آپ سنائیں...... رکشہ تو بہت فٹ لیا ہے۔" فرخ نے ستائشی نظروں سے رکشے کو دیکھا۔ "کرائے کا ہے یا......"
"گھر کرائے کا ہے، سواری اپنی ہے۔" مراد نے فخر سے گدی پر ہاتھ مارا۔
"بہت بہت مبارک ہو بھیا! اب ہمت کر کے بی اے کا امتحان بھی دے دیں۔" فرخ نے پورے خلوص سے مشورہ دیا۔
"دیکھتا ہوں یار! اتنی مشقت کے بعد اب پڑھائی کی طرف ذہن نہیں بن رہا۔"
"یہ تو زیادتی ہے بھیا......! خوامخواہ اپنی ذہانت ضائع کریں گے؟" فرخ نے افسوس سے اسے دیکھا۔
چل چھوڑ ان باتوں کو۔ بیٹھ، چکر لگوا کے لاتا ہوں۔" مراد نے بات بدلی۔
"نہیں بھیا! ابھی تو ایک کام سے آیا تھا۔"
"کیسا کام؟"
"وہ اس دن نرمین اپنا بیگ آپ کے رکشے میں بھول گئی تھی۔"
"نرمین......" مراد چونکا۔

''ہاں، ہمارے محلے میں رہتی ہے۔ اپنی کتابوں کے لیے بہت پریشان تھی۔''

''اچھا یار...... ابھی تو میں نے گھر لاک کر دیا ہے۔ اکیڈمی سے بچوں کو لینا ہے۔ اس لیے لیٹ بھی ہو رہا ہوں۔ گھر کہاں ہے، میں شام کو پہنچا دوں گا۔'' مراد نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

''یہ دو گلیاں چھوڑ کر کھیتوں کے پاس۔ آخری گھر ہے انور حسین کا۔'' فرخ نے سادگی سے بتا دیا۔

''چل فکر نہ کر...... شام کو بھجوا دوں گا۔''

''ضرور...... نرمین بہت پریشان تھی۔'' اس نے جاتے جاتے تاکید کی۔

''جنگلی بلی پریشان بھی ہوتی ہے۔'' مراد زیر لب مسکرایا۔

☆☆☆

افشاں اور نرمین صحن میں چارپائی پر بیٹھی چھٹیوں کا کام کر رہی تھیں۔ اپنے پاس تو کتابیں تھیں نہیں۔ اس لیے افشاں کی مدد لینا پڑتی۔ وہ بھی اسی بہانے گھر کے کاموں سے جان چھڑا کر بیگ اٹھائے بھاگ آئی تھی۔

''اگر تمہارا بیگ نہ ملا تو کیا کرو گی؟''

''جواب کر رہی ہوں۔'' نرمین چڑ گئی۔ وہ خود اتنی پریشان تھی۔

''غصہ کیوں ہوتی ہو۔ میں نے تو نہیں کہا تھا کہ رکشے میں سوار ہو۔'' افشاں ناراض ہو گئی۔

''تو کیا کروں؟ دن میں تیس بار یہی سوال کرتی ہو۔ اس کم بخت فرخ نے وعدہ کر لیا تھا مگر ذرا جو پروا کی ہو۔''

''چل، فرخ کے گھر چل کے پتا کرتے ہیں۔''

''میں نہیں جا رہی۔'' وہ کنی کترا گئی۔

''کیوں؟ تم تو خدیجہ خالہ کے گھر بہت خوشی خوشی جایا کرتی تھیں۔''

افشاں نے تعجب سے دیکھا۔ وہ کاپی پر پنسل سے آنکھ بنا رہی تھی۔

''انہوں نے گھر کے دروازے بدل لیے ہیں۔ اپنے آپ ہی لاک ہو جاتے ہیں۔''

''ہیں...... ہیں.. یہ کیا بات ہوئی۔ جادو کے دروازے ہیں۔''

''آپی! سچ کہہ رہی ہیں۔'' ثمرین غلط وقت پر ٹپکی۔

''اس دن بھی فرخ بھائی اور آپی کمرے میں بند ہو گئے تھے اور زور زور سے چیخیں مارنے لگے۔'' مجال تھا جو اس نے ایک بار پھر نرمین کی طرف دیکھا ہو۔ نرمین کی چپیڑ نے اس کی بولتی بند کر دی۔

وہ روتی ہوئی کمرے میں بھاگ گئی۔

''یہ ڈیلے باہر گر جائیں گے۔'' نرمین کو افشاں کی پھٹی پھٹی آنکھوں سے کوفت ہوئی۔

''یہ کیا قصہ ہے؟'' افشاں نے ساری کتابیں ایک طرف لپیٹ دیں۔ ''تم دونوں کمرے میں کیسے بند ہو گئے؟''

''دروازہ لاک کس نے کیا تھا؟''

''چلا کیوں رہے تھے؟''

''پھر دروازہ کیسے کھلا؟''

''اور جب تک دروازہ نہیں کھلا تھا.....'' افشاں کے گھر کیبل کنکشن تھا۔ فلمیں دیکھنے پر بھی کوئی پابندی نہ تھی۔ تخیل کی پرواز نجانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔ نرمین نے دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ دبا دیا۔

دونوں چارپائی پر ڈھیر ہو گئیں۔

افشاں خود کو چھڑا رہی تھی۔

نرمین اس کا سانس بھی بند کر دینا چاہتی تھی۔

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

''تیرے منہ سے آواز بھی نکلی تو گلا دبادوں گی۔'' افشاں کے نیچے دبا اپنا دوپٹا کھینچ کر اوڑھتے ہوئے زرمین ، دھمکی دی۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون ہے؟''

''زرمین فاطمہ؟''

''اوئی ماں! اب زرمین فاطمہ کے نام ڈاک بھی آنے لگی۔''

افشاں نے الٹا سیدھا دوپٹا اوڑھا اور بھاگ کر زرمین کے برابر آ کھڑی ہوئی۔ جس نے تجسس اور حیرت سے دروازہ کھول دیا تھا۔

''ابا گھر پر نہیں ہیں۔''

''ابا کا نام زرمین فاطمہ ہے؟'' کمال معصومیت سے دریافت کیا گیا۔

''یہ...... یہ ہے زرمین فاطمہ!'' افشاں نے دانت نکالتے زرمین کی طرف اشارہ کیا۔ جو عقب میں کھڑے شخص اور کندھے پر لٹکتے بیگ کو دیکھ کر نو وارد کو پہچان چکی تھی۔

''آ...... آپ تو وہی ہیں جو زرمین کا بیگ لے کر بھاگے تھے؟''

افشاں کے بے سر و پا الزام پر مراد تلملا کر رہ گیا۔

''میں وہ ہوں جس کا کرشمہ آپ دونوں چوری کرنے والی تھیں۔''

''آ...... آپ پولیس لے کر آئے ہیں۔'' افشاں کے غبارے میں سے ہوا نکل گئی۔

''سچ میں مجھے نہیں...... یہ زرمین کو عادت ہے ایسی حرکتیں کرنے کی۔'' زرمین کا دل چاہا، فضہ جو چھپر کھا کر رہ گئی تھی، وہی رکھ کر افشاں کے دے مارے۔

''معاف کرنا بھائی! ہم تو صرف آپ کا کرشمہ دیکھ رہے تھے۔ مہربانی کر کے میرا بیگ واپس کر دیں۔ ہم آئندہ نہیں کریں گے۔'' زرمین نے سمجھ داری سے قصہ مختصر کرنا چاہا۔ دوپٹا اوڑھے، نظریں چرائے سنجیدگی سے تھی۔ سردیوں کی گلابی شام جیسی لڑکی...... مراد کے پہلو میں کئی برسوں سے پتھر بنا دل پگھلا۔

جذبات کی کہر زدہ ندی میں لہریں اٹھیں۔

زرمین نے جھجکتے ہوئے نگاہ اٹھائی۔

''یہ بولتا کیوں نہیں۔ بیگ دینے آیا تھا تو بیگ دے کر جاتا کیوں نہیں۔''

''نمو! کون ہے؟'' ثمینہ کو ثمرین نے جگا دیا تھا۔ ''تم دونوں دروازے پر کیوں کھڑی ہو؟''

مراد نے آہستہ سے بیگ کندھے سے اتار کر زرمین کی دہلیز پر رکھا اور خاموشی سے چلا گیا۔

بیگ دینے آیا تھا...... اپنا آپ دے کر چلا گیا۔

زرمین معصوم تھی...... کم عمر تھی۔ ابھی ان جذبوں سے انجان تھی۔

ابھی تو ذہن یہ پہیلی بھی بوجھ نہ پایا تھا کہ فرخ کے ساتھ لاک ہونے کے بعد وہ گھبرائی تو گھبرائی کیوں؟

تب ہی خوشی خوشی دہلیز سے اپنا بیگ اٹھایا اور دروازہ بند کر دیا۔

یہ بھی نہ پتا چلا کہ کوئی وہاں اپنا آپ چھوڑ کر گیا تھا۔

☆☆☆

ابو جی نے تو بس تھوڑی تھوڑی مونگ پھلی اور موسمبیاں بچوں میں بانٹی تھیں۔ باقی ریڑھی پر رکھ لیں۔ موسمبیاں تو دو دن میں نکل گئیں، جس سے گھر کا راشن ڈل گیا۔ مونگ پھلیاں روز کے روز بک رہی تھیں۔ وہ ماں

سے خوب ہی لڑی۔ انہیں ظالم بے رحم اور نجانے کیا کیا قرار دے دیا۔
''چپ کر جاؤ۔ خبردار جو ایک لفظ بھی باپ کے خلاف منہ سے نکالا۔ چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں پر کیا اثر پڑے گا۔'' ثمینہ نے اسے لتاڑ دیا۔
''تم لوگوں کی خاطر محنت کر رہے ہیں، نہ سردی دیکھتے ہیں نہ گرمی۔'' ماں کی لتاڑ پر زمین کو چپ لگ گئی۔
''سچ سچ بتاؤ، مونگ پھلی کھانے کو دل کرتا ہے۔''
زمین نے چپکے سے چاروں کو جمع کیا۔
''ہاں، لیکن ابو نے منع کیا ہے۔'' فضہ نے معصومیت آمیز اداسی سے بتایا۔
''تمہیں ابو زیادہ پیارے لگتے ہیں یا مونگ پھلی......'' زمین نے بڑی چالاکی سے گیند بچوں کے کورٹ میں ڈال دی۔
حذیفہ اور طلحہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
سچ بولنا آسان نہیں تھا۔
زمین کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھری۔
تب ہی وہ چاروں کو لے کر چھوٹے سے گودام میں گھس گئی۔ سب کی جھولیاں مونگ پھلی سے بھر گئیں اور زمین کا منہ۔ ایک قطار میں پانچوں گودام سے برآمد ہوئے۔
اور سامنے ابو جی کو دیکھ کر مونگ پھلی کے ساتھ ساتھ ساری خوشی بھی زمین بوس ہوئی تھی۔
چاروں زار زار روتے گھر کی بیرونی دیوار کے ساتھ سزا یافتہ مجرموں کی طرح قطار میں کھڑے تھے۔ زمین نے چھت پر بھاگ کر جان بچائی تھی۔
دروازہ کھلا۔
ابو بڑھئی سمیت گھر سے برآمد ہوئے۔
''خبردار، جو کسی کی آواز نکلی۔ اپنے گھر چوری...... چوروں کی اولاد نہیں ہو...... اب گھر میں نہیں جانا، جب تک میں واپس نہ آؤں۔''
گلی کے نکڑ پر نمودار ہوتے مراد نے بے حد حیرت سے سوچا۔
''وہ دوبارہ اس گلی میں کیا کرنے آیا ہے۔ یہ تو اس کا راستہ نہیں۔''
(''ہم تو صرف آپ کا رکشہ دیکھ رہے تھے، مہربانی کر کے میرا بیگ واپس کر دیں۔ ہم آئندہ نہیں کریں گے۔'')
ساری رات علی بخش ترکھان کے کندھے سے جھانکتی وہ کہہ رہی تھی۔
وہ مسکرایا۔
اور علی بخش ترکھان کی تیوری چڑھ گئی۔ وہ اس کی باتیں نہیں سن رہا تھا۔
ہار کر مراد علی نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔
''ابو جی! آپ جنت میں خوش خوش اپنا آرا چلائیں۔ میں اپنی جنت بسانے جا رہا ہوں۔''
''اپنی جنت بسانے کی خوشی میں باپ کو یادوں سے بھی بے دخل کر رہا ہے۔ ٹھیک ہے پتر! تیری مرضی۔'' وہ ناراض ہو کر گئے تھے یا خوشی خوشی۔ مگر اس رات کمرے میں آرا چلنے کی آواز کی جگہ دھیمی دھیمی سرگوشیوں نے لے لی تھی۔

اے گریہ زار زندگی! کچھ دیر معذرت
میرا بھی دل کیا ہے ذرا مسکراؤں میں

بس اسی ترنگ، اسی لہک میں وہ دوبارہ اس گلی کا مسافر بن گیا۔
"کیا ہوا تم چاروں کو؟"
مراد نے بے حد حیرت سے دیوار کے ساتھ لگے چاروں بچوں کو دیکھا۔
جو اجنبی کو دیکھ کر شرمانے لگے تھے۔
"بتاؤ نا۔ کیوں رو رہے ہو؟" اس نے جھک کر پیار سے پچکارا۔
"نیچے اتر نمو کی بچی۔ باپ کی مار سے بچ گئی، مجھ سے کیسے بچے گی؟"
ثمینہ کی آواز جوش جذبات میں گھر کی دیوار ٹاپ گئی تھی۔
"تو کیا ہو جاتا جو وہ معصوم بھی چار دانے مونگ پھلی کے کھا لیتے۔" آواز چھت پر سے آئی تھی۔ مراد کے ان کھڑے ہوئے۔
"بہن بھائیوں کو چوری کرنا سکھا رہی تھی۔ تیرے تو ٹخنے سینکوں گی۔"
"کون سا پہلی بار ہو گا۔" مراد نے مسکراہٹ دبائی۔
"نرمین باجی کی وجہ سے مار پڑی ہے؟"
بچوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اتنے پیارے بھائی جان نرمین باجی کو جانتے تھے۔
ثمرین کی زبان میں کھجلی ہوئی اور فر فر سب بتا دیا۔
"اوہو۔ ابو جی اتنے سخت ہیں۔" مراد نے دور جاتی ریڑھی کو دیکھا۔
"چوری کرنا بری بات ہے۔" فضہ نے رٹو توتے کی طرح دہرایا۔
"یہ تو سچ ہے۔" مراد نے بردباری سے سر ہلایا۔ "تو پھر ایک کام کرتے ہیں۔ یہ لو پانچ پانچ روپے اور جا کر ابو جی سے مونگ پھلی خرید کر کھاؤ۔ پھر تو ابو جی غصہ نہیں کریں گے۔ آخر انہیں مونگ پھلی بیچنا ہی ہے۔"
بچوں کو یہ آئیڈیا پسند آیا۔ تب ہی پانچ روپے کے سکے ہتھیلیوں میں دبا کر ابو جی کے پیچھے بھاگے۔ مراد نے ثمرین کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"اس کی اپنی آپی کے لیے بھی لے جانا۔"
اس نے دوسرا سکہ اس کی مٹھی میں دبایا اور خود کھسک گیا۔
انور حسین نے بچوں کی ہتھیلیوں پر سکے دیکھے۔
"ماں نے دیے ہیں؟" ایک لمحے کو دل ڈوبا۔ شاید ثمینہ نے اپنی بچت نکالی ہو۔ کس کا دل نہیں چاہتا بچوں کے منہ میں ڈالنے کو۔ مگر صرف کھلانا ہی نہیں تھا۔ تن بھی ڈھانپنا تھا۔ علاج معالجہ بھی کروانا تھا۔
چاروں نے باجماعت نفی میں سر ہلایا۔
"کس سے لیے ہیں؟"
بچوں نے فرشتے کی تلاش میں نگاہ دوڑائی۔
مگر فرشتے نظر کہاں آتے ہیں؟
ایک دھواں گرما گرم مونگ پھلی سے اٹھ رہا تھا۔ دوسرا ابو جی کے کانوں سے......
پہلی مار گھر کے اندر پڑی تھی، دوسری بیچ گلی میں......
وہ زار و قطار روتے گھر کی طرف بھاگے۔
"پہلی بار مونگ پھلی چرائی، پھر پیسے۔ اگلی بار یہ شتونگڑے ڈاکا ڈالنے جائیں گے۔" ابو جی کا غصہ کسی صورت ٹھنڈا نہ ہوتا تھا۔

''ابو جی! چرائے نہیں تھے۔ میں نے جمع کیے تھے، وہی دیے تھے۔'' زرمین نے ڈرتے ڈرتے بچوں کی جان چھڑائی۔ گویا گناہوں میں ایک اور جھوٹ کا اضافہ کیا۔

''تجھے کیا تکلیف تھی۔ میں ان کا باپ ہوں یا دشمن؟''

ابو جی نے غصے میں آج ریڑھی بھی نہیں لگائی تھی، ویسے ہی واپس آ گئے تھے۔

''سارے سیاپے تم لوگوں کے لیے ہی کر رہا ہوں۔''

زرمین نے پوری سنجیدگی سے سر اٹھا کر باپ کو دیکھا۔

''یہ بچے ہیں ابو جی! انہیں ان سیاپوں کا نہیں پتا۔ ان کا دل چاہتا ہے اچھی چیزیں کھانے کو۔ اپنی آنکھوں کے سامنے سب کچھ دیکھ کر کیسے صبر کریں۔''

''نمو!'' ثمینہ نے غصے سے ٹوکا۔

''یہ بڑے نہیں ہیں ابو جی! انہیں اپنی غربت کی سمجھ نہیں ہے اور نہ آپ کی مار انہیں سمجھا سکے گی۔'' وہ غصے سے کہہ کر بچوں کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

انور حسین گنگ سا اپنی بیوی کو دیکھنے لگا۔

''بچی ہے، جذبات میں بول گئی۔''

''ثمینہ! کیا میں اپنے بچوں پر ظلم کر رہا ہوں؟''

''ہرگز نہیں۔ آپ تو اپنی جان پر ظلم کر رہے ہیں۔ نہ دن کا چین، نہ راتوں کا آرام۔'' ثمینہ تڑپ کر اپنے شوہر کے پاس بیٹھی۔ ''وہ بھی جلدی سمجھ جائیں گے۔''

''زرمین کی زبان...... وہ اتنی بڑی ہو گئی ہے؟''

''بڑی تو ہونا ہی تھا۔'' ثمینہ کی سمجھ میں نہ آیا۔

''مطلب...... لڑکیاں اتنی بڑی ہو گئی ہیں۔'' انہوں نے بے حد حیرت سے خود کلامی کی اور منہ پر صافہ ڈال کر لیٹ گئے۔

''کیا ہوا؟''

''سونے دو۔'' حد درجہ روکھا لہجہ۔

ثمینہ چپ ہو گئی۔

''سچ سچ بتاؤ...... پیسے کس نے دیے۔ ورنہ ابو سے زیادہ ہڈیاں سینکوں گی۔'' وہ ہٹلر بنی، فضہ اور ثمرین سے پوچھ رہی تھی۔

''ہمیں کیا پتا۔ ہم تو رو رہے تھے۔'' فضہ نے معصومیت سے جواب دیا۔

''روتے ہوئے سکہ نظر آ گیا، دینے والے کا منہ نہیں۔'' زرمین نے فضہ کا کان کھینچا۔

''انہوں نے پانچ روپے آپ کے لیے بھی دیے تھے۔'' ثمرین نے بھانڈا پھوڑا۔

''میرے لیے؟''

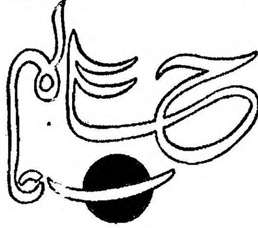
''انہوں نے کہا، اپنی باجی زرمین کے لیے بھی لے جانا۔ وہ آپ کو جانتے تھے باجی!''

''کون باجی کو جانتا ہے؟''

ماں کی آواز پر زرمین چپ کی چپ رہ گئی۔ اعصاب سُن سے ہو گئے۔

ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ

نمرہ احمد



۳۵

پینتیسویں قسط

جولیانہ نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

''آپ میرے ڈیڈ سے کیوں نہیں کہتیں کہ وہ آپ کی مدد کریں۔ مجھے امی نے بتایا ہے کہ اس کے بابا پھر سے آپ لوگوں کو ہراس کرنے لگے ہیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے' جولی۔'' اس نے نرمی سے اس کا سر تھپکا۔ ''میں کوئی کمزور عورت تھوڑی ہوں جو ڈر جاؤں گی؟ وہ زمین کے کوئی ایسے کاغذات مانگتا ہے جو میرے پاس نہیں ہیں۔ میں اسے اگنور کروں گی۔ خود ہی پیچھا چھوڑ دے گا۔''

''تو پھر چھ ماہ سے کیوں نہیں چھوڑا؟''

''میں ہینڈل کرلوں گی۔ سنگل مدرز میں بہت طاقت ہوتی ہے' جولی۔'' وہ مسکرا کے اسے سمجھانے لگی۔ ''بلکہ ساری ماؤں میں ہوتی ہے۔ اور میں نہیں چاہتی کہ تم سے تعلق کی وجہ سے تمہارے خاندان سے کوئی فیور لوں۔ یہ اخلاقی لحاظ سے اچھی بات نہیں ہے۔''

''ساری مائیں ایک جیسی ہوتی ہیں؟'' جولیانہ نے آزردگی سے اسے دیکھا۔ عیشا نے مسکراتے ہوئے سر جھکایا اور ایک صفحے پہ کچھ انڈر لائن کرنے لگی۔ وہ دونوں ڈائننگ ہال میں اب تنہا رہ گئی تھیں۔

''کیا ساری مائیں بہادر ہوتی ہیں؟'' وہ آہستہ سے بولی تو عیشا نے چونک کے اسے دیکھا۔



پھر اس کے چہرے پہ فکرمندی پھیلی۔

''اوہ سویٹی.... کوئی کتنا بھی مضبوط ہو اسے نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔ تمہاری ماما بھی اسی کا شکار ہوئی تھیں۔ مت سوچو اس بارے میں۔''

جولیانہ نے پلکیں جھپکتے ہوئے اسے دیکھا۔ آواز مزید دھیمی کی۔

''آپ کو کیا لگتا ہے تالیہ مراد نے میری ماما کو مارا ہوگا؟''

ییشا نے گہری سانس لی۔ آج وہ شہد رنگ بالوں کو جوڑے میں باندھے ہوئے تھی اور ایک گھنگھریالی لٹ گال پہ جھول رہی تھی۔

''سویٹی..... ہمیں نہیں معلوم کس کی کیا اسٹوری ہے۔ جس نے بھی ایسا کیا ہے اس کو سزا ضرور ملے گی۔ اور تم فکر نہ کرو۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تمہارے ڈیڈ ہیں نا تمہاری حفاظت کے لیے۔'' وہ اسے پیار سے سمجھا رہی تھی۔ اسے واقعی یہ لگا تھا کہ جولیانہ ایک ''قاتل'' کے واپس آنے پہ خوف زدہ ہے۔ مگر جولیانہ نے لب کاٹے اور چہرہ اس کے قریب کیا۔ پھر سرگوشی میں بولی۔

''کیا میں آپ کو ایک سیکرٹ بتا سکتی ہوں؟''

ییشا دم سادھے رہ گئی۔ کچھ تھا اس کے انداز میں جو اسے چونکا گیا تھا۔

''تالیہ نے میری ماما کو نہیں مارا تھا۔''

ییشا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ ''تمہیں کیسے پتا؟''

''دو سال پہلے.... جب مجھے ان چیزوں کی بہتر سمجھ آنے لگی.... تو میں نے ماما کی کیس فائلز پڑھنا شروع کیں۔ پولیس رپورٹ کے مطابق زہر کیک کی آئسنگ میں تھا۔ یعنی اس پہ چھڑکا گیا تھا۔''

''جولی....! تم ان باتوں میں نہ الجھو۔ عدالت.....''

''آپ مجھے کیا سمجھتی ہیں؟ میں مرڈر مسٹریز دیکھتی ہوں۔ مجھے ان سب باتوں کی سمجھ میں آتی ہے۔ میری بات سنیں۔ مجھے ڈیڈ کی طرح خاموش نہ کرائیں۔ وہ کیک بے شک تالیہ بھیجتی تھی، ماما بھی کہتی تھیں۔ لیکن مجھے یاد ہے۔ وہ چاکلیٹ کیکس تھے۔ ان پہ آئسنگ نہیں ہوتی تھی۔ میں نے دو دفعہ خود ... وصول کرتے دیکھا تھا ماما کو۔ لیکن بعد میں جب ماما کیک فریج میں رکھ دیتی تھیں ڈیڈ کے لیے.... تو ان پہ آئسنگ ہوتی تھی۔'' اس کی گلابی پڑتی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''مجھے نہیں پتا وہ آئسنگ کون چھڑکتا تھا لیکن اگر زہر آئسنگ میں تھا تو وہ تالیہ نے نہیں چھڑکا تھا۔''

ییشا دھک سے رہ گئی۔ بالکل گنگ اور ششدر۔

''اس وقت شاید مجھے اتنی سمجھ نہیں تھی۔ لیکن جب میرے ذہن نے کڑیاں جوڑیں تو مجھے سب کچھ پھر سے یاد آنے لگا۔ میں نے ڈیڈ کو بتایا تھا۔''

''انہوں نے کیا کہا؟''

''انہوں نے مجھے چپ رہنے کو کہا۔ وہ شاید پہلے سے جانتے تھے سب۔''

''یعنی.... تالیہ نے یہ قتل نہیں کیا تھا؟'' وہ گنگ رہ گئی۔ ''اوہ گاڈ.... اور تمہارے ڈیڈ نے کچھ نہیں کیا۔ وہ لڑکی چھ سال تک پولیس سے اس جرم کی وجہ سے چھپتی رہی جو اس نے کیا ہی نہیں تھا؟'' اس نے ماتھے کو چھوا۔ ''اوہ بے چاری تالیہ۔'' پھر اس نے جولیانہ کا چہرہ دیکھا تو فوراً خود کو سنبھالا۔

''دیکھو جو ہو گیا' سو ہو گیا۔ یہ وقت ان باتوں پہ غور کرنے کا نہیں ہے۔ تم ایگزام دے کر آؤ پھر ہم بات کریں گے۔ ٹھیک ہے؟'' نرمی سے اسے پچکارتے ہوئے بولی۔ البتہ اس کی آنکھوں میں واضح اضطراب نظر آتا تھا۔ جولیانہ نے اداسی سے کتاب پہ سر جھکا دیا۔ ییشا کا ایک ہاتھ ابھی تک سینے پہ تھا۔ یہ سب کچھ نہایت غیر متوقع تھا۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟

☆☆☆

احمد نظام کا آفس بہت بڑا نہ تھا۔ اس میں فائلوں اور کتابوں کے ڈھیر لگے تھے۔ آفس کی حالت کو دیکھ کے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک ہائی

پروفائل کیس لینے میں کیوں دلچسپی رکھتے تھے۔

اس وقت وہاں کافی کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ تین بھاپ اڑاتے کپ میز پہ رکھے تھے۔ ایک طرف احمد نظام خود بیٹھے تھے اور ان کے سامنے تالیہ اور ایڈم کرسیوں پہ براجمان تھے۔ آج وہ سفید اور سیاہ اسکرٹ بلاؤز میں ملبوس تھی۔ ماتھے پہ بینڈ تج تھی اور گال کے زخم پہ مرہم لگا تھا۔ آنکھ کا نیل میک اپ سے ہلکا کر رکھا تھا۔

''آپ کو یہ چوٹ کیسے آئی؟'' ایڈم نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے اس کے ماتھے کی طرف اشارہ کیا۔

اس سوال پہ تالیہ نے براماں کے اسے دیکھا۔

''آپ بات بدل رہے ہیں۔ میں کہہ رہی ہوں کہ عصرہ نے یہ خود اپنے ساتھ کیا تھا۔''

''اور میں کہہ رہا ہوں کہ کوئی اس پہ یقین نہیں کرے گا۔ اگر آپ یہ بات لوگوں کے سامنے دہرائی رہیں گی تو آپ ولن لگیں گی۔ عوام بالخصوص عصرہ کے بچے آپ کو معاف نہیں کریں گے۔'' وہ تبصرہ کرنے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''عصرہ کے بچے۔'' وہ خاموش ہوگئی۔ ان کو وہ فراموش کر گئی تھی۔ وہ اس سارے معاملے کے معصوم ترین متاثرین تھے۔ ''اوکے۔ میں کسی کو نہیں کہوں گی۔ مگر میں آپ کے سامنے تو کہہ سکتی ہوں نا؟''

''ٹھیک ہے تالیہ۔'' احمد نظام نے مداخلت کی۔ ''مان لیا کہ عصرہ نے خودکشی کی تھی۔ لیکن ہمیں یہ بات ثابت کرنی پڑے گی۔''

''میرے پاس ایلی بائی ہے۔ جب کیک آنا شروع ہوئے تو میں مصر میں تھی۔''

''کیک آپ کے کریڈٹ کارڈ سے آرڈر کیے گئے تھے۔ آپ یہ کام دنیا میں کہیں سے بھی بیٹھ کے کرسکتی ہیں۔'' ایڈم نے گھونٹ بھرتے ہوئے پھر سے تبصرہ کیا۔ وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا ساتھ ہی اپنے فون سے بھی کھیل رہا تھا۔

''اور میں مصر میں بیٹھ کے کیک میں زہر کیسے ملا سکتی ہوں؟''

''چھ سال پہلے اگر آپ فرار نہ ہوتیں تو یہ بات ثابت کرنا آسان تھا۔'' احمد نظام نے مداخلت کی۔

''میں فرار تھوڑی ہوئی تھی۔ میں اغوا ہوئی تھی۔'' بالوں کو جھٹکا دیا اور کندھے اچکائے۔

ایڈم زور سے ہنسا۔ پھر چہرہ سنجیدہ بنایا اور موبائل پہ بٹن دبانے لگا۔ تالیہ نے براماں کے اسے دیکھا۔

''اس میں اتنا فنی کیا ہے؟''

''مس مراد... آپ کی اغوا والی کہانی بہت کمزور ہے۔ آپ تھوڑا وقت صرف کر کے اس سے بہتر کہانی بنا سکتی تھیں۔''

''آپ تھوڑا وقت صرف کر کے میرے سوال کا جواب دیں۔ میں مصر میں بیٹھ کے کیسے کیک میں زہر ملا سکتی ہوں؟''

''عصرہ کی موت والے دن آپ کے ایل میں تھیں۔ اس سے پہلے جو کیکس آپ نے بھیجے... ان میں زہر...'' ایڈم نے رک کے سوچا.... ''یقیناً آپ کا کوئی ساتھی ملاتا ہوگا۔ استغاثہ یہی نکتہ لائے گا۔''

تالیہ نے کپ نیچے رکھا اور تیزی سے بولی۔

''اور یہی میں کہہ رہی ہوں۔ عصرہ کا کوئی ساتھی ضرور ہوگا۔''

''کوئی ایسا ساتھی جس نے آپ کا کارڈ نمبر حاصل کرلیا ہوگا۔'' ایڈم بھی ایک دم موبائل رکھ کے سیدھا ہو بیٹھا۔ ''اس نے ہی بیکری پہ آرڈر دیا ہوگا۔ اس نے ہی عصرہ کو آرسینک لا کر دیا ہوگا۔ عصرہ اسے کیک پہ خود چھڑکتی ہوں گی۔'' وہ قدرے جوش سے کہہ رہا تھا۔ ''کہانی اچھی جارہی ہے۔ بھلے سچ ہو یا نہ ہو۔''

''مسئلہ یہ ہے کہ....'' احمد نظام کھنکھارے۔ ''وہ بیکری اب بند ہوچکی ہے۔ مگر اس زمانے میں تفتیش کے دوران جو آئی پی لوکیشن ملی تھی جہاں سے تالیہ کا کارڈ استعمال کیا گیا تھا وہ پراکسی لوکیشن تھی۔ یعنی یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ وہ لوکیشن ملائیشیا کی تھی یا

باہر کے کسی ملک کی۔‘‘

’’اور کسی نے اس پراکسی کو بے نقاب کرنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔‘‘ ایڈم مسکرا کے بولا۔ ’’مجھے اس آئی پی کی تفصیلات دیں۔ میں ایک سائبر انویسٹی گیشن ایجنسی سے بات کرتا ہوں۔ وہ شاید اصل لوکیشن کو ٹریس کر سکیں۔‘‘

’’یعنی جس شخص نے میرا کارڈ استعمال کیا ہے اس کی لوکیشن معلوم ہو سکے گی؟‘‘ پھر اس کا چہرہ بجھا۔ ’’کیا معلوم اب وہ وہاں رہتا ہی نہ ہو۔ چھ سال میں تو دنیا بدل جاتی ہے۔ اور کیا پتا اس نے یہ کام کسی انٹرنیٹ کیفے سے کیا ہوگا۔ عصرہ نے اتنا کچا کام نہیں کیا ہوگا۔‘‘ وہ نفی میں سر ہلاتی کہہ رہی تھی۔ ایڈم نے غور سے اسے دیکھا۔

’’آپ کو کیوں لگتا ہے کہ عصرہ نے ایسا کیا تھا؟ کیا ان کی کسی بات سے آپ کو لگا؟‘‘

وہ رکی اور گھور کے اسے دیکھا۔ ’’کاش کہ آپ کو کچھ یاد ہوتا۔ خیر۔ عصرہ اور میرے تعلقات اس وقت تک بہت خراب ہو چکے تھے۔ اس لیے بعد میں مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کام عصرہ کا ہی ہے۔‘‘

’’کب؟ آپ کے عصرہ سے تعلقات کب خراب ہوئے تھے؟‘‘

’’قتل سے دو ایک ماہ پہلے سے۔‘‘

’’ایک منٹ۔ کیک کب سے آنے لگے تھے؟‘‘ ایڈم نے ایک فائل اٹھائی اور تاریخ پڑھی۔ ’’کیک بھیجنے سے پہلے کسی دن کچھ ہوا ہوگا جو عصرہ نے اتنا بڑا فیصلہ کیا۔ آپ کو اپنا اور ان کا کوئی شدید جھگڑا یاد ہے، جس کے بعد انہیں زندگی اور آپ دونوں سے نفرت محسوس ہوئی ہو؟‘‘

’’پارٹی.... ایک پارٹی میں....‘‘ تالیہ نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔ ’’جب میں نے عصرہ کو بتایا تھا کہ وہ فاتح کی پہلی....‘‘ اس نے اگلے الفاظ دبا لیے۔ مگر اسے یاد آ چکا تھا۔ وہ آتش بازی والی پارٹی جب عصرہ نے ان دونوں کو ساتھ دیکھا تھا۔

’’تاریخ یاد ہے آپ کو؟ چھ سال گزر چکے ہیں اس لیے.....‘‘

’’اوہ۔ میرے لیے وہ تین ماہ پہلے کی بات ہے، ایڈم صاحب۔‘‘ اس نے موبائل اٹھایا اور تیزی سے بٹن دبانے لگی۔ پھر اسکرین اس کے سامنے کی۔ ’’یہ میرا اس وقت کا ٹوئٹر اکاؤنٹ ہے۔ میں نے اس شادی کی تصویر ٹوئٹ کی تھی۔‘‘

ایڈم نے جھک کے تاریخ پڑھی۔ ’’یہ کیک آنے سے ایک ہفتہ پہلے کی تاریخ ہے۔‘‘

’’اس سے کیا ثابت ہوتا ہے ایڈم صاحب؟‘‘ احمد نظام نے غور سے اسے دیکھا۔

’’اس پارٹی سے لے کر.... پہلے کیک کے آنے تک۔ عصرہ محمود نے کیا کیا تھا، ہمیں عصرہ کے ہر اسٹیپ کو ری ٹریس کرنا ہے۔ ان کے کریڈٹ کارڈ کا بل۔ بینک اکاؤنٹ ڈیٹیلز.... فون ریکارڈ.... آپ کو وہ سب نکلوانا ہوگا۔ اگر عصرہ نے خودکشی کی تھی... اگر.... (زور دیا) تو اس کا پلان انہوں نے انہی سات دنوں میں بنایا ہوگا۔‘‘

’’اور اگر عصرہ نے کیش ادا کیا ہو؟ اگر انہوں نے کسی دوسرے نمبر سے بات کی ہو؟ اگر....‘‘ تالیہ کے تاثرات دیکھ کے وہ خاموش ہوئے اور سر ہلایا۔ ’’میں ریکارڈ نکلواتا ہوں۔‘‘ وہ فون اٹھا کے باہر نکل گئے۔

آفس میں خاموشی چھا گئی۔ پھر ایڈم کھنکھارا اور قدرے بے نیازی سے بولا۔ ’’مس مراد.... یہ سب اس پہ منحصر ہے کہ عصرہ نے خودکشی کی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہم آپ کی مدد نہیں کر سکیں گے۔‘‘

تالیہ نے چہرہ موڑ کے اسے دیکھا۔ ’’آپ کی رائٹنگ کیسی جا رہی ہے؟‘‘

وہ اس سوال پہ حیران ہوا۔ ’’بہت اچھی۔ کیوں؟‘‘

’’آپ نے کافی عرصے سے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ آپ نئی کتاب کے بارے میں معلومات بھی نہیں دے رہے۔ فینز سمجھ رہے ہیں کہ آپ سرپرائز دیں گے لیکن جس خوشی سے آپ نے تالیہ مراد کی

کتاب لکھنے کی خبر کو عام کیا ہے..... مجھے لگتا ہے آپ رائٹرز بلاک کا شکار ہیں۔ آپ کوئی دوسری کتاب لکھ ہی نہیں رہے تھے۔"

"یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔" اس نے پہلو بدلا۔ ایک دم وہ بالکل سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"یعنی آپ مان رہے ہیں کہ آپ کو کوئی مسئلہ لاحق ہے؟" وہ کرسی کا رخ اس کی طرف موڑے ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی اس کی آنکھوں میں جھانک کے کہہ رہی تھی۔ ایڈم نے پتلیاں سکوڑ کے اسے دیکھا۔

"مس مراد..... کتنا اچھا ہو ہم ایک دوسرے کی ذاتی زندگیوں میں مداخلت نہ کریں۔ میں انسپریشن سے لکھتا ہوں اور..."

"آپ ناول کیوں نہیں لکھتے؟"

ایڈم بولتے بولتے رکا۔ "میں فکشن رائٹر نہیں ہوں۔"

"آپ کا ذہن ایک ہی طرح کی سیاسی چیزیں لکھ کے بور ہو چکا ہے۔ آپ کو چینج چاہیے۔"

وہ چپ ہو گیا۔ پھر قدرے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "میرا نہیں خیال کہ میں اچھا فکشن لکھ سکتا ہوں۔"

"تو برا فکشن لکھ لیں۔ کم از کم قلم کی رکاوٹ تو ختم ہو گی۔"

"اچھا؟ اور کس موضوع پہ مجھے لکھنا چاہیے۔ یہ بھی بتا دیں۔" انداز میں ہلکا سا طنز تھا۔

"اپنے اردگرد سے انسپریشن ڈھونڈیں۔ آپ کی والدہ ایک زمانے میں چوزے رکھتی تھیں۔"

"اب بھی رکھتی ہیں۔"

"ہاں مگر وہ تمام عرصہ جس میں، میں آپ کی زندگی کا حصہ تھی، چوزوں کا ایک گروہ ان کے پاس تھا۔ وہ میرے سامنے بڑا ہوا اور پھر میری ہی وجہ سے وہ کھو گیا۔ آپ کی والدہ کو اس بات کا شدید صدمہ ہوا تھا۔ آپ ان کی زندگی پہ بھی کتاب لکھ سکتے ہیں۔"

"ہمارے چوزے آپ کی وجہ سے کھوئے تھے؟ انٹرسٹنگ۔" وہ محظوظ انداز میں مسکرایا۔ "سوچوں گا۔"

"کسی کام کو کرنے کا بہترین وقت 'ابھی' ہوتا ہے ایڈم صاحب۔ یہ وقت کے تین سوالوں میں سے ایک کا جواب ہے۔ اگر آپ ابھی فیصلہ کر لیں تو کیا معلوم کوئی معجزہ ہو جائے۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً آپ کو آپ کی کھوئی ہوئی یادداشت واپس مل جائے۔" وہ پراسرار انداز میں مسکرائی۔

"آپ کی جڑی بوٹیوں والی کہانی اغوا والی کہانی سے بہتر تھی۔" وہ جھرجھری لے کر پھر سے اپنے فون کو دیکھنے لگا۔ وہ پہلے والے ایڈم جیسا نہیں تھا۔ ہر وقت مصروف.. فون اور کام میں لگا.... بے نیاز سا سلیبریٹی....

"میشا تاج کی نمائش کب ہے؟ یاد ہے آپ نے مجھے وہاں لے کر جانا تھا۔"

ایڈم کے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔ "اب کیوں؟ آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ آپ کی پی ایم سے ملاقات طے ہو گئی ہے۔"

"تالیہ کے پلانز ہیں۔ تالیہ کی مرضی۔" اس نے کندھے اچکائے اور اپنا موبائل اٹھا لیا۔ ایڈم الجھ کے اسے دیکھنے لگا۔

"میں نے آپ کو اتنا عرصہ ماضی میں برداشت کیسے کیا تھا؟" وہ جل کے بولا تو وہ مبہم سا مسکرا دی۔ نظریں اسکرین پہ تھیں۔ اور انگلیاں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔

☆☆☆

سری پردھانہ کے سب سے بارسوخ دفتر کے بھوری لکڑی سے بنے دروازے کافی اونچے تھے۔ میشا ان کے سامنے کھڑی انہیں گردن اٹھائے مسحور سی ہو کے دیکھ رہی تھی جب پیچھے سے پرنسپل سیکرٹری کھنکھارا۔ وہ چونک کے مڑی۔

"اب آپ اندر جا سکتی ہیں۔ لیکن آپ کے پاس وقت کم ہو گا۔ انہوں نے بہت مشکل سے آپ

کے لیے وقت نکالا ہے۔" وہ انٹر کام کان سے لگائے کہہ رہا تھا۔ ابرو سے آگے جانے کا اشارہ کیا۔ میشا نے کوٹ کی نادیدہ شکنیں درست کیں' بالوں پہ ہاتھ پھیرا اور ہینڈل دبا کے دروازہ دھکیلا۔

فاتح اپنی کرسی پہ براجمان تھا۔ چند فائلز اور لیپ ٹاپ سامنے کھلا رکھا تھا۔ وہ منتظر سا اس کو دیکھ رہا تھا۔

"آیئے مسز میشا۔" اس کو آتے دیکھ کے وہ احتراماً کرسی سے اٹھا۔ "آپ کے ٹیکسٹ نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ آپ اتنی ایمر جنسی میں ملنا چاہتی تھیں۔ خیریت؟ کیا جولیانہ ٹھیک ہے؟"

"جی وہ ٹھیک ہے۔" وہ بیٹھ گئی تو فاتح نے انگلیاں باہم پھنسائے آگے کو جھک کے اسے فکر مندی سے دیکھا۔

"پھر؟"

"میں نے جولیانہ سے آپ کا نمبر یہ کہہ کے مانگا تھا کہ میں ایک ذاتی کام کے سلسلے میں ملنا چاہتی ہوں۔ لیکن دراصل میں جولیانہ کے لیے ملنا چاہتی ہوں۔ آپ کے پاس میرے لیے کتنا وقت ہے؟"

فاتح نے کسی لحاظ اور مروت کے بغیر کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ "چھ منٹ۔"

"پھر میں مدعے پہ آتی ہوں' دا تو سری۔" وہ جی کڑا کے بولی۔ ہلکے میک اپ سے مزین چہرہ فکر مند لگتا تھا۔

"جولیانہ نے مجھے بتایا ہے کہ جن کیکس سے مسز عصرہ کی موت واقع ہوئی تھی' ان پہ کسی قسم کی آئسنگ نہیں ہوتی تھی۔ آخری کیک جو پولیس کے ہاتھ لگا تھا اس پہ آرسینک کی آئسنگ تھی لیکن جو کیک تالیہ بھیجتی تھی وہ سادہ چاکلیٹ کیک ہوتے تھے۔ جولی نے خود ان کو دو تین دفعہ آتے دیکھا تھا۔ میں شرلاک ہومز نہیں بننا چاہ رہی' لیکن..." وہ فکر مندی سے کہہ رہی تھی۔ "اس کا مطلب ہے کہ تالیہ مراد کے بھیجے کیکس زہر سے پاک تھے۔"

فاتح پیچھے کو ہو کے بیٹھا اور پتلیاں سکوڑے غور سے اسے دیکھے گیا۔

"جولیانہ پہ اس بات کا بہت بوجھ ہے۔ میں صرف یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اگر جولی نے یہ بات آپ کو بتائی تھی تو آپ یہ بات پراسیکیوٹر کو بتا سکتے تھے۔ جولیانہ کا بیان تالیہ مراد کو بری کرنے کے لیے کافی تھا۔ پھر آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ وہ بے گناہ لڑکی اتنے سال پولیس سے چھپتی رہی۔ اس کی تو زندگی برباد ہو گئی۔"

فاتح نے انٹر کام اٹھایا اور بولا۔ "مجھے دس منٹ مزید لگ جائیں گے۔ میٹنگ میں شامل افراد سے کہو کہ وہ میرا انتظار کریں۔" پھر ریسیور رکھا اور اس کو اسی سنجیدگی سے دیکھ کے بولا۔ "آپ نے vampire disease کا نام سنا ہے' مسز میشا؟"

وہ اس غیر متوقع سوال پہ ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ "نہیں سر۔"

"یہ بیماری جن لوگوں کو لاحق ہوتی ہے وہ شدید فوٹو سینسیٹیو ہوتے ہیں۔ روشنی ان کے لیے خطرناک ہوتی ہے۔ وہ دن میں باہر نہیں نکلتے۔ اندھیروں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ اگر دھوپ یا روشنی ان پہ پڑ جائے تو ان کی جلد جلنے لگتی ہے۔ جیسے غیر مرئی کہانیوں میں ویمپائرز ہوا کرتے تھے۔ ایسے ہی کچھ انسان روشنی سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ جولیانہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ وہ اندھیروں میں رہنے کی عادی ہے۔ میں اس کو دھوپ میں کیسے کھڑا کر سکتا ہوں۔"

وہ دم سادھے سن رہی تھی۔ اور وہ کہے جا رہا تھا۔

"اس نے مجھے یہ بات قریباً دو سال پہلے بتائی تھی۔ اگر میں اسے پراسیکیوشن کے سامنے لے جاؤں' تو رپورٹرز میری بچی کا میڈیا ٹرائل کریں گے۔ وہ ایک چودہ سالہ بچی کو گواہی چھپانے کے لیے زدوکوب کریں گے۔ وہ ہر جگہ اس کا نام لیں گے۔ اس کو ملزم ٹھہرائیں گے۔ صرف میں جانتا ہوں کہ

جولیانہ عصرہ کی موت کے بعد کتنی مشکل سے زندگی کی طرف لوٹی ہے۔ وہ اینٹی سوشل بلکہ سوشیو پیتھ بن چکی تھی۔ آپ بھی واقف ہیں اس بات سے کہ وہ ابھی تک کتنی کم اعتماد اور ڈری سہمی لڑکی ہے۔ میں اس کا باپ ہوں۔ مجھے اس کی حفاظت کرنی ہے۔"

"آئی ایم سوری۔ میں نے اس زاویے سے نہیں سوچا تھا۔"

"میں اسے آپ سے زیادہ جانتا ہوں' مسز یشا۔ وہ اس معاملے کو نہیں ہینڈل کر سکے گی۔ اور اس کی گواہی تالیہ کو بری نہیں کروا سکتی کیونکہ جو کیک پولیس کے ہاتھ لگا تھا اس میں آرسینک تھا۔ اور وہ تالیہ کے نام سے ہی بھیجا گیا تھا۔"

"آپ کی ساری باتیں درست ہیں۔ لیکن تالیہ مراد کا کیا؟ وہ بے چاری تو بے قصور تھی۔" وہ دکھ سے کہہ رہی تھی۔

"آپ تالیہ کو نہیں جانتیں۔ میں جانتا ہوں۔ تالیہ اپنا خیال خود رکھ سکتی ہے۔ اس نے یہ جرم نہیں کیا تھا۔ میں نے تب بھی اس سے کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ اس میس سے نکل آئے گی۔ وہ تالیہ ہے۔ وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کر لے گی۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی فوراً سے اٹھی۔

"آپ کا دوسرا کام کیا تھا؟"

"وہ.... کچھ نہیں۔ میرا ایکس ہزبینڈ...." اس نے سر جھٹکا۔

"میرے پی ایس کے پاس ایک تحریری درخواست چھوڑ جائیں۔ وہ آپ کا مسئلہ حل کروا دے گا۔" اس نے کوٹ پہنتے ہوئے تاکید کی تو یشا نے سر نفی میں ہلایا۔

"نہیں سر۔ مجھے شکایت نہیں کرنی۔ وہ میری بیٹی کا باپ ہے اور میں اپنی بیٹی کو ہرٹ نہیں کر سکتی۔ آپ یہ بات مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ میں نمائش پہ آپ کا انتظار کروں گی۔" پھر سر جھکا کے تعظیم پیش کی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی تین چار افراد اندر آ گئے۔ یشا نے مڑ کے دیکھا۔ اب وہ ان افراد سے بات کرتا ہوا باہر آ رہا تھا۔ اس آدمی کے پاس ضائع کرنے کے لیے ایک منٹ بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

سرما کی دھوپ سارے بازار پہ پھیلی تھی۔ صاف ستھری سی سڑک کے دونوں اطراف دکانوں کی قطاریں تھیں اور ان کے آگے چھجے ڈال کے کرسیاں میزیں بچھائی گئی تھیں۔ فرانسیسی طرز کا یہ بازار مختلف رنگوں کے پھولوں سے مزین تھا۔

وہ ٹیکسی سے اتری اور سن گلاسز ماتھے کے اوپر چڑھائے۔ سیاہ شیشے آنکھوں کے سامنے سے ہٹے تو بازار کے خوشنما پھولوں کے قدرتی رنگ دکھائی دینے لگے۔ فضا اتنی معطر تھی کہ تالیہ کے اندر تک تازگی اتر تی گئی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس اندر کھینچی۔ پھر احساس ہوا کہ کوئی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا' وہ ایڈم تھا۔

سفید شرٹ پہ سیاہ کوٹ پہنے' وہ سن گلاسز لگائے ہوئے تھا۔ اسے دیکھ کے گلاسز اتارے اور کلائی پہ بندھی گھڑی اسے دکھائی۔ "آپ مقررہ وقت سے پندرہ منٹ لیٹ ہیں' مس مراد۔"

"تو کیا ہوا؟ وقت مجھ پہ ویسے ہی مہربان ہے۔" وہ مسکرا کے کہتی آگے بڑھ گئی۔ اس نے سرخ و سفید پھول دار لمبی فراک پہن رکھی تھی۔ کندھے سے سنہری چین والا پرس لٹک رہا تھا اور سر پہ سفید ہیٹ ترچھا کر کے رکھا تھا۔ وہ پھولوں کے بازار میں کسی سرخ سفید پھول کی مانند دکھ رہی تھی۔

"تو میرا کریڈٹ کارڈ یہاں سے استعمال کیا گیا تھا؟" دونوں اسٹریٹ کے کنارے ساتھ ساتھ چلنے لگے تو تالیہ نے پوچھا۔

"میرے انویسٹی گیٹر نے اس پراکسی سرور کو ان مارک کر لیا ہے۔ آپ کا کارڈ چھ جگہوں سے استعمال کیا گیا تھا۔ میں پانچ جگہوں کا دورہ کر چکا

ہوں۔سوائے اس آخری جگہ کے۔" وہ چلتے ہوئے بتا رہا تھا۔

"وہ جو بھی تھا' کسی کافی شاپ میں بیٹھ کے آپ کے کارڈ کے ذریعے کیک آرڈر کرتا تھا۔دو جگہوں پہ کافی شاپس آج بھی موجود تھیں۔تین جگہوں پہ کسی زمانے میں کافی شاپس ہوا کرتی تھیں۔ اب وہاں کوئی اور دکان ہے یا کوئی ریستوران۔مختصر یہ کہ کسی کے پاس چھ سال پرانے سی سی ٹی وی ریکارڈز نہیں تھے۔نہ مجھے کوئی ایک ایسا شخص ملا جو چھ سال سے وہاں کام کر رہا ہو۔"

"یعنی ہمارے ہاتھ کوئی سرا نہیں آیا؟"

"نہیں۔آخری جگہ ٹرائی کر لیتے ہیں۔سامنے والی ان شاپس میں سے کوئی ایک شاپ ہے جہاں ہمیں جانا ہے۔"

وہاں ایک کافی شاپ وسط میں نظر آ رہی تھی۔ان کے قدم اسی جانب اٹھنے لگے۔

"کیا کوئی ایسی چیز ہے جو ان شاپس میں مشترک ہو؟"

"نہیں۔تمام شاپس مختلف ناموں اور برانڈز کی تھیں۔" وہ قدرے مایوس لگتا تھا۔پھر چہرہ موڑ کے اسے دیکھا اور پوچھنے لگا۔"عصرہ کے فون اور بینک ریکارڈز نکلوائے تھے احمد نظام صاحب نے۔ ان کا کیا بنا؟"

"ایک بھی پے منٹ مشکوک نہیں ہے۔نہ عصرہ نے ان سات دنوں میں کوئی بھاری رقم نکلوائی' نہ رقم کسی کو بھیجی۔بلکہ ان دنوں میں عصرہ نے کوئی خاص شاپنگ بھی نہیں کی۔"

ایڈم رکا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔پھر سنجیدگی سے پوچھا۔"اگر اس آخری شاپ سے بھی کوئی سراغ نہ ملا...تو؟"

"کچھ تو ملے گا۔تالے عموماً آخری چابی سے ہی کھلتے ہیں۔" وہ زور دے کر بولی اور آگے بڑھ گئی۔

"کیا یہ شاپ چھ سال پہلے یہاں موجود تھی؟"

کچھ دیر بعد وہ دونوں کافی شاپ کے کاؤنٹر پر کھڑے پوچھ رہے تھے۔ریسپشنسٹ جواب میں ان کو بتانے لگا کہ یہ شاپ گو کہ یہاں موجود تھی لیکن اس دوران دو دفعہ اس کی ملکیت بدلی ہے۔ملکیت کے ساتھ عملہ بھی بدلا ہے۔وہ قریباً ڈیڑھ برس سے کام کر رہا ہے یہاں اور پچھلے عملے کے بارے میں اسے کوئی معلومات نہیں ہیں۔

تالیہ کن اکھیوں سے دیکھ سکتی تھی کہ اردگرد ویٹرز میں کھلبلی مچ گئی تھی۔وہ ان دونوں کو دیکھتے ہوئے دھیمی سرگوشیاں کر رہے تھے۔چھ سال گزر گئے اور دنیا نہیں بدلی۔آج بھی سلیبریٹیز کو دیکھ کے لوگوں میں خوشی اور جوش کی لہر دوڑ جانا لازم تھا۔

"یہ میرا کارڈ رکھ لیں۔کچھ بھی یاد آئے تو مجھے کال کر لیجیے گا۔" ایڈم نے آخر میں اپنا کارڈ اسے تھمایا اور تالیہ کو دیکھ کے کندھے اچکائے۔وہ قدرے خاموش اور اداس لگتی تھی۔

وہ دونوں باہر آئے اور سڑک کنارے بچھی کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔ایڈم نے ویٹر کو اشارہ کر کے ایک چائے لانے کو کہا اور پھر سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"کم از کم آپ یہ تو ثابت کر سکتی ہیں کہ یہ آرڈر ملائیشیاء سے کیا گیا جبکہ آپ مصر میں تھیں۔"

"آپ کے خیال میں مجھے اپنی بے گناہی صرف کورٹ میں ثابت کرنی ہے؟" وہ نظریں اس پہ مرکوز کیے ایک دم تلخی سے بولی۔"مجھے ٹھوس ثبوت چاہیے ہیں۔یہاں سب مجھے مجرم سمجھتے ہیں۔مجھے لوگوں کی نظروں میں بری ہونا ہے۔قانون کی فائلوں میں نہیں۔"

اس نے بازو سینے پہ لپیٹ لیے اور نروٹھے انداز میں سڑک کو دیکھنے لگی۔"مجھے پورا یقین تھا کہ آخری شاپ سے کچھ نہ کچھ ملے گا۔"

"کیا عصرہ کی کوئی بیسٹ فرینڈ تھی؟ یا کوئی ایسا دوست جس سے وہ سب شیئر کرتی ہو؟" وہ سوچ سوچ کے کہہ رہا تھا۔

"معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ویسے مجھے خوشی ہے کہ آپ میرے لیے بہت وقت نکال رہے ہیں۔"
وہ اسے دیکھ کے اداسی سے مسکرائی۔
"اس کی دو وجوہات ہیں۔ آپ کی وجہ سے میں ایک پوٹینشل بیسٹ سیلر لکھنے جا رہا ہوں۔ اور آپ میری زندگی کے کھوئے چھ ماہ کی کہانی جانتی ہیں۔ میں آپ کی مدد کروں گا تو آپ میری مدد کریں گی۔" وہ اسی اجنبی انداز میں مسکرا کے بولا۔ پھر گھڑی دیکھی۔
"شام کو نمائش پہ جانا ہے۔ میں آپ کو پک کرلوں گا۔ ابھی مجھے کچھ کام ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ تالیہ نے نظریں اٹھا کے مسکرا کے اسے دیکھا۔
"آپ فکشن نہ لکھیں۔ بلکہ کوئی بھی فیصلہ وقت پہ نہ کریں۔"
"ایں؟ وہ کیوں؟" وہ تعجب سے اسے دیکھ کے بولا۔
"کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ آپ کی کھوئی ہوئی یادداشت واپس آئے۔ کچھ چیزوں کا بھول جانا ہی اچھا ہوتا ہے۔ میں خوش ہوں ایڈم کہ آپ وہ سب بھول گئے۔ اس لیے.... وقت کے سوالوں کو حل کرنے کی کوشش نہ کریں۔"
ایڈم نے سر کو اثبات میں خم دیا۔ "جڑی بوٹیاں واٹ ایور۔" اور کچھ بڑبڑا کے آگے بڑھ گیا۔ وہ پھولوں سے بھرے بازار میں تنہا بیٹھی چائے کا انتظار کرنے لگی۔
اسے آج وان فاتح سے ملنے وہیں جانا تھا جہاں پرسوں پہلے "بطور تالیہ مراد" وہ اس سے پہلی دفعہ ملی تھی۔

☆☆☆

آرٹ گیلری کی سفید مرمریں دیواروں پہ دور دور تک فریمز آویزاں نظر آ رہے تھے۔ چکنے فرش پہ مہمان ٹولیوں کی صورت بکھرے تھے۔ لوگ بہت زیادہ نہیں تھے۔ ییشا نے اسے محدود اور پرائیوٹ سا رکھا تھا۔ جولیانہ کی خواہش پہ اس نے اس نمائش کو عصرہ کی پرانی گیلری میں منعقد کیا تھا۔
خود وہ لمبی میکسی میں ملبوس تھی جو سامنے سے سنہری اور پشت سے گہری نیلی تھی گیلری کی سجاوٹ بھی انہی دو رنگوں کے امتزاج میں کی گئی تھی۔ ییشا کے شہد رنگ بالوں کے ساتھ نیلے نگینوں والے ٹاپس بھی گویا سجاوٹ کا حصہ لگتے تھے۔ وہ مسکرا مسکرا کے تمام مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ ابھی پردھان منتری کی آمد نہیں ہوئی تھی۔ وہ کچھ دوستوں کو اپنی ایک فوٹو گراف کے بارے میں مسکرا کے کچھ بتا رہی تھی جب اس کی نظر پیچھے ایک نو وارد پہ پڑی۔
ییشا کی آنکھوں میں خوش گوار حیرت در آئی۔ وہ معذرت کرکے فوراً اس طرف آئی۔
"ایڈم بن محمد؟ واٹ اے سرپرائز۔"
ایڈم جو تنہا کھڑا ایک فریم کو دیکھ رہا تھا' آواز پہ اس کی طرف پلٹا اور مسکرایا۔ وہ سفید شرٹ پہ سیاہ ڈنر جیکٹ پہنے ہمیشہ کی طرح تازہ دم اور خوش باش لگ رہا تھا۔
"ایک دوست نے آپ کی پارٹی کا دعوت نامہ دیا تھا۔ سوچا چکر لگا لوں۔ شاید کوئی انسپائریشن مل جائے۔" وہ سادگی سے کندھے اچکا کے بولا۔
"مجھے بہت خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کے۔ میں نے آپ کی تمام کتابیں پڑھ رکھی ہیں اور کوشش کرتی ہوں کہ آپ کا شو بھی باقاعدگی سے دیکھا کروں۔ مجھے معلوم ہوتا آپ آ رہے ہیں تو میں آپ کی بک لے آتی آٹو گراف کے لیے۔" وہ اسے دیکھ کے جیسے بہت خوش ہوئی تھی۔
"ارے نہیں۔ یہ آپ کی پارٹی ہے۔ آج کی سلیبریٹی آپ ہیں۔" ایڈم نے مصنوعی عاجزی سے سر کو خم دیا۔
"اچھا آپ آگے آئیں نا۔ میں آپ کو اپنا کام دکھاتی ہوں۔"
"میں دراصل اپنی پلس ون کا انتظار کر رہا ہوں جو ابھی تک نہیں پہنچیں۔" اس نے کہنے کے ساتھ متلاشی نظروں سے داخلی گزرگاہ کو دیکھا۔ ییشا

مسکرا کے آگے بڑھنے لگی تو وہ جلدی سے بولا۔
"مسز ییشا.... کیا ہم پہلے مل چکے ہیں؟"
"میں اور آپ؟" وہ ٹھہر کے اسے دیکھنے لگی۔ "نہیں تو۔"
"آر یو شیور؟ کیونکہ میری ایک دفعہ کچھ مہینوں کے لیے یادداشت کھو گئی تھی۔ 2016ء کی بات ہے۔ کیا ہم کبھی اس دوران ملے تھے؟"
"نہیں۔ 2016ء میں تو میں امریکہ میں ہوتی تھی۔ اور اگر میں آپ سے ملی ہوتی تو مجھے ضرور یاد ہوتا۔ سلیبریٹی سے ملاقات کی تمام جزئیات انسان کو یاد ہوتی ہیں۔"
"اور تالیہ مراد.... آپ ان سے ملی ہیں کبھی؟"
"تالیہ مراد؟ نہیں۔" اس نے الجھن سے دائیں بائیں گردن ہلائی۔ پھر ایڈم کے پیچھے کسی کو دیکھ کے آنکھیں تعجب سے پھیلیں۔ "اور تالیہ مراد آپ کی پلس ون ہیں۔"
ایڈم مڑا تو دیکھا' وہ سامنے سے چلی آرہی تھی۔ اس نے سادہ سیاہ میکسی پہن رکھی تھی جو پاؤں کو چھوتی تھی۔ بال جوڑے میں بندھے تھے اور کانوں میں سرخ موتی لٹک رہے تھے۔ ہاتھ میں سرخ کلچ تھا۔ ایڈم کو دیکھ کے وہ مسکرائی اور اس طرف چلی آئی۔
"تالیہ مراد...." ییشا نے ابرو اچکا کے گہری سانس لی۔ "خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کے۔"
تالیہ، ایڈم کے قریب آئی۔ اسے سلام کیا۔ تاخیر کے لیے معذرت کی۔ پھر ییشا کو دیکھا تو لاعلمی سے ایڈم کو اشارہ کیا جیسے کہہ رہی ہو یہ کون ہے؟ ایڈم اس انداز پہ گڑبڑا گیا۔
"یہ وہ آرٹسٹ جن کی نمائش پہ ہم اس وقت کھڑے ہیں۔"
تالیہ نے لاعلمی سے معذرت کرتے ہوئے کندھے اچکائے۔
"سوری میں آپ سے واقف نہیں تھی۔ اس شہر سے عرصہ دراز سے لاتعلق رہی ہوں سو نئے آرٹسٹس کے بارے میں کوئی خبر نہیں۔ میں آپ کا کام ضرور دیکھوں گی۔"
ییشا مسکرا کے اس کا شکریہ ادا کرتی آگے بڑھ گئی۔ تالیہ اسے دور جاتے دیکھتی رہی۔ پھر چہرہ موڑا تو دیکھا' ایڈم اسے پتلیاں سکوڑے گھور رہا تھا۔
"نہ وہ آپ کو جانتی ہے نہ آپ اسے۔ تو آپ نے مجھے کیوں کہا کہ آپ اسے جانتی ہیں؟"
"اور آپ نے میرا یقین کر لیا؟ یاد رہے... میں کون و دمن ہوں۔" وہ مسکرا کے گردن موڑ موڑ کے اطراف میں دیکھنے لگی۔ ایڈم نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔
"میں آپ کو سمجھ نہیں پا رہا۔"
"گڈ۔ اب آپ کی کہانی مزید دلچسپ ہو جائے گی۔" وہ گردن موڑ کے ایک فوٹو فریم کو دیکھ رہی تھی۔ اس میں ایک خوب صورت سیاہ گھوڑا گھاس چرتا نظر آرہا تھا۔
"یعنی آپ اس کو نہیں جانتی تھیں۔ آپ نے یہ صرف اس لیے کہا تاکہ میں آپ کو پارٹی میں ساتھ لے جاؤں۔ میں ویسے بھی لے جاتا۔ آپ کو یہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔"
تبھی محفل میں نامحسوس سی ہلچل مچی۔ کچھ لوگ سر جوڑے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہنے لگے۔ تبھی سوٹ والے افراد اندر آئے اور ارد گرد بکھر گئے۔ وہ مختلف آلوں کی مدد سے گیلری کو سوئیپ کر رہے تھے۔ چند لمحے گزرے جب انہوں نے وائرلیس پہ باہر والوں کو کلیئر کی خبر دی۔ ہلچل بڑھ گئی۔ لوگ دروازے سے راستہ چھوڑ کے کھڑے ہو گئے۔
"پتا ہے میں یہاں کیوں آنا چاہتی تھی؟" وہ دونوں ہجوم سے ہٹ کے ایک دیوار کے ساتھ کھڑے دروازے کو دیکھ رہے تھے۔ "کیونکہ یہ وہ جگہ ہے جہاں ہم پہلی بار ملے تھے۔"
"ہم؟"
"میں' تم' فاتح اور عصرہ۔" وہ دروازے سے داخل ہوتے فاتح کو دیکھ کے بولی۔ وہ حسب معمول

لوگوں میں گھرا مسکرا کے اندر آرہا تھا۔ اشعر اور جولیانہ اس کے ہمراہ تھے۔ بیشا ان کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ اسے جولیانہ کے آنے کی بہت خوشی تھی۔

''اسی گیلری میں؟''

''ہاں۔ یہ عصرہ کی گیلری ہوا کرتی تھی۔ گو کہ اس سے دو تین دن پہلے بھی ہم ملے تھے۔ میں' تم' فاتح اور عصرہ۔ تنکو کامل کے گھر لیکن تب تم لوگ ایک نوکرانی سے مل رہے تھے۔ اصل تالیہ مراد سے نہیں۔ یعنی کہ سوشلائیٹ تالیہ سے نہیں۔ ہماری اصل ملاقات اس گیلری میں ہوئی تھی۔''

''اسی لیے آپ یہاں آنا چاہتی تھیں۔ آپ وان فاتح سے اسی جگہ ملنا چاہتی تھیں جہاں آپ پہلی دفعہ ان سے ملی تھیں۔ How poetic۔''

''اب تم تالیہ مراد کو سمجھنے لگے ہو۔''

''امید ہے کہ آپ کی کہانی اس سے زیادہ دلچسپ ثابت ہوگی اور میرا یہ سارا وقت ضائع نہیں جائے گا۔'' وہ بور نظر آتا تھا۔

تالیہ نے پلٹ کے غور سے اسے دیکھا۔ ''میں آپ کا وقت ضائع نہیں کر رہی' ایڈم۔ یا شاید آپ نے ابھی تک میرے خلاف دل سے بغض نہیں نکالا۔''

وہ چونکا۔ ''مجھے آپ سے کس چیز کا بغض ہو سکتا ہے؟''

''میری وجہ سے کچھ کھویا تھا آپ نے.....''

''کیا؟''

اس نے ایڈم کی آنکھوں میں دیکھ کے وقفہ دیا۔ ''آپ کے چوزے.....وہ میری وجہ سے کھوئے تھے نا۔''

ایڈم ہلکا سا ہنس دیا اور گردن موڑ کے اس طرف دیکھنے لگا جہاں فاتح ربن کاٹ رہا تھا۔ کیمروں کے فلیش کی چکا چوند میں وہ مسکراتے ہوئے اب بیشا کی فوٹوگرافی پہ تبصرہ بھی کر رہا تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے اس طرف دیکھتے رہے۔

''آپ کی جرأت پہ حیرت ہے۔'' آواز پہ وہ دونوں اپنی ایڑیوں پہ گھومے تو دیکھا سامنے اشعر کھڑا تھا۔ گلاس اٹھائے' طنزیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ زہر خند ہوا۔ ''میرا خیال تھا آپ شرمندگی سے اپنے اپارٹمنٹ سے باہر نہیں نکل پائیں گی۔''

''کیا آپ کو ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا کہ تالیہ کی ہمت کوئی نہیں توڑ سکتا؟'' سیاہ لباس والی لڑکی مسکرائی تو اس کی آنکھوں میں چمک در آئی۔ اشعر نے تحقیر سے اسے دیکھا اور سرگوشی میں بولا۔

''تم میری بہن کی قاتل ہو۔ میں اپنی بہن کا انتقام ضرور لوں گا۔''

''وہ بہن جس کو بدنام کرنے کے لیے جعلی گھائل غزال بھیجی تھی آپ نے اسے؟''

''آہم۔'' ایڈم کھنکھارا۔ ''آپ دونوں ایک ٹرائل میں گواہی دینے جا رہے ہیں۔ آپ کو آپس میں بات نہیں کرنی چاہیے۔''

''کیا اب میں اشعر صاحب کا حال تک نہیں پوچھ سکتی؟'' وہ ابرو اچکا کے مسکرائی۔ ''آپ کا بازو کیسا ہے۔''

''ویری فنی۔'' اشعر نے تنفر سے سر جھٹکا اور آگے بڑھ گیا۔ مشروب کا آخری گھونٹ بھر کے اس نے گلاس پرے رکھا۔ ایک نظر دور مہمانوں میں گھرے فاتح اور بیشا کو دیکھا۔ پھر اپنے پی ایس کو اشارے سے بلایا۔

''احمد نظام....تالیہ مراد کا وکیل....اس سے میری بات کرواؤ۔ اس روز ہماری بات ادھوری رہ گئی تھی۔'' وہ زیر لب مسکرا کے بولا۔ ماورائے عدالت ساز باز میں اپنا ہی لطف تھا۔

کچھ دیر بعد پی ایس اس کے پاس آیا۔ ''سر.....میں نے ان سے بات کی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں انہوں نے آپ کو فون نہیں کیا تھا۔''

اشعر محمود ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گیا۔ نظریں آہستہ سے تالیہ کی طرف موڑیں۔ وہ دور ایڈم کے ساتھ کھڑی اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ سیاہ لباس اور سرخ ایئر رنگز والی لڑکی بالکل مطمئن اور پرسکون

نظر آتی تھی۔

(آپ کا بازو کیسا ہے؟) اشعر تیزی سے مڑا اور ریسٹ روم کی طرف بڑھ گیا۔ ایک باتھ روم کے اندر آ کے اس نے دروازہ بند کیا اور کوٹ اتار کے اسٹینڈ پہ لٹکایا۔ پھر تیزی سے بائیں آستین اوپر چڑھائی۔

بازو پہ سرخ سا نشان نظر آ رہا تھا جو دو تین دن سے اسے بار بار کھجانے پہ مجبور کر دیتا تھا۔ جیسے کسی نے بے احتیاطی سے سرنج اندر گھسائی ہو۔

اس نے چہرہ اٹھا کے آئینے میں خود کو دیکھا۔ اس کی رنگت سفید پڑ رہی تھی۔ پھر اس نے موبائل نکالا اور وہ ویڈیو کھولی جو اسے ایک پولیس آفیسر نے بھیجی تھی۔ انٹیروگیشن روم میں زخمی چہرے والی تالیہ بیٹھی خوف سے کہہ رہی تھی۔

''اغوا کار... میں نے ان کی شکل نہیں دیکھی۔ انہوں نے ماسک پہن رکھے تھے.....''

یہ وہ تالیہ نہیں تھی جو ابھی باہر گیلری میں کھڑی تھی۔ وہ زخمی چہرہ' وہ اندھیرے سے روشنی میں آنے کا خوف.... وہ سب اداکاری تھا۔ وہ اغوا والی کہانی' کہانی نہیں تھی۔ وہ اسے حقیقت بنا چکی تھی۔

وہ اس روز فاتح سے ملنے نہیں آئی تھی۔ وہ اشعر سے ملنے آئی تھی۔ سگنلز اسی نے خراب کیے تھے۔ کال اسی نے کروائی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ اس کے پیچھے آئے گا۔ اس نے جان بوجھ کے اسے بے ہوش کیا تھا۔ تاکہ وہ اس کے اندر کوئی سرنج داخل کر سکے۔ لیکن تالیہ اس کو کس چیز کا انجیکشن لگائے گی؟

اس نے الجھ کے بازو کے نشان کو دیکھا۔ باقی ہر شے سمجھ میں آئی تھی۔ وہ گرفتار ہونے آئی تھی۔ اس نے جان بوجھ کے اشعر سے ہاتھا پائی کی تھی تاکہ وہ پولیس کو زخمی حالت میں ملے اور اس کی اغوا والی کہانی ٹھوس لگے۔ لیکن اغوا والی کہانی تو تب ثابت ہوگی جب پولیس کو وہ کنٹینر ملتا اور.....

اشعر نے چونک کے بازو کے نشان کو دیکھا۔ تالیہ نے اسے انجیکشن نہیں لگایا تھا۔ اس نے اشعر کا خون نکالا تھا۔ اس کے پاس ایک بیگ تھا۔ گرفتاری کے وقت اس کے پاس سے کوئی بیگ نہیں ملا تھا۔ اس نے راستے میں ایک ٹیکسی بدلی تھی۔ وہ ٹیکسی یقیناً اس کے کسی سہولت کار کی تھی۔ اس نے بیگ اس کی کار میں چھوڑ دیا ہوگا۔ اور اس بیگ میں کیا ہوگا؟

اس نے کرب سے آنکھیں میچیں۔ اشعر کے فنگر پرنٹس اور خون لگی چیزیں۔ اور یقیناً بہت جلد پولیس کو ایسا کنٹینر مل جائے گا جس میں وہ چیزیں موجود ہوں گی۔

☆☆☆

پولیس کمشنر اپنے آفس میں بیٹھا فائلز دیکھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ چائے کے مگ سے گھونٹ بھر رہا تھا جب دروازہ کھٹکھٹا کے اس کا ماتحت اندر داخل ہوا۔ کمشنر نے چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔

''پھر؟''

ماتحت نے آستینیں چڑھا رکھی تھیں اور ٹشو سے پیشانی کا پسینہ صاف کر رہا تھا۔

''آپ یقین نہیں کریں گے۔''

''میں کرلوں گا۔ تالیہ مراد سچ کہہ رہی تھی نا؟''

وہ سانس روکے اس کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کرسی کھینچ کے بیٹھا اور آگے کو جھکے پرجوش آواز میں بتانے لگا۔

''وہ سب سچ کہہ رہی تھی۔ اس کو واقعی اغوا کیا گیا تھا۔ آپ نے دیکھا' وہ روشنی سے اسی لیے خوف زدہ تھی کیونکہ اسے ایک لمبا عرصہ اندھیرے میں رکھا گیا تھا۔ میری ٹیم کو وہ کنٹینر مل گیا ہے اور اس کے وہیکل کا نمبر 7786 ہے۔ وہ آدھا سرخ ہے اور آدھا نیلا۔''

کمشنر نے فائل بند کی اور مسکرا کے آگے ہوا۔

''لیکن اگر یہ صرف ایک اتفاق ہوا؟''

''اونہوں۔ آگے تو سنیں۔ کنٹینر کے اندر خون کی دھاریں ہیں۔ جیسے کوئی زخمی حالت میں وہاں سے نکلا ہے۔ خون آلود پیر بھی ہیں۔ ٹوٹی ہوئی ہتھکڑی' خون آلود رسی' چند بال' اور بہت سے فنگر

پرنٹس ہمیں ملے ہیں۔ وہاں یقیناً کسی کو اغوا کر کے رکھا گیا تھا۔"

"او کے۔ تمام سیمپلز لیب بھجوا دو اور جیسے ہی ٹینسٹ رپورٹس آئیں' مجھے اطلاع کرو۔ فرانزک سے کہو کہ اس کنٹینر کا اچھی طرح جائزہ لے۔ یہ کیس بہت دلچسپ ہو چکا ہے۔"

"آئی نو سر۔" وہ جوش سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔

کمشنر نے پیچھے کو ٹیک لگائی اور جھرجھری لی۔

(یعنی وہ لڑکی سچ کہہ رہی تھی؟ بہت دلچسپ۔)

☆☆☆

آرٹ گیلری میں مہمان اب ٹولیوں کی صورت آگے پیچھے فوٹو فریمز کا جائزہ لیتے نظر آ رہے تھے۔ پس منظر میں دھیمے سروں میں موسیقی بج رہی تھی۔ ڈرنکس اور سوئٹس سرو کی جا رہی تھیں۔ ایک ویٹر تالیہ اور ایڈم کے قریب ٹرے لے کر آیا تو ایڈم نے سوئیٹ کا ایک ٹکڑا اٹھا لیا۔ تالیہ نے مسکرا کے سر نفی میں ہلا دیا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔

اشعر تیز قدموں سے ان کے قریب آیا تو تالیہ نے مصنوعی حیرت سے اس کا غصیلا چہرہ دیکھا۔

"آپ کو کیا ہوا؟"

"تم مجھے اپنے اغوا کے جرم میں فریم کر رہی ہو' ہاں؟" وہ سرگوشی میں غرایا۔ "تم اس دن جان بوجھ کے گرفتار ہوئی تھیں۔ تم نے میرے فنگر پرنٹس لیے۔ میرا خون لیا۔ میرا ڈی این اے اب تم کسی کنٹینر پہ ڈال کے مجھے پھنسانا چاہ رہی ہو؟"

"اوہ واؤ۔" ایڈم نے لب گول کیے چونک کے تالیہ کو دیکھا۔ اس نے مسکرا کے کندھے اچکا دیے۔

"مجھے نہیں پتا آپ کیا کہہ رہے ہیں' اشعر صاحب۔"

"جلد ہی پولیس کو کوئی ایسا مشکوک کنٹینر مل جائے گا' میں جانتا ہوں۔" وہ چبا چبا کے بولا۔ "لیکن یاد رکھنا' اس طرح کی فریم جابز کامیاب نہیں ہوتیں۔"

"میں نے کہا نا' مجھے نہیں معلوم آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"تالیہ!"

شناسا سا آواز پہ اسے لگا وہ سانس لینا بھول گئی ہے۔ وہ چونک کے مڑی۔ وان فاتح سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔ تعجب تھا۔ خوشی تھی۔ پیچھے دو گارڈز بھی تھے۔ اشعر تن فن کرتا وہاں سے ہٹ گیا۔ وہ اب اشعر کی طرف متوجہ بھی نہیں تھی۔

فاتح اس کے عین سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ دم سادھے اسے دیکھے گئی۔

"تالیہ.... کیسی ہو؟" وہ نرم مسکراہٹ کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔ چھ سال.... یا چھ دن.... درمیان سے وقت کے سارے حساب کتاب غائب ہو گئے تھے۔

اس کے لب ہلکی سی مسکراہٹ میں ڈھلے۔

"اچھی ہوں۔ وقت میرے ساتھ بہت مہربان رہا ہے۔ اور آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں' تالیہ۔ میں بہت سوں سے بہتر ہوں۔" مسکرا کے ہلکے سے شانے اچکائے۔ وہ اس سے نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔ اور ان نظروں میں اپنائیت تھی' محبت تھی' مسکراہٹ تھی۔ وہاں کوئی گلہ' کوئی سوال' کچھ نہ تھا۔

ایڈم گلاس سے گھونٹ بھرتا وہاں سے ہٹ گیا۔ لوگ مڑ مڑ کے ان کو دیکھنے لگے۔ گارڈز فاتح کے پیچھے آ کھڑے ہوئے اور کسی کو بھی اس طرف آنے سے روکنے لگے۔

ایک دفعہ پھر بھری محفل میں وہ تنہا تھے۔

"لانگ ٹائم۔" وہ اس کو دیکھ کے مسکرا کے کہہ رہا تھا۔

"اچھا؟ میرے لیے جیسے کل کی ہی بات تھی۔"

وہ زخمی سا ہنسی۔ سفید دیواروں پہ لگے سارے سیاہ گھوڑے اپنی گہری آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھنے

لگے۔ اردگرد کی تمام آوازیں بند ہو چکی تھیں۔

"تمہیں یاد ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں ہم پہلی دفعہ ملے تھے۔ ہم سب۔"

"آپ کو بھی یاد ہے؟" اسے حیرت ہوئی۔ کبھی اس کے بھولنے پہ حیرت ہوتی تھی۔ آج اس کے یاد رہ جانے پہ حیرت ہوئی تھی۔

"ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا تم یہاں آئی ہو گی۔ اب میرے جانے کا وقت ہے۔" فاتح نے کلائی کی گھڑی دیکھی اور پھر اسی بشاشت سے تالیہ کو دیکھا۔ "میں کل صبح تمہارا انتظار کروں گا۔ تم آ رہی ہو نا؟"

اس شخص کو کون انکار کر سکتا تھا۔ تالیہ نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی پلٹ گیا۔ اس کی خوشبو اور مقناطیسیت کا ہالہ اس کے ساتھ ہی دور ہوتا گیا۔

فسوں ٹوٹا تو تالیہ نے چونک کے ادھر ادھر دیکھا۔ ایڈم قریب ہی کھڑا تھا۔ مسکرا کے قریب آیا اور سرگوشی میں بولا۔

"آپ کی پی ایم سے باتیں کرنے کی تصاویر جو ایک گھنٹے کے اندر اندر سوشل میڈیا پہ آنے والی ہیں یا تو آپ کا کیس خراب کریں گی یا....."

"اٹس اوکے ایڈم۔" وہ مسکرا دی۔ "تالیہ اب کسی چیز سے نہیں ڈرتی۔" اور کندھے اچکا دیے۔ دور کھڑا اشعر ابھی تک ان دونوں کو گھور رہا تھا۔

☆☆☆

نمائش کے اختتام کے تین گھنٹے بعد.....کوالا لمپور کے ایک پوش علاقے میں بنے بنگلے کے باہر پولیس کی تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ بنگلے کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے نظر آ رہے تھے اور دیواروں پہ سرخ پینٹ سے نازیبا کلمات لکھے دکھائی دے رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کسی نے بنگلے پہ بری طرح حملہ کیا تھا۔ کہیں کہیں گولیوں کے راؤنڈز اور شیل بھی بکھرے تھے۔ پولیس اہلکار ہر جگہ بکھرے ان چیزوں کو اکٹھا کر رہے تھے اور متاثرہ حصوں کی تصاویر لے رہے تھے۔

اندر لاؤنج میں توڑ پھوڑ کے آثار واضح نظر آتے تھے۔ فرنیچر ادھر ادھر بکھرا تھا۔ ڈیکوریشن پیسز ٹوٹے پڑے تھے۔ پینٹنگز پھٹی ہوئی نیچے پھینکی گئی تھیں۔

بڑے صوفے پہ ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکی میشا سے لگ کے بیٹھی تھی۔ میشا شال لپیٹے سرخ ناک اور گیلی آنکھوں سے سامنے بیٹھے تفتیشی افسر کو بتا رہی تھی۔

"میں نمائش سے گھر آئی تو سب کچھ اسی طرح پڑا تھا۔ میری پینٹنگز بھی پھاڑ دیں اس نے۔ میرے کمرے کے لاکر سے کیش بھی غائب ہے۔" اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی اور وہ خود کو کمپوز رکھنے کی کوشش میں بری طرح ناکام نظر آتی تھی۔ سارا مسکارا بہہ گیا تھا۔ جیولری تک اتارنے کا وقت نہیں ملا تھا۔

"مسز میشا.....آپ کو کس پہ شک ہے؟"

اس نے گیلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "پتا نہیں۔" اور نظریں جھکا دیں۔

"ماما۔" نوعمر لڑکی نے شکایتی انداز میں اسے جھنجھوڑا۔

"آپ بنا کسی ڈر اور خوف کے بتائیں۔ ہم اس کو گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دلوائیں گے مسز میشا۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔" وہ جھلا کے بے بسی سے بولی۔

تھوڑی دیر بعد تفتیشی افسر اٹھ کے گیا تو میشا نے فون نکالا۔ پھر آنسو پونچھتے ہوئے ایک چٹ کھولی جس پہ لکھا تھا "پی ایم فاتح رامزل"۔ اس نے کپکپاتی انگلیوں سے میسج ٹائپ کرنا شروع کیا۔

"کیا آپ کی مدد کی آفر ابھی تک برقرار ہے داتو سری؟"

پیغام بھیج کے اس نے سر گھٹنوں میں جھکا دیا۔ آنسو اب بھی گر رہے تھے۔

☆☆☆

پیٹرا جایا پہ سرما کی چمکیلی سی صبح بہت سی تازگی لیے آئی تھی۔ آج منہ اندھیرے سے ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی تھی جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اکثر لوگ آج گھروں میں دبکے تھے۔ کام پہ دیر سے جانے کا ارادہ تھا۔

سری پردھانہ کی اونچی کھڑکیوں سے محل کے وسیع و عریض سبزہ زار بارش میں بھیگتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ایک راہداری میں کھڑی' ایک کھڑکی کے شیشے پہ لڑھکتے قطرے دیکھ رہی تھی۔

فاتح کا پی ایس اپنے ڈیسک پہ بیٹھا اس خاص مہمان کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جب سے آئی تھی' کھڑکی کے کنارے کھڑی تھی۔ یہاں سے باہر کی گھاس بھیگتی دکھائی دے رہی تھی۔ سفید کوٹ اور اسکرٹ پہنے' کندھوں تک آتے سیاہ بال کھلے چھوڑے' اس نے کانوں میں سفید موتی پہن رکھے تھے۔ وہ یہاں کھڑی کوئی سفید مورت لگتی تھی۔

"آپ اندر جا سکتی ہیں۔" پی ایس نے کھنکھار کے تالیہ کو اطلاع دی تو وہ دھیرے سے پلٹی اور لکڑی کے اونچے دروازوں کی جانب بڑھ گئی۔

وہ پہلی دفعہ سری پردھانہ آنے والوں سے مختلف تھی۔ پی ایس اس کو صرف خبروں اور ٹی وی کی حد تک جانتا تھا۔ پھر بھی اسے دیکھ کے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ لوگ سری پردھانہ میں پہلی دفعہ آکے رعب کا شکار' مسحور نظر آتے تھے۔ البتہ وہ جس اٹھی گردن کے ساتھ آئی تھی' اسی اٹھی گردن کے ساتھ اندر چلی گئی۔

ایسے جیسے وہ اس سے بڑے محل دیکھ چکی ہو۔ جیسے وہ ایسے ہی محلوں میں بڑی ہوئی ہو۔

دروازے سے پردھان منتری کی کرسی کا فاصلہ چند گز تھا۔ تالیہ نے اندر قدم رکھا تو فاتح بے اختیار اپنی کرسی سے اٹھا۔

"ویلکم بیک۔" وہ مسکرا کے بولا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ تالیہ نے قدم اس کی طرف بڑھائے۔ ہر قدم کے ساتھ زمین جیسے لپیٹی جا رہی تھی۔ ماضی ایک فلم کی طرح نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔

تنکو کامل کی نوکرانی بن کے اس نے فاتح کو پہلی دفعہ جوس پیش کیا تھا۔ ایک قدم.....

عصرہ کی گیلری میں وہ سنہرے بالوں والی لڑکی اس سے ملی تو اس نے اسے تاشہ کہہ کے پکارا.....

چار قدم......

وہ عصرہ اور اشعر کے ساتھ ان کی ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھی گھائل غزال کی اصلیت نہ بتا سکی تھی۔

وہ ین باؤ کے گھر کی زیر زمین سیڑھیوں کے نیچے کھڑی تھی جب اس نے ایڈم اور فاتح کو ایک ساتھ نیچے آتے دیکھا۔

پانچ قدم۔

وہ تینوں آگے پیچھے جنگل میں چل رہے تھے.... چھ قدم.....

وہ جیا میں کھڑا چائے پیالیوں میں ڈال رہا تھا..... وہ شہزادیوں کا تاج پہنے بگھی سے اتر رہی تھی.....

سات قدم.....

وہ قید میں زخمی حالت میں پڑا تھا اور وہ اس کے گال کے زخم پہ مرہم رکھ رہی تھی۔

آٹھ قدم......

وہ اسے بھول چکا تھا اور وہ اس کی چیف آف اسٹاف بنی اس کے لیے کافی کے مگ بھاگتی ہوئی لا رہی تھی۔

نو قدم......

وہ اس کے آفس میں کھڑی اسے بتا رہی تھی کہ وہ استعفیٰ دے رہی ہے کیونکہ وہ دوسرے سیاستدانوں جیسا نکلا ہے......

وہ دونوں یان سوفو کے کنویں پہ بیٹھے تھے اور اس نے بالوں میں پھول اٹکا رکھا تھا.....

دس قدم.....

وہ الاؤ کے پاس بیٹھے تھے..... اس قدیم قلعے

میں.....اور وہ دیوار پہ وہ نظم لکھ رہی تھی.....

گیارہ قدم.....

اور وہ اس کے سامنے تھا۔ فاصلے ختم ہو چکے تھے۔

"بیٹھو۔"

وہ کرسی کھینچ کے بیٹھی۔ سارے ماہ و سال کہیں گم ہو گئے۔ فضا میں عجیب سا سحر بکھر گیا۔

"کیسی ہو تم؟" وہ آگے کو جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانک کے پوچھ رہا تھا۔ تالیہ نے ابرو اٹھائی۔

"میرا خیال تھا آپ پوچھیں گے کہ تم کہاں تھیں؟" اس کی آنکھوں میں نمی در آئی۔

"کیا مجھے پوچھنا چاہیے؟"

"ہاں۔ میرا خیال تھا کہ آپ مجھ سے جواب مانگیں گے کہ میں آپ کو چھوڑ کے کیوں چلی گئی؟ کیا میں اپنے بابا کے پاس رک گئی؟ کیا آپ کو اور ایڈم کو بھیج کے میں نے ایک اور کون گیم کھیلا؟ کیا میں نے آپ کو دھوکہ دیا؟ مگر آپ....." اس کی آنکھوں میں تعجب تھا۔ "آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں؟ میں چھ سال تک دور رہی.....اور آپ نے جواب نہیں مانگا۔ نہ کل۔ نہ آج؟"

وہ مسکرا کے اٹھا اور پیچھے کھڑکی کے ساتھ رکھے اسٹینڈ تک گیا۔ کھڑکی پوری دیوار جتنی اونچی تھی۔ اس کے پردے کھلے تھے اور اس کے پار بارش میں بھیگتا سبزہ زار دکھائی دے رہا تھا۔

وہ تالیہ کی طرف پشت کیے بوتل سے پانی چائے کی برقی کیتلی میں انڈیلنے لگا۔

"مجھے نہیں معلوم اس روز تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا' تالیہ۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میں نے سنا کہ ایڈم تمہیں پکار رہا ہے کہ نیچے آؤ۔ لیکن جب میں نے پلٹ کے دیکھا تو ایڈم حیرت سے پیچھے دیکھ رہا تھا جہاں صرف اندھیرا تھا۔ ہم دونوں پیچھے کو پلٹے لیکن دروازہ ایک سیاہ دیوار میں بدل چکا تھا۔ پیچھے کا راستہ ختم ہو چکا تھا۔

میں واپس مڑا تو دیکھا' سامنے ایک اور دروازہ تھا۔ نہ اس دفعہ کوئی دریا تھا' نہ کوئی بارش۔ وہ چابی جو یان سوفو نے بنائی تھی' وہ عجیب سی تھی۔ میں نے آگے کا دروازہ کھولا تو ہم جونکر اسٹریٹ پہ نکل آئے تھے۔ تم ہماری ساتھ نہیں تھیں اور میں زخمی تھا۔"

وہ گردن جھکائے اب کیتلی پہ ٹائمر سیٹ کر رہا تھا۔ بٹن دبا کے وہ اس کی طرف مڑا اور اسٹینڈ سے ٹیک لگائے' ہتھیلیاں دونوں اطراف میں میز پہ جمائے' اس کو دیکھ کے کہنے لگا۔

"میں زیادہ دیر ہوش میں نہیں رہ سکا تھا۔ ایڈم کہاں گیا' مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن جب میں ہسپتال میں جاگا تو اشعر میرے ساتھ تھا۔ میں نے تمہارے بارے میں دریافت کیا لیکن کسی نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔ ایڈم کے بارے میں سنا کہ وہ ٹراما سینٹر میں ہے۔ اس کی یادداشت کھو گئی ہے۔ میں ایک دو دفعہ اس سے ملنے گیا لیکن وہ مجھے نہیں پہچانتا تھا۔ اس کا ذہن اس دن تک واپس چلا گیا تھا جب وہ میرا باڈی گارڈ بنا تھا۔ میں نے اسے زیادہ تنگ نہیں کیا اور واپس اپنی زندگی میں چلا گیا۔"

"آپ نے استعفیٰ واپس لے لیا؟" اس نے آنسوؤں کا گولہ بہ دقت نگلا۔

"ہاں۔ لیکن میں ہر چیز سے بددل ہو گیا تھا۔ چند ماہ تک ہر روز سونے سے پہلے میں سوچا کرتا تھا کہ تالیہ نے ایسا کیوں کیا؟ وہ کیوں واپس نہیں آئی؟ کیا اس نے یہ جان بوجھ کے کیا؟"

کیتلی کی گھنٹی بجی تو وہ مڑا اور کیبنٹ سے دو مگ نکال کے رکھے۔ پھر کیتلی اٹھائی۔ اس کے اندر گرم پانی ابل رہا تھا اور کھڑکی کے باہر ٹھنڈا پانی برس رہا تھا۔

"میں نے ذوالکفلی کو ڈھونڈنا چاہا۔ وہ نہیں ملا۔ میں نے شکار بازوں کو تلاشا۔ شاید کوئی تمہیں اس دنیا سے واپس لے آئے۔ میرا خیال تھا تم وہاں پھنس گئی تھیں۔ چند ماہ تک میں خود فراموشی کی حالت میں رہا۔ میرا کیریئر متاثر ہوا۔ دوسرے لوگ

یری کرسی پہ نظر رکھنے لگے۔ تب مجھے تم سے گلے بھی تھے اور شکایات بھی۔ تب تم واپس آجاتیں تو شاید بں حساب مانگتا۔"

وہ اب گرم ابلتی دھار مگ میں انڈیل رہا تھا۔ گردن جھکی تھی اور الفاظ ٹھہر ٹھہر کے لبوں سے نکل رہے تھے۔

"لیکن تالیہ..... انسان کو معلوم بھی نہیں ہوتا ور ایک روز وہ نیند سے جاگتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے دکھ کو ہرا دیا ہے۔ وہ غم اس کے ل کو اب نہیں کاٹ رہا۔ انسان نیند سے جاگتا ہے ور اسے ایک دم سے اس کا کلوژر مل جاتا ہے۔ غم کو کنارہ مل جاتا ہے۔" اس نے ٹی بیگ کپ میں الا۔ پانی کا رنگ تیزی سے سنہرا ہونے لگا۔

"میں ایک صبح اٹھا اور مجھے احساس ہوا کہ تم نے وہ جان بوجھ کے نہیں کیا تھا۔ میں تمہیں جانتا ھا۔ تم کسی مسئلے میں گرفتار ہو گئی ہو گی۔ تمہارے بابا لی کوئی سازش۔ کوئی وقت کا چکر۔ یہ قسمت تھی اور جھے اسے قبول کرنا تھا۔"

دوسرے مگ میں اس نے چائے ڈال کے کیتلی رکھی۔ پھر چینی کے کیوبز دونوں مگز میں الے۔ پھر انہیں اٹھائے اس کے سامنے آیا۔ اس کا ۔ رکھا اور اپنا لیے واپس اپنی کرسی پہ بیٹھ گیا۔

"ان چھ سالوں میں کوئی دن ایسا نہیں گزرا ب مجھے تمہارا خیال نہ آیا ہو۔ اور میں ہمیشہ تمہاری بریت کا سوچتا تھا۔ تم اس دنیا میں ہو یا اس دنیا ں..... میری دعا تھی کہ تم ٹھیک رہو۔ کل تم سے ملنے سے پہلے تک میرے ذہن میں واقعی سوالات تھے لکن اب نہیں ہیں۔"

"کیوں؟ کل مجھے دیکھ کے کیا لگا آپ کو؟"

دونوں مگ میز پہ یوں رکھے تھے کہ ان کی تی بھاپ ان دونوں کے درمیان بار بار حائل ہو ائی تھی۔ وہ اس سوال پہ مسکرا دیا۔

"میں نے پچھلے چھ سال تمہاری ہر بات پہ غور یا ہے۔ ہر کون، ہر حرکت جو تم نے میرے سامنے کی یہاں تک کہ مجھے تمہارے چہرے کا ایک ایک تاثر یاد ہوتا گیا۔ تالیہ کب خوش ہوتی ہے۔ تالیہ کب خوشی ظاہر نہیں کرتی۔ کب وہ کامیاب ہوتی اور کب بے بس۔ تالیہ کی cryptic (خفیہ) باتوں کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے میں نے تمہاری غیر موجودگی میں تمہیں زیادہ اچھے سے پڑھ لیا ہے۔"

"اور؟" اس نے سنجیدگی سے ابرو اٹھایا۔

"اور کل تمہیں دیکھ کے مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم خوش ہو۔" اس نے مگ لبوں سے لگاتے ہوئے مسکرا کے کہا۔

"میرے اوپر ایک مرڈر ٹرائل چل رہا ہے۔ میں تھانے میں ایک دن گزار کے آئی ہوں۔ مجھے سارا ملک مجرم سمجھ رہا ہے۔ میری زندگی کے چھ سال کھو گئے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں خوش ہوں؟"

"ہاں۔ جب تم نے کہا وقت تم پہ مہربان رہا ہے تو میں سمجھ گیا تھا کہ تمہیں کچھ مل گیا ہے۔ کوئی ایسی خوشی جو تم شیئر نہیں کر سکتیں۔ لیکن وہ تمہارے انگ انگ سے پھوٹ رہی ہے۔" وہ ٹیک لگائے گھونٹ بھرتے ہوئے غور سے اسے دیکھ کے کہہ رہا تھا۔ "اور میں نے تمہاری انٹیروگیشن کی ویڈیو بھی دیکھی تھی۔ وہ سب ایک ایکٹ تھا۔ مجھے پتا ہے۔"

"واؤ۔" وہ مسکرا دی۔ "آپ جانتے ہیں اس رات کیا ہوا تھا؟"

"میں سننا چاہوں گا۔"

"وقت نے میرے ساتھ چال چلی۔ میں دروازے میں دیر سے داخل ہوئی۔ شاید چھ سیکنڈ دیر سے۔ اور جب میں باہر جونکر اسٹریٹ پہ نکلی تو چھ برس گزر چکے تھے۔"

"اوہ۔" اس کے لب تعجب سے سکڑے۔

"آپ لوگوں نے ایک زمانہ میرے بغیر گزار لیا۔ لیکن میں؟ میرے چھ سال کھو گئے۔ اور اب وقت کو واپس جگہ پہ لانے کا کوئی طریقہ میرے پاس نہیں بچا۔ میں آج بھی وہیں کھڑی ہوں۔ مجھے ابھی عصرہ کے قتل کا الزام ہٹانے کے لیے ایک لمبی لڑائی

لڑنی ہے۔"

"میں نہیں جانتا مجھے کیا کہنا چاہیے۔ لیکن میں نے تمہیں مس کیا تالیہ۔ بہت زیادہ۔"

وہ زخمی سا مسکرا دی۔ "میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کیونکہ کوئی چھ دنوں میں کسی کو کتنا مس کر سکتا ہے؟"

"مگر تم خوش ہو۔ کیوں؟" فاتح نے گھونٹ بھر کے مگ میز پہ رکھ دیا۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر برستی بارش اب تھمنے کو تھی۔

"آپ واقعی مجھے جانتے ہیں۔" وہ دھیرے سے ہنس دی تھی۔ "میں واقعی خوش ہوں' فاتح۔ مجھے بالآخر وہ مل گیا ہے جس کی مجھے عرصے سے تلاش تھی۔"

"تمہاری بے گناہی کا ثبوت؟"

"اونہوں۔ ابھی تک میرے پاس کوئی خاص ثبوت نہیں ہے۔ لیکن میرے پاس کچھ اور ہے۔" وہ مبہم سا مسکرا کے کہتی اٹھی۔ "میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ ہم ملتے رہیں گے۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ آپ اتنے عرصے بعد بھی نہیں بدلے۔ آپ آج بھی مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"اور میں خوش ہوں کیونکہ تم خوش ہو۔ میں ریلیف محسوس کر رہا ہوں۔ تمہیں اس اطمینان اور بہادری کے ساتھ ان الزامات کا مقابلہ کرتے دیکھ کر۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں تمہیں اس معاملے سے نکال لوں گا۔ لیکن اب مجھے نہیں لگتا کہ تالیہ مراد کو میری مدد کی ضرورت ہے۔"

"جو مجھے آتا ہے وہ میری جان ہمیشہ بچاتا رہے گا۔" اس نے سر کو تعظیماً جھکایا۔ پھر اطراف میں اس پر تعیش آفس کو دیکھا۔

"یہ عہدہ پا کے کیسا لگتا ہے' فاتح؟ سوری میں آپ کو داتو سری' تو انکو یا یانگ دی امان بر حرمت وغیرہ نہیں کہہ سکوں گی۔"

"میں مائنڈ نہیں کروں گا۔" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ "اور یہ گفتگو کسی اور وقت کے لیے سہی۔ لیکن کیا تم مجھے نہیں بتاؤ گی کہ تم خوش کیوں ہو؟"

"آپ جان جائیں گے۔" وہ مبہم سا مسکرا کے کہتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ نہ کوئی گلہ' نہ قسمت کی ستم ظریفی کا تذکرہ۔ وہ چھ دن بعد ملے تھے۔ اور وہ ویسا ہی تھا۔

وہ چھ سال بعد ملے تھے۔ اور وہ ویسی ہی تھی۔

ایک دفعہ پھر دونوں نے ایک دوسرے کی زندگی میں اپنی موجودگی کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا۔ ایک دفعہ پھر وہ مشکل گفتگو ان کے درمیان آڑے آ گئی تھی۔

وہ ان اونچے دروازوں سے نکلی تو ہال کے پار دروازے کے سامنے اشعر محمود کھڑا تھا۔ تھری پیس میں نک سک سے تیار' وہ تندی سے اسے گھورے جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کے تالیہ کھلے دل سے مسکرائی اور اس کی طرف آئی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" وہ ماتھے پہ شکنیں ڈال کے بولا۔

"مجھے پردھان منتری نے بلایا تھا۔ آپ کو اعتراض ہے کیا' ایش؟" ابرو اٹھا کے پوچھا۔

اشعر نے ایک کامن روم کی طرف اشارہ کیا اور خود اس طرف بڑھ گیا۔ وہ پیچھے آئی۔ اندر آ کے اس نے دروازہ بند کیا اور اس کی طرف گھوما۔

"میں نے سنا ہے پولیس کو ایک کنٹینر ملا ہے۔ اور فنگر پرنٹس وغیرہ بھی۔ ان کا میچ ڈھونڈا جا رہا ہے۔" وہ دبی آواز میں غرایا۔ تالیہ نے مسکرا کے شانے اچکائے۔

"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں نے اپنے ماسک پہنے اغوا کار کو زخمی کیا تھا اور اس نے مجھے۔ معلوم نہیں ماسک کے پیچھے کون تھا لیکن پولیس یہ ضرور دیکھے گی کہ کس کی ناک پہ زخم کا نشان ہے۔" اس نے اشعر کی ناک کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ پلیز۔" وہ غصے سے بولا۔ "تم نے مجھے فریم کرنے کے لیے بہت ہی ظاہری ثبوت چھوڑے ہیں۔ اگر میں اغوا کار ہوتا تو اس کنٹینر کو صاف کیوں

نہ کرتا؟ سارے ثبوت وہیں کیوں چھوڑ دیتا؟"

"جیسے میں عصرہ کی قاتل ہوتی تو اپنے ہی کارڈ سے کیک کیوں آرڈر کرتی؟"

اشعر ایک دم بالکل لاجواب ہو گیا۔

"یہی مسئلہ ہے حقیقی دنیا کی پولیس کا' اشعر۔ وہ صرف ظاہری ثبوتوں کا پیچھا کرتی ہے۔ اگر آپ کے فنگر پرنٹس اس کنٹینر پہ مل گئے نا' اشعر... تو آپ بڑی مشکل میں پھنسنے جا رہے ہیں۔"

"تم۔" مارے ضبط کے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو میں نے تمہیں اغوا نہیں کیا تھا۔ پھر تم ایسا کیوں کر رہی ہو؟"

"اور آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ عصرہ کا قتل میں نے نہیں کیا تھا۔ میں بے قصور تھی۔ میں اتنے بے وقوفانہ ثبوت کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ لیکن مجھ سے تنفر کے باعث آپ نے سب سے پہلے مجھے الزام دیا۔ آپ کی گواہی نے مجھے مفرور ملزم بنایا۔ تو اگر میں ٹرائل کا سامنا کرنے جا رہی ہوں تو میں اکیلی کیوں جاؤں؟ آپ آرام سے کیوں بیٹھیں؟"

"میں اس کیس کو ایک چٹکی میں اپنے اوپر سے ختم کروا دوں گا۔ سمجھیں آپ۔" اس نے چٹکی بجا کے کہا اور مڑ گیا۔

"یعنی ایک دفعہ پھر اشعر محمود خود کو تالیہ کے خلاف اتنا مصروف کر لے گا کہ اسے کچھ اور نظر ہی نہیں آئے گا۔" وہ بڑبڑائی تھی۔

اشعر محمود جاتے جاتے رکا۔ پھر آہستہ سے [illegible]۔

"مصروف؟" اسے اتنا معلوم تھا کہ تالیہ بے مصرف کوئی بات نہیں کہا کرتی تھی۔

"ہاں نا۔ مصروف۔ آپ تالیہ مراد کو گرفتار کرنے میں اتنے مصروف تھے کہ لوٹری پبلک یا میوزیم کی طرف سے آنے والی کالز پہ آپ نے توجہ نہیں دی۔"

"کیسی کالز؟"

"یہی تو مسئلہ ہے۔ آپ جیسے لوگ جب حکومت میں آتے ہیں تو ہر دو ماہ بعد اپنا نمبر بدل لیتے ہیں تا کہ عام عوام کی رسائی سے دور ہو جائیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی۔ "اس لیے لوٹری والوں کا آپ سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ وہ عصرہ کی وصیت پہ عمل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن چونکہ آپ وصیت کے ایگزیکیوٹر نہیں تھے۔ اس لیے انہوں نے آپ کو زیادہ تنگ نہیں کیا اور وصیت پہ عمل درآمد کروا دیا۔"

"اوہ۔ وہ اینٹیک نوادرات؟" اشعر نے گہری سانس لی۔ "مجھے معلوم ہوا تھا کہ میوزیم وہ آپ کے حوالے کرنے جا رہا ہے۔ پہلی بات' ان کی کوئی خاص ویلیو نہیں ہے۔ دوسری بات' اس وصیت کے خلاف میرا ایک کلیم چٹکی میں (چٹکی بجائی) اس کو منسوخ کروا سکتا ہے۔ وہ اینٹیک میرے خاندان کی ملکیت تھے۔ اور میرے ہی رہیں گے۔"

"وہ اینٹیک جس میوزیم کے پاس امانت تھے' انہوں نے کل وہ مجھے دے دیے تھے کیونکہ وصیت کے مطابق ان پہ میرا حق تھا۔"

"سو؟ میں ابھی عدالت میں کلیم جمع کروا دوں گا اور وہ مجھے واپس مل جائیں گے۔ اگر آپ نے وہ بیچ دیے تو آپ کو ان کی قیمت ادا کرنی ہو گی۔"

تالیہ لمحے بھر کو چپ ہوئی۔ پھر سر ہلایا۔ "آپ درست کہہ رہے ہیں۔ آپ سول کلیم داخل کرا کے انہیں واپس لے سکتے ہیں۔ جب میں واپس آئی تھی تو سب سے بڑا عذاب مجھے یہ اینٹیک لگے تھے جو عصرہ نے میرے گلے ڈال دیے تھے۔ لیکن پھر مجھے احمد نظام نے ایسی بات بتائی جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ وقت مجھ پہ بہت مہربان رہا ہے۔"

"کیا؟" وہ پتلیاں سکوڑے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ کہ ملائیشیا میں سول مقدمے کا ایک statue of limitation ہوتا ہے۔ آپ وکیل ہیں۔ آپ کو یاد ہے کتنی میعاد تک آپ کسی کے خلاف سول مقدمہ دائر کر سکتے ہیں؟"

اشعر محمود کی رنگت ایک دم سفید پڑی۔ اس نے

تیزی سے سیل فون نکالا۔ مگر وہ مسکرا کے کہے جا رہی تھی۔

"میں نے احمد نظام سے پوچھا کہ چھ سال میں کیا بدل جاتا ہے۔ تو انہوں نے بتایا کہ آپ ملائیشیا میں پورے چھ سال تک سول مقدمہ دائر کر سکتے ہیں۔ اگر کسی معاملے کو چھ سال گزر چکے ہوں تو آپ مقدمہ نہیں دائر کر سکتے۔ اب آپ کے سول کلیم کی میعاد ختم ہو چکی ہے۔ عدالت آج وہ نوادرات مجھے دے دے گی اور آپ کچھ نہیں کر سکتے۔" پھر وہ رکی اور محظوظ انداز میں اضافہ کیا۔

"جب عصرہ نے ان کو میرے نام لگایا تھا تو ان کو نہیں معلوم تھا کہ یہ نوادرات جن اصل شہ پاروں کا حصہ ہیں، وہ صدیوں سے زمین میں دفن ہیں۔ اس وقت ان کی کوئی ویلیو نہیں تھی۔ لیکن چند ماہ پہلے ہانگ کانگ میں کھدائی کے دوران ملاکہ کی تہذیب کے چند ایسے نوادرات ملے تھے جنہوں نے عصرہ کے ان بے کار نامکمل ٹکڑوں کی اہمیت آسمان پہ پہنچا دی ہے۔ لیکن آپ کو علم کیوں نہ ہو سکا؟"

اشعر بس ششدر سا اسے سنے جا رہا تھا۔

"تین باتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو میوزیم کے کیوریٹرز نے یہ بات آپ سے چھپائی کیونکہ وہ انہیں اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ یا آپ اپنی سیاست میں اتنے مصروف رہے کہ آپ کو معلوم نہیں ہو سکا کہ غیر ملکی کلیکٹر ان نوادرات کی قیمت کئی ملین ڈالرز تک پہنچا چکے ہیں۔ یا آپ کو ان کی اصل قیمت معلوم تھی لیکن آپ انہیں فاتح کی فیملی کو نہیں دینا چاہتے تھے ورنہ کب کا کلیم داخل کروا چکے ہوتے۔ لیکن مجھے....." دھیرے سے اپنے سینے پہ انگلی سے دستک دی۔

"مجھے آرٹ کی پہچان بھی ہے.....اور میرے آرٹ کی دنیا سے روابط بھی ہیں۔ وہ نوادرات اب صرف میرے ہیں۔ "وقت" کو معلوم تھا کہ ان کی تب اہمیت نہیں ہے۔ "وقت" نے ان کو قیمتی بنایا، اور مجھے اتنی مہلت دی کہ آپ ان کو مجھ سے چھین نہ پائیں۔"

اشعر محمود تیزی سے موبائل پہ نمبر ملا رہا تھا۔

"میں تمہیں دیکھ لوں گا۔ میں سول کلیم داخل کر کے دکھاؤں گا۔"

"یہ کام آپ کو بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔ لیکن آپ نے جان بوجھ کے نہیں کیا۔ میرا خیال ہے آپ کو ان کی اہمیت معلوم تھی۔ آپ صرف انہیں فاتح کے بچوں کو نہیں دینا چاہتے تھے۔"

وہ بکتا جھکتا، فون کان سے لگاتا تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کی رنگت سرخ پڑ رہی تھی اور حواس اڑتے جا رہے تھے۔

تالیہ مسکرائی اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

اس کو بالآخر وہ خزانہ مل چکا تھا جس کی اسے برسوں سے تلاش تھی۔

وقت اس پہ بہت مہربان رہا تھا۔

☆☆☆

جھیل کا پانی سرما کی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ دو بطخیں سست روی سے تیرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ گاہے بگاہے وہ اپنی گردنیں پانی میں ڈالتیں، اور پھر سر دائیں بائیں ہلاتے ہوئے اسے باہر نکالتیں۔ ارد گرد چھینٹے اڑتے جاتے۔ البتہ جھیل کنارے رکھا واحد بنچ ان کے چھینٹوں کی پہنچ سے دور تھا۔

بنچ پہ ایڈم بن محمد بیٹھا تھا۔ سفید ہائی نیک جرسی پہنے، وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے موبائل پہ کچھ دیکھ رہا تھا۔ ایڈم کی پشت پہ تالیہ بنا آواز کے قدم اٹھاتی آئی۔ دھیرے سے سفید ہیٹ اتارا اور اس کے ساتھ بنچ پہ رکھا تو وہ چونکا اور پلٹ کے دیکھا۔ پھر رسمی سا مسکرایا۔

"آپ کا ٹیکسٹ کافی دلچسپ تھا۔ آپ نے لکھا کہ آپ کے ہاتھ خزانہ لگ گیا ہے۔"

"ہوں۔" وہ مبہم سا مسکراتی ہوئی آگے آئی اور اس کے ساتھ بیٹھی۔ دونوں کا چہرہ اب جھیل کی طرف تھا اور ان کے درمیان سفید ہیٹ رکھا تھا۔

''مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آج عصرہ محمود کے وصیت کردہ نوادرات آپ کو تفویض کر دیے گئے ہیں۔''

تالیہ نے گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ اس کی مسکراتی آنکھوں میں ڈوبتے سورج کا عکس تھا۔

''اپنی معلومات اپ ڈیٹ کرلیں۔ میں نوٹری پبلک سے آرہی ہوں۔ نہ صرف نوادرات مجھے مل گئے ہیں بلکہ میں نے انہیں موقع پہ فروخت بھی کر دیا ہے۔''

''اتنی جلدی گاہک کیسے مل گئے آپ کو؟''

''میں اتنے دن سے گاہک ہی تو تلاش کر رہی تھی۔ تاکہ وصیت پہ عمل درآمد ہوتے ہی سیل مکمل کر دوں۔ مجھے میری رقم مل چکی ہے اور نوادرات اپنے نئے مالکوں کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ اب مجھے ان کے چوری ہونے کا ڈر بھی نہیں ہے۔''

''دلچسپ۔ چھ سال کی قانونی میعاد نے آپ کو بچالیا۔ کیا آپ اسی لیے چھ سال بعد آئی ہیں تاکہ آپ ان نوادرات کو حاصل کرلیں؟'' ایڈم نے نوٹ بک نکالی اور گھٹنے پہ اسے رکھ کے کچھ لکھنے لگا۔

''میں جانتی تھی آپ یہ سوچیں گے۔ بلکہ عدالت بھی یہ سوچے گی۔ احمد نظام نے بھی یہی کہا تھا لیکن مجھے پروا نہیں۔ میں بس یہ چاہتی تھی کہ اشعر محمود کو اس بارے میں کم سے کم معلوم ہو۔ اور ایسا ہی ہوا۔ معلوم ہونے کے باوجود بھی وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا لیکن ایسے مزا نہ آتا۔'' اب وہ مسکرا کے جھیل کے پانی کو دیکھ رہی تھی۔

''کیا میں اس وقت کوالالمپور کی امیر ترین خواتین میں سے ایک کے ساتھ بیٹھا ہوں؟'' وہ مسکرا کے پوچھنے لگا۔

''میں آج فاتح سے ملی۔'' وہ اس کا سوال نظر نداز کر کے دور تیرتی ہوئی بطخوں کو دیکھ کے بولی۔

''ہوں۔ گڈ۔ اور کیا نتیجہ نکلا اس ملاقات کا؟'' وہ لکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''ان کی زندگی میں میری جگہ نہیں ہے۔'' وہ اداسی سے بولی۔ ''حالانکہ وہ میرے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آئے۔ وہ مجھے دیکھ کے خوش بھی ہوئے۔ لیکن ایڈم..... انسان کو پتا بھی نہیں چلتا اور اس کی جگہ کسی کی زندگی سے وقت کے ساتھ کتنی آسانی سے ختم ہو جاتی ہے نا۔''

''کیا میں یہ بھی لکھ دوں؟'' اس نے رسمی انداز میں پوچھا۔ وہ چہرہ موڑ کے بس اس کو دیکھنے لگی۔

''آپ ہماری زندگی کا اتنا اہم حصہ تھے اور اب آپ پوچھ رہے ہیں کہ کیا آپ یہ لکھ دیں؟'' اس کے انداز میں گلہ تھا۔ ایڈم نے گہری سانس لی۔

''مس مراد..... میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میری یادداشت میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔'' اس کا چہرہ سپاٹ سا تھا جیسے کسی ایسے اجنبی کا ہوتا ہے جسے کام کے باعث کچھ وقت ایک اجنبی کے ساتھ گزارنا پڑے۔ شائستہ، مہذب، پیشہ ورانہ لیکن اجنبی رویہ۔

''اچھا ہوا آپ کو یاد نہیں ہے۔ ورنہ میرے اور آپ کے درمیان ایک تکلیف دہ یاد تھی جس کے بارے میں ہم کبھی بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔''

''اچھا؟ کیسی یاد؟'' اس کے انداز میں معمولی سی دلچسپی در آئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور جھیل ان کے سامنے پرسکون سی بہتی ان کو تک رہی تھی۔ بطخیں اب تیرتی ہوئی دور جا رہی تھیں۔

تالیہ چند لمحے اس کو دیکھتی رہی، پھر مسکرا کے سر جھٹک دیا۔ ''کچھ نہیں۔''

''ظاہر ہے اب میں اصرار کروں گا کہ آپ مجھے بتائیں۔''

''میری وجہ سے آپ کے چوزے کھوئے تھے نا۔ آپ مجھے ان کے لیے مورد الزام ٹھہراتے تھے۔'' وہ نم آنکھوں سے مسکرا کے بولی۔ تو ایڈم نے پتلیاں سکوڑ کے اس کا چہرہ دیکھا۔

''آپ نے یہ بات گھڑی ہے۔ ورنہ میں اپنے چوزوں کی موت پہ یوں کسی کو مورد الزام نہیں

ٹھہرا سکتا۔" وہ ہلکا سا ہنس کے واپس ڈائری پہ کچھ لکھنے لگا۔

"بس..... یہی چیز..... اسی کا میں انتظار کر رہی تھی۔" وہ تیزی سے اس کی طرف گھومی تو ایڈم نے سوالیہ نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ شہزادی کی مسکراتی آنکھوں میں چمک تھی۔

"کیا؟"

"میں نے کب کہا کہ چوزے مر گئے تھے؟ میں نے کہا کہ وہ کھو گئے تھے۔"

ایڈم کا قلم چلاتا ہاتھ رک گیا۔ وہ ٹھہر کے اسے دیکھنے لگا۔

جھیل کا پانی بھی ساکت ہو گیا اور بطخیں مڑ کے انہیں دیکھنے لگیں۔

"آپ نے خود ہی مجھے اس دن بتایا تھا کہ....."

وہ الجھ کے کہنے لگا لیکن تالیہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"بس کر دو ایڈم..... کتنی اداکاری کرو گے؟ مجھے معلوم ہے تمہیں کچھ نہیں بھولا۔"

وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کے بولی۔

وقت ان کے آس پاس ہی ٹھہر گیا۔

"مجھے پہلے دن' پہلے لمحے سے معلوم ہے کہ تمہیں سب یاد ہے۔ میں نے تمہیں تمہارا وقت دیا۔ اب بس کر دو۔"

ایڈم نے قلم کا ڈھکن چڑھایا' اسے جیب میں رکھا اور نوٹ بک کو پینٹ کی جیب میں ڈالا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ تالیہ نے گردن اٹھا کے اسے دیکھا۔

"تم اچھی اداکاری کر لیتے ہو لیکن میں تمہیں جانتی ہوں۔ تم نے بابا سے کہا تھا کہ اب ایڈم بن محمد اپنے لیے جیے گا۔ جب میں نے تمہاری یادداشت کا سنا تو جان گئی کہ تم نے وہ ناٹک اسی لیے رچایا ہے۔ تمہیں دیکھ کے یقین بھی ہو گیا۔" وہ گردن اٹھا کے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وہ جھیل کو دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں یہ لگتا ہے کہ تم مجھ سے ناراض ہو؟ اسی لیے صرف پروفیشنل وجہ سے میرے ساتھ کام کر رہے ہو؟ تم ناراض ہو کہ میں نے اتنے برس رابطہ کیوں نہیں کیا؟ غلط۔ تم خود سے جھوٹ بول رہے ہو۔ اگر تم مجھ سے ناراض ہوتے تو میری اتنی مدد نہ کرتے۔"

ایڈم نے چہرہ موڑ کے اسے دیکھا۔ اس کی رنگت دہکتی گلابی ہو چکی تھی اور آنکھوں میں سرخی تھی۔

"آپ کیا سمجھتی ہیں؟ آپ اتنے سال بعد کسی کی زندگی میں ایک دفعہ پھر سے وارد ہو جائیں گی اور وہاں آپ کے لیے جگہ ہو گی؟ سب کچھ پہلے جیسے ہو جائے گا؟ نہیں' چے تالیہ۔ آپ نے پیچھے رہنے کو خود چنا تھا۔ آپ نے مجھے چھوڑ دینے کو خود چنا تھا۔ میری زندگی میں اب آپ کی جگہ نہیں بچی۔" یہ کہہ کے اس نے قدم آگے بڑھا دیے۔

وہ چپ چاپ اسے دور جھیل کی طرف جاتے دیکھے گئی۔ وہ پانی کے قریب جا کے کھڑا ہو گیا تھا۔ پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے وہ اب پانی کے اوپر ڈوبتے سورج کو دیکھ رہا تھا۔

تالیہ نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ اسے ایڈم کو پورے دس منٹ کے لیے اکیلا چھوڑنا تھا۔ اس کا غصہ اور شرمندگی دس منٹ میں جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گی۔ وہ جانتی تھی۔

اس نے ہیٹ سر پہ رکھا' اور گھڑی کو دیکھتے ہوئے ایک ایک سیکنڈ گننے لگی۔

چھ سال ہوں یا چھ دن' تالیہ مراد ایڈم بن محمد کے ہر انداز سے واقف تھی۔

یہ سارے کون گیمز اسی نے ایڈم کو سکھائے تھے۔ استاد کو کون مات دے سکا ہے بھلا؟

☆☆☆

وان فاتح کی رہائش گاہ کے مرکزی لاؤنج میں اس وقت ملازموں کی ایسی چہل پہل پھیلی تھی جیسی کسی مہمان کی آمد کے وقت ہوتی ہے۔ کوئی گیسٹ روم سیٹ کرنے جا رہا تھا۔ تو کوئی میشا کے ٹرالی بیگز

ہے ایک طرف جارہا تھا۔
''یہاں آپ بالکل محفوظ ہوں گی۔کوئی آپ کو
سان نہیں پہنچا سکے گا'مسز میشا۔''
وسط لاؤنج میں کھڑی جولیانہ بہت اپنائیت
ے میشا کا ہاتھ تھامے کہہ رہی تھی۔ میشا اور اس کی
ں کے چہرے بجھے بجھے تھے۔زرد' خوف اور بے
ی کا شکار چہرے۔
''مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا یوں'
لی۔'' میشا نے لاؤنج کی میز پہ ہینڈ بیگ رکھتے
ئے یاسیت سے کہا۔''ایسے خود کو کسی کے اوپر بوجھ
نا غیر مناسب ہے۔'' وہ شدید غیر آرام دہ لگتی تھی۔
''کم آن مسز میشا.... آپ اتنے برسوں سے
ری فیملی کا حصہ ہیں۔ جب تک وہ گرفتار نہیں ہوتا'
پ یہاں محفوظ رہیں گی۔''
''ہاں لیکن میں نے داتو سری کو بتا دیا تھا کہ یہ
نجمنٹ صرف اس کے گرفتار ہونے تک ہے۔ جیسے
ا وہ پکڑا گیا' ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔''
''جی مسز میشا۔ اور آپ اتنی شرمندہ نہ ہوں۔
ویسے بھی ڈیڈ کا آئیڈیا تھا کہ آپ یہاں رہیں۔
نہ آپ تو غیر ملکی پناہ کے لیے اپلائی کرنے کا کہہ
ی تھیں۔ بھاگنا اس مسئلے کا حل تو نہیں ہے۔''
میشا نرمی سے مسکرا دی۔''تم کتنی سمجھدار ہو گئی ہو
لی۔'' اور پھر گردن اٹھا کے اس محل نما گھر کی اونچی
ت کو دیکھا۔
''مجھے برا اس لیے لگ رہا ہے کیونکہ میں نے
ں دفعہ تمہاری فیملی سے تعلق کا فائدہ اٹھایا ہے۔ اور
رے ضمیر پہ یہ چیز بہت بوجھ دے رہی ہے۔ ان
ء اللہ میں اس فیور کو ضرور لوٹاؤں گی۔'' وہ مسکرا کے
ں تو جولیانہ بھی مسکرا دی۔
''میں آپ کو آپ کا روم دکھاتی ہوں۔
بائیں۔'' وہ خوشی خوشی ان دونوں کو لیے راہداری
طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

تالیہ نے گھڑی دیکھتے ہوئے گنتی مکمل کی اور
بنچ سے اٹھی۔ وہ ابھی تک پانی کے قریب کھڑا تھا۔
تالیہ کی جانب پشت تھی۔ وہ اس سے چند قدم پیچھے
رکی اور کھنکھاری۔
''اگر تم اتنے خفا ہو تو ابھی تک یہاں کیوں
ہو؟''
جواب میں اس نے خفگی سے تالیہ کو دیکھا اور
جانے کے لیے تیزی سے مڑا۔ وہ سرعت سے اس
کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ایڈم کا راستہ رک گیا۔
''تم مجھ سے خفا نہیں ہو' مان لو۔'' وہ زور دے
کر بولی۔
''مجھے آپ سے خفا ہونے کا حق بھی نہیں
ہے۔'' وہ اتنی ہی تندی سے بولا۔ اس کا چہرہ اب کسی
اجنبی کا چہرہ نہیں تھا۔ یہ ایڈم تھا۔ پرانا ایڈم۔
''تم سمجھتے ہو میں جان بوجھ کے پیچھے رہ گئی؟
یہی سوال میں تم سے پوچھوں اگر؟ تم میرے بغیر
کیوں گئے؟ میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟ دروازہ کیوں
بند کر دیا؟ جانتے ہو میں چھ سال کے لیے وقت کے
دروازے میں مقید ہو گئی تھی۔''
وہ اتنی درشتی سے بولی کہ ایڈم کے تاثرات
بدلے۔ ماتھے کی سلوٹیں غائب ہوئیں۔
''واٹ؟ آپ چھ سال کے لیے قید ہو گئی
تھیں؟''
''آف کورس نہیں۔ یہ تو میں نے تمہارا موڈ
درست کرنے کے لیے کہا تھا۔'' وہ ہلکی سی ہنسی۔ ایڈم
نے بھنویں بھینچ کے اسے دیکھا۔ وہ سنجیدہ ہوئی۔
''پچھلے چھ سال میرے لیے نہیں گزرے'
ایڈم۔ میرے لیے صرف ایک لمحہ گزرا تھا۔ دروازہ
بند ہوا' میں نے کھولا اور دیکھا تو آگے 2023 کا
ملا کہ تھا۔ وقت آگے بڑھ گیا تھا اور میں پیچھے رہ گئی
تھی۔''
ایڈم کے شانے ڈھلک گئے۔ وہ بس اچنبھے
سے اسے دیکھے گیا۔
''سوچ رہے ہو کہ اب کس بات پہ خفگی ظاہر
کروں؟ جبکہ تمہارے پاس وجہ ہی نہیں بچی۔

''مجھے کیا معلوم کہ آپ سچ کہہ رہی ہیں یا نہیں۔'' اس نے آواز کو خفا بنانے کی کوشش کی۔ ماتھے کو پھر سے شکن آلود کرنا چاہا۔

''آؤ.....کافی پیتے ہیں۔'' اس نے ہیٹ ترچھا کیا' اور اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ اسی خفا شکل کے ساتھ اس کے ساتھ چل دیا۔

وہاں گھاس پہ ایک واکنگ ٹریک بنا تھا۔ دونوں اس پہ چلتے چلتے آگے آئے۔ درختوں کے بیچ خاموشی سے چند موڑ کاٹے یہاں تک کے سوپ اور کافی کے کارٹ دکھائی دینے لگے۔

وہ دونوں ایک کارٹ کے پاس رکے۔ تالیہ نے ہیٹ اتار کے کارٹ کے ایک ہک سے لٹکایا اور سیلز مین کو دو نوٹ پکڑائے۔ کافی کا آرڈر دینے کے بعد وہ اس کی طرف گھومی۔

''کیسے گزرے تمہارے چھ سال؟''

''وقت آپ کے لیے واقعی نہیں گزرا؟'' وہ ابھی تک مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تالیہ نے کندھے اچکائے۔

''میں ایک دفعہ تمہیں بتا چکی ہوں اور تمہیں یقین بھی آچکا ہے۔ اب تم بتاؤ کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ یادداشت والا ناٹک؟''

ایڈم نے جیبوں میں ہاتھ ڈالے کندھے جھٹکے اور دور نظر آتی جھیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''یہ آسان تھا۔''

''جھوٹ بولنا؟''

''ماضی سے بھاگنا۔ چاہے آپ ہمارے ساتھ آتیں' چاہے نہ آتیں' میں نے مراد راجہ کی قید میں یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ میں یادداشت کھونے کی اداکاری کروں گا۔ مجھے آپ کی کہانی سے نکلنا تھا۔ اپنی کہانی ازسرنو لکھنی تھی۔ اپنے آپ کو اس سب سے نکالنا تھا۔''

''کیا اس طرح تکلیف کم ہوجاتی ہے؟''

''پتا نہیں۔'' اس نے سیلز مین سے کافی کے کپ پکڑے۔ پھر ایک کپ تالیہ کو تھمایا۔ دونوں ایک دفعہ پھر پتھریلی روش پہ چلنے لگے۔ سورج اب ڈوب رہا تھا اور جامنی اندھیرا چھا رہا تھا۔

''لیکن یوں حالات آسان ہوگئے۔ پولیس نے آپ کی وجہ سے تنگ کرنا چھوڑ دیا۔ وہ لوگ جو میری جان کے دشمن بنے ہوئے تھے' انہوں نے بھی میرا پیچھا چھوڑ دیا۔ میری یادداشت کھونے کی کہانی نے مجھے مزید پاپولر کردیا۔ مجھے ایک شو مل گیا جہاں میں اس بارے میں بات کیا کرتا تھا۔ کہ کیسے میں نیند سے جاگا تو میں ایک سیلیبریٹی اور دو کتابوں کا مصنف تھا۔ چند لوگوں نے اس بات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ میں نے انہیں فائدہ اٹھانے دیا پھر ان کی دھوکہ دہی کو ثبوتوں کے ساتھ بے نقاب کردیا۔ یوں میرا شو مزید ترقی کرگیا۔ پولیس' میڈیا' عوام' سب نے میری بات مان لی۔''

''اور فاتح؟''

''انہوں نے مجھ سے تعلق ختم کرلیا اور میں نے ان سے۔ گو کہ مجھے یقین ہے ان کو کبھی یقین نہیں آیا۔ لیکن وہ اس بات کا اعتراف نہیں کریں گے۔''

''اور کیسا لگا یہ سارا کون گیم کھیل کے؟''

''کلین سلیٹ کسے بری لگتی ہے؟ خود کو ایسے ظاہر کرنا جیسے نیا نیا دنیا میں آیا ہو۔ یعنی کہ شہرت کی دنیا میں۔ میں نے ازسرنو اپنی کہانی لکھی۔ نئے دوست بنائے۔ سب کچھ نئے سرے سے کیا۔ لیکن سکون....وہ نہیں ملا۔ شاید وہ انسان کے لیے اس دنیا میں لکھا ہی نہیں گیا۔'' وہ کافی پیتے ہوئے قدم اٹھا رہا تھا۔

''مجھے پہلے ہی دن بتا کیوں نہیں دیا؟ اوہ اور میں جانتی ہوں جب میں تمہارے گھر آئی تھی تو تم نے کیا کیا تھا۔''

''کیا کیا تھا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تم نے راہداری میں لگے کیمرے سے مجھے دیکھ لیا تھا۔ تم نے اپنی سیکرٹری کو کال کی۔ اسے کہا کہ وہ لفٹ سے اوپر آئے اور ہاتھ میں موجود چیزیں گرا دے۔ پھر تم باہر نکلو گے اور اس سے اونچی آواز میں

باتیں کرو گے۔ تم چاہتے تھے کہ میں وہ سب سن کے تمہاری یادداشت والی کہانی پہ یقین کرلوں۔"
"ظاہر ہے میں جانتا تھا کہ آپ چھپ کے گفتگو ضرور سنیں گی۔ کچھ عادتیں کبھی نہیں بدلتیں۔"
ایڈم نے گہری سانس لی۔ پھر گھونٹ بھرتے ہوئے اس کو دیکھا۔ وہ اب پہلے سے بہتر لگ رہا تھا۔
"کیا ایک لمحے کے لیے بھی آپ کو یقین نہیں آیا تھا میری کہانی پہ؟"
"اونہوں۔ جب میں نے سنا تھا تو میں چونکی تھی۔ میرا دل زور سے ڈوبا تھا۔ پھر میں نے تمہارا ایک انٹرویو نکالا اور دیکھا کہ تم کہاں بیٹھے تھے۔ تم اپنی لائبریری میں بیٹھے تھے۔ اور تم نے اپنی لائبریری کے ریکس کو بالکل اسی طرح سیٹ کیا تھا جیسے بابا کے کتب خانے کو تم نے اپنی نگرانی میں سیٹ کروایا تھا۔ وہی سیٹنگ' وہی اونچے نیچے ریک اور ان کے اتنے خانے۔ حالانکہ تمہاری لائبریری ماڈرن طرز پہ بنی تھی۔ بظاہر قدیم ملاکہ سے بالکل مختلف لیکن جیسے ہی میں نے وہ ریک دیکھے مجھے معلوم ہوگیا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"
"اوہ نو۔ مجھے کتابوں نے پکڑوا دیا۔" اس نے افسوس سے سر جھٹکا۔
"لیکن ہوسکتا ہے مجھے وہ کتب خانہ خواب میں نظر آتا ہو۔"
"تب تم لائبریری کو قدیم لک دیتے۔ تم نے اسے جدید لُک دی تھی۔" اس نے یاد دلایا۔ "اور تم نے اداکاری بھی اچھی کی۔ جنگل کے خوابوں کا تذکرہ.....وغیرہ وغیرہ.... لیکن مجھے کبھی یقین ہی نہیں آیا کہ تم سچ بول رہے ہو۔"
"پھر بھی آپ نے ظاہر کیا کہ آپ نے میرا یقین کرلیا ہے۔ وقت کے سوال حل کرلو ایڈم وغیرہ وغیرہ....." ایڈم نے مسکرا کے سر جھٹکا۔ اس کی شرمندگی کم ہوتی جارہی تھی۔ "یا شاید آپ مجھے جانتی تھیں۔"
چند لمحے تک وہ دونوں خاموشی سے واک کرتے رہے۔ پھر ایڈم نے پوچھا۔
"داتن سے ملاقات ہوئی آپ کی؟"
"نہیں۔ وہ کہاں ہے؟"
"معلوم نہیں۔ انہوں نے پہلے سال مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ میں نے پہچاننے سے انکار کیا تو دوبارہ رابطہ نہیں کیا۔" وہ مغموم لہجے سے بولا۔ پھر چونکا۔ اور رک گیا۔ تالیہ بھی ساتھ ہی رکی۔
"ایک منٹ۔ آپ نے کہا کہ میں میشا کو جانتا ہوں۔ ہم مل چکے ہیں اور مجھے یاد نہیں ہے۔ اب چونکہ آپ جانتی ہیں کہ مجھے سب یاد ہے تو بتائیں۔ میں اس عورت سے کبھی نہیں ملا۔"
تالیہ نے افسوس سے اس کو دیکھ کے نفی میں سر ہلایا۔ "تم نے واقعی اس کو نہیں پہچانا؟"
"نہیں۔ میں اسے کیسے پہچان سکتا ہوں؟" وہ واقعتاً الجھ کے بولا۔
"اوہ ایڈم۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔
"تم اس سے ملے تھے۔ ساڑھے چھ سال پہلے۔ عصرہ کی گیلری میں۔ وہ ایک پینٹنگ خریدنے آئی تھی اور تم نے اسے راہداری میں روک کے کچھ کہا تھا۔"
"میں نے اسے کیا کہا تھا؟"
"یہی کہ وہ تنکو کائل کی ملازمہ ہے۔"
ایڈم بن محمد بالکل ساکت ہوگیا۔ "میں نے وہ آپ سے کہا تھا۔"
"نہیں۔ تم نے وہ ایک آرٹسٹ' سوشلائٹ' امیر عورت سے کہا تھا جو کے ایل میں جانی پہچانی تھی۔ جس کے بال سنہرے تھے اور وہ وان فاتح کی فیملی سے تعلقات بنانے کی کوشش کررہی تھی۔"
ایڈم کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ جھیل کنارے سارے پارک میں موت کا سناٹا چھا گیا۔
"میشا تاج کون آرٹسٹ ہے....."
"بالکل۔ وہ کاپی کیٹ ہے۔ اس کی شکل دیکھو۔ چھ سال پہلے میں ایسی لگا کرتی تھی۔ اس کے

بال' اس کے منی کوٹ... ہیٹ.... نگینوں والے زیورات.... آرٹ میں دلچسپی....ایک ظالم اسٹاکر ایلس ہزبینڈ.... اور فاتح کے ایک فیملی ممبر کے ذریعے اس کے گھر میں داخل ہونے کی کوشش....''

''وہ تالیہ مراد ہے۔ وہ چھ سال پہلے کی تالیہ مراد ہے۔'' وہ دم سادھے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اور حیرت ہے تم نے اسے نہیں پہچانا۔ فاتح نے بھی نہیں۔ اتنے برس جو گزر چکے ہیں۔ تم دونوں نے تالیہ کو بھلا دیا۔ لیکن کوئی ہے جس نے تالیہ مراد کو نہیں بھلایا۔ کوئی ہے ایڈم جو ہم تینوں کو جانتا ہے۔ تم نے دیکھا وہ لڑکی کیا فوٹوگراف کرتی ہے؟ سیاہ گھوڑے۔ قدیم قلعوں کے سامنے کھڑے سیاہ گھوڑے۔ وہ فاتح کا گھوڑا تھا قدیم ملاکہ میں۔ کوئی ہے جس نے عین تالیہ مراد کی پروفائل پہ ایک عورت کو تیار کیا ہے اور وان فاتح کی زندگی میں داخل کیا۔''

''وہ کون دومن ہے۔ بیشا تاج ایک کون دومن ہے۔'' ایڈم نے ماتھے کو چھوا۔ وہ ششدر رہ گیا تھا۔

''بالکل۔ اور وہ کون دومن مجھے دیکھ کے پریشان ہو گئی ہے۔ وہ فاتح کے قریب رہ کے جو بھی کرنا چاہ رہی ہے وہ اس میں تیزی لے آئے گی۔ میری موجودگی سے اس کو خطرہ ہے۔''

''آپ جانتی ہیں اسے کس نے بھیجا ہے؟''

''نہیں۔ میں اس عورت کو بھی نہیں جانتی۔ لیکن وہ یا اس کے پیچھے جو بھی ہے' اس نے تالیہ مراد کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے اور اسے ہمارے قدیم ملاکہ کے بارے میں بھی علم ہے۔ اس نے تالیہ کے عکس پہ بیشا کو بنایا ہے۔ وان فاتح نے اس کو اپنے قریب جگہ اس لیے دی ہے کیونکہ وہ اس میں مجھے دیکھتے ہیں اور وہ خود بھی اس بات سے واقف نہیں ہیں۔ مجھے اور تمہیں ایڈم بن محمد' صرف میری بے گناہی نہیں ثابت کرنی بلکہ ہمیں فاتح کو اس عورت سے بھی محفوظ کرنا ہے۔ جو ہمیں کرنا آتا ہے' اس سے ہم نے پھر سے اپنی جان بچانی ہے۔''

اس نے کافی کا گھونٹ بھرا اور روش پہ چلنے لگی۔ ایڈم سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ جانتا تھا تالیہ کے پاس پلان ہوگا۔ تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا تھا۔

☆☆☆

''سفید گھوڑے والی شہزادی''

حالم (نمرہ احمد)

(آخری باب)

اس نے خواب میں دیکھا....

نیم اندھیرے میں ڈوبی گلی ویران پڑی ہے....

اِکا دُکا اسٹریٹ پولز کی روشنی میں چند کچرے کے کین نظر آرہے ہیں....

گلی کے سرے پہ ایک مین ہول کا ڈھکن کھلا ہوا ہے....

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے قریب جاتی ہے....

ڈھکن کے ساتھ کچھ زرد سا چمکتا ہوا نظر آرہا ہے....

تالیہ کے قدم اس کے پاس رکتے ہیں....

وہ جھک کے اس شے کو اٹھاتی ہے....

اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں وہ پتلیاں سکوڑ کے اسے بغور دیکھتی ہے....

وہ سفید رنگ کا نرلا کا لفافہ ہے.... اور اس پہ قدیم جاوی رسم الخط میں تحریر ہے....

''پتری تاشہ بنت مراد کے نام۔''

نیچے شاہی مہر ہے اور خط بھیجنے کی تاریخ۔

پانچ سو تریسٹھ برس پہلے کی تاریخ۔

کسی جانور کے رونے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکراتی ہے۔

وہ چونک کے سر اٹھاتی ہے۔

دور تاریک گلی کے سرے پہ ایک سفید ہرن کھڑا ہے....

اس کی بڑی بڑی سبز آنکھیں تالیہ پہ جمی ہیں....

اس کے منہ سے خون کے قطرے ٹپک رہے

ہیں...

وہ تالیہ کو دیکھتے ہوئے پلٹ جاتا ہے...

وہ اس کے پیچھے جانے لگتی ہے لیکن اس کے قدم زنجیر ہو جاتے ہیں...

ہرن رات کی دھند میں تحلیل ہو جاتا ہے... جیسے کبھی وہاں تھا ہی نہیں...

دھند ہر طرف پھیلنے لگتی ہے... اور...

اس کی آنکھ کھل جاتی ہے...

☆☆☆

صبح کی دودھیا روشنی اس اپارٹمنٹ کے شیشوں سے اندر لونگ روم کو منور کیے ہوئے تھی۔ ایک طرف صوفے رکھے تھے اور دوسری جانب اوپن کچن تھا جہاں اس وقت تالیہ مراد بیٹھی صبح کی چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ مسکرا کے اپنے اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ کو دیکھ رہی تھی۔ لونگ روم کی قد آدم کھڑکیوں سے نیچے سڑک پہ بہتا ٹریفک دکھائی دے رہا تھا۔ ایک نئے دن کا آغاز ہو چکا تھا اور لوگوں کی اکثریت اپنے کاموں کے لیے روانہ ہوتی نظر آرہی تھی۔

تالیہ مراد کے خوابوں کا سلسلہ عرصہ ہوئے تھم چکا تھا۔ لیکن آج وہ جس خواب سے بیدار ہوئی تھی، وہ نہ صرف عجیب تھا بلکہ اس نے طبیعت مکدر کر دی تھی۔ اس کے خواب پھر سے کیوں شروع ہوئے؟ اور یہ ہرن... یہ اس نے پہلے کہاں دیکھا تھا؟ اور وہ خط؟ ان سارے سوالات کے جوابات اس کو شاید کبھی نہیں ملنے تھے۔ لیکن اس مین ہول کو وہ پہچانتی تھی۔ یہ جونکر اسٹریٹ کا مین ہول تھا جو تالیہ مراد کی دو دنیاؤں کے درمیان پل بناتا تھا۔ کیا کسی نے دوسری دنیا سے اس کے لیے خط بھیجا تھا؟

اونہوں۔ اس نے سر جھٹکا اور چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے ذہن بٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ پیروں تک آتے ہلکے جامنی فراک میں ملبوس تھی۔ اور بالوں کو آدھا کیچر میں باندھ رکھا تھا۔ صبح کی مناسبت سے وہ کہیں جانے کے لیے تیار لگتی تھی۔

سفید ہیٹ میز پہ اوندھا رکھا تھا اور ساتھ سنہری چین والا پرس تھا۔ پرس نیلے رنگ کا تھا۔ اس نے چائے پیتے ہوئے پرس پہ دوسرے ہاتھ کی انگلیاں پھیریں اور مسکرا دی۔

ایک زمانہ تھا جب وہ کاغذ پہ ایک محل بناتی تھی۔ اونچا محل۔ نیچے سبزہ زار۔ اور اس کے ساتھ نیلا پانی۔ لیکن سبزہ زار سے محل تک جانے کا راستہ بنانا وہ بھول جاتی تھی۔ اس راستے کو تلاش کرنے میں اسے ایک لمبا وقت لگا تھا۔ اور بالآخر وقت اس پہ مہربان ہو چکا تھا۔

اس کا دھیان خواب سے ہٹ چکا تھا اور وہ وقت کی اس مہربانی کا سوچ رہی تھی جو اس کے ساتھ ہو چکی تھی۔

وقت نے چند عام سے نوادرات کی قیمت بڑھا کے انہیں خزانہ بنا ڈالا تھا۔ اور وقت نے ہی عصرہ کی وصیت منسوخ نہیں ہونے دی تھی۔ تالیہ مراد کو اس کا خزانہ بالآخر مل گیا تھا۔ لیکن اس خزانے کی قیمت بہت بڑی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ سر پہ ہیٹ پہنے اپارٹمنٹ بلڈنگ کی لفٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ ہال وے کی بتیوں میں اس کے جامنی لباس کے سفید پھول چمک رہے تھے۔

ایسے ہی پھول اس جنگل میں ہوتے تھے جہاں شاہی خاندان کی چھوٹی سی لڑکی اپنے بابا کے ساتھ تیر اندازی سیکھنے جایا کرتی تھی۔ وہ لڑکی جو محل سے نکال دی گئی تھی۔ اب وہ ایک غریب لکڑہارے کی بیٹی تھی۔ وہ کندھے پہ چرمی تھیلا اٹھائے، جنگل میں ستاروں کے ذریعے اپنے گھر کا راستہ تلاش کیا کرتی تھی۔ وہ اپنے گاؤں کو بچانے نکلی تھی۔ وقت کے ایک سفر پہ۔

سفید ہیٹ والی خوبصورت لڑکی چہرے پہ مسکراہٹ سجائے اب بلڈنگ کی لابی سے باہر نکل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پہنی انگوٹھیوں کے نگینے دن کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ ایک انگوٹھی میں

بیش قیمت زمرد جڑا تھا۔
ایسے ہی رنگ کی گھاس اس یتیم خانے کے باغ میں اگی تھی جہاں وہ گم صم سی لڑکی تنہا بیٹھے تصویریں بنایا کرتی تھی۔ اونچے محل، سبز گھاس اور نیلے پانی کی تصویریں۔ کبھی نہ مل سکنے والے خوابوں کی تصویریں۔
ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھنے سے پہلے اس نے پرس سے ایک خستہ نوٹ نکالا اور بلڈنگ کے چوکیدار کو تھمایا۔
اس نوٹ نے بہت کچھ یاد کروایا تھا۔ ایسے ہی نوٹوں سے بھرا ایک بیگ تھا جسے اس لڑکی نے ڈرتے ڈرتے ائیرپورٹ پہ کھولا تھا اور اس کی زندگی کی ساری کہانی ہی بدل گئی تھی۔
وہ ایک زرد ٹیکسی کی طرف آئی اور پتا بتا کے پچھلی سیٹ پہ بیٹھی۔ پھر ٹیکسی کا پیلا رنگ دیکھ کے وہ اداسی سے مسکرائی۔ ایسے ہی پیلے سنہری زیورات کو وہ بڈ والی لڑکی کے ایل کی گلیوں میں عورتوں سے ٹکرا کے آگے بڑھتے ہوئے مہارت سے اتار لیا کرتی تھی۔ تھوڑی دور جا کے وہ مٹھی میں دبے سنہری زیور کو اوپر فضا میں بلند کر کے دیکھتی اور مسکراتی تھی۔
ٹیکسی اب شہر کی سڑکوں پہ تیز رفتاری سے گزر رہی تھی۔ ایک دکان کے سامنے گلابی رنگ کے پھولوں کے گملے رکھے تھے۔ ان کا رنگ ایسا گلابی تھا جیسا ملاکہ کی شہزادی کے کامدار لباس کا ہوا کرتا تھا۔ وہ ناخوش سی شہزادی جو وقت کی قید میں محل کے ایک ستون سے دوسرے تک بے چین سی چکر کاٹتی تھی.....
ٹیکسی سگنل پہ رکی تو اس نے دیکھا..... فٹ پاتھ پہ ایک نوجوان کافی کا مگ اور بریف کیس تھامے تیز تیز دوڑتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے مگ کا رنگ تالیہ کے اس مگ جیسا تھا جسے لیے وہ بارش میں فاتح کے پیچھے بھاگا کرتی تھی۔
ٹیکسی پھر سے چل پڑی تو اس نے بند کھڑکی کے شیشے کو دیکھا۔ شیشے کی چمک مصر کے اس دریا جیسی تھی جس کا ایک خوفزدہ اور اداس لڑکی نے بحری کروز پہ سفر کیا تھا۔
ٹیکسی منزل مقصود کے سامنے رکی تو تالیہ سیٹ بیلٹ ہٹا کے باہر نکلی۔ بیلٹ کا رنگ سرمئی تھا۔ ایسا ہی رنگ جونکر اسٹریٹ کی سڑک کا تھا جس کے ایک مین ہول سے چند دن پہلے وہ باہر آئی تھی۔
وقت اسے پورے دائرے میں گھما کے واپس اس کی دنیا میں لے آیا تھا۔ اور اس دنیا کے سارے رنگ آج صرف تالیہ مراد کی کہانی بیان کر رہے تھے۔
آگے کیا ہونے والا تھا..... اسے کچھ خبر نہ تھی۔
اس عمارت کی لابی کی طرف جاتے ہوئے اس نے موبائل اسکرین پہ وقت دیکھا تو سامنے چمکتی نیوز فلیش نے اس کی توجہ کھینچ لی۔
وہاں تالیہ مراد کی عصرہ قتل کیس پہ ملوث ہونے کے بارے میں رپورٹ پیش کی جا رہی تھی۔
تالیہ کے ابرو تن گئے۔ صبح کی تازگی اس کے موڈ سے زائل ہو گئی۔
میڈیا کا اپنا ایک ٹرائل ہوتا ہے۔ اس میں ملزم کو صفائی کا موقع نہیں دیا جاتا۔ سوشل اور مین اسٹریم میڈیا... دونوں جگہوں پہ اس وقت تالیہ مراد کے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔ عصرہ محمود کی وصیت والی خبر بھی ان کے ہاتھ لگ چکی تھی۔ اور تالیہ مراد کے ہاتھ لگا خزانہ اسے مزید مجرم ثابت کر رہا تھا۔ وہ سر جھکائے، افسوس سے فون اسکرین پہ انگلی پھیرتی اپنے بارے میں منفی کمنٹس پڑھتی رہی۔
اس خزانے کی ایک بھاری قیمت اس نے ادا کی تھی۔ لیکن مفت میں بھی کبھی کچھ ملا ہے کیا؟ یہ آخری جنگ بھی وہ ہمت سے لڑے گی۔ اس نے فون رکھا اور مطلوبہ اپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئی۔
''میں یہاں آتے ہوئے اپنے بارے میں سوشل میڈیا پہ برے کمنٹس پڑھ رہی تھی۔''
کچھ دیر بعد وہ ایڈم کے سامنے اس کی لائبریری میں بیٹھی تھی۔ جدید طرز پہ بنی اس قدیم طرز سے متاثر شدہ لائبریری کے ریکس ان دونوں کو دلچسپی

سے دیکھ رہے تھے جو آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ دونوں کے درمیان ایک میز تھی جس پہ کافی کے گرما گرم کپ اور تالیہ کا سفید ہیٹ دیگر اشیا کے ساتھ رکھا تھا۔

"آپ کو میں نے منع کیا تھا وہ منفی باتیں پڑھنے سے۔" ایڈم خفگی سے بولا۔ تالیہ کی بہ نسبت وہ سادہ ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس تھا۔

"ایک زمانہ تھا' ایڈم.... جب اگر کوئی کم عقل انسان اول فول بولتا تو آس پاس بیٹھے دانا لوگ اسے جھڑک کے چپ کرا دیتے تھے۔ لیکن اب...." وہ اداسی سے مسکرائی۔ سرخ انگوٹھی والی انگلی وہ مسلسل کافی کپ کے دہانے پہ پھیر رہی تھی۔ "اب ہر احمق اور ہر دانا انسان کو بولنے کا یکساں حق مل چکا ہے۔ ہم ایسے زمانے میں جی رہے ہیں جہاں لوگ انٹرنیٹ پہ سفید بیک گراؤنڈ پہ جلی حروف میں لکھے کسی بھی قول کا یقین کر لیتے ہیں۔ چوبارے پہ بیٹھ کے کسی کو برا بھلا کہنا کتنا مشکل تھا پہلے' ایڈم۔ اور آج یہی کام کی بورڈ کے پیچھے چھپ کر کرنا کتنا آسان ہے۔"

"مائنڈ اوور میٹر' چے تالیہ۔ آپ مائنڈ کرنا چھوڑ دیں تو وہ میٹر کرنا چھوڑ دیں گے۔" وہ سوئی سوئی آنکھوں سے مسکرا کے بولا۔ اس کی اسٹڈی میں پھیلی فائلز اس بات کی غماز تھیں کہ وہ رات دیر تک جاگ کے تالیہ کا کیس اسٹڈی کرتا رہا ہے۔

"پھر بھی.... ہم ان برا بھلا کہنے والوں کو کیسے روک سکتے ہیں؟" وہ ایڈم کے پیچھے کھڑکی کو دیکھتے ہوئے سوچ میں گم کہہ رہی تھی۔

"ہم ان کو نہیں روک سکتے۔ خود کو روک سکتے ہیں۔ موقع ہونے کے باوجود کسی دوسرے کو برا کہنے سے۔ چاہے سر عام۔ چاہے کی بورڈ کے پیچھے سے۔"

"اب تم لگ رہے ہو پرانے ایڈم۔" تالیہ نے کپ اٹھاتے ہوئے مسکرا کے ایڈم کو دیکھا۔ "تقریباً پرانے ایڈم۔ کیونکہ کچھ تبدیلیاں ناقابل واپسی ہوتی ہیں۔"

"انسان میں ہر روز تبدیلی آتی ہے' چے تالیہ۔ جو لوگ بدلتے نہیں ہیں' ان سے ٹھہرے پانی کی بُو آنے لگتی ہے۔ آپ بھی ایک شاہی خاندان کی چھوٹی شکاری لڑکی سے آج ایک....."

"چھوڑو اس قصے کو۔ میں پہلے ہی سارا راستہ یہی سوچتی آئی ہوں۔" اس نے برا منہ بنا کے ایڈم کو خاموش کرا دیا۔ شاہی مورخ نے شانے اچکائے۔ پھر اپنی اسٹڈی کے ریکس کو دیکھا اور افسوس سے سر جھٹکا۔

"کتابوں نے مجھے پکڑوا دیا ورنہ میں آپ کو یقین دلا چکا تھا کہ میری یادداشت چلی گئی ہے۔" ملال سے بولا تو تالیہ نے دونوں ابرو اٹھا کے اسے دیکھا۔

"یعنی تم اس جھوٹ کے ساتھ خوش تھے؟ اور ایک پرانے دوست کے مل جانے کی خوشی کا کیا؟"

"وہ آسان تھا۔" ایڈم نے ہلکے سے شانے اچکائے۔ "خیر.... چونکہ ہم دونوں جانتے ہیں کہ مسز عصرہ نے خودکشی کی تھی.... تو اب اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔" اس نے ایک فولڈر اٹھایا اور کھول کے تالیہ کے سامنے رکھا۔

"میں مسز عصرہ کی فنانشل ٹرانزیکشنز دیکھ رہا تھا۔ مجھے کوئی غیر معمولی پے منٹ نہیں ملی۔ عصرہ نے جس شخص سے زہر منگوایا ہوگا' یا جس سے آپ کا کریڈٹ کارڈ ہیک کروایا ہوگا' اس کو پیسے کیسے دیے گئے؟ ہمیں ان پیسوں کا ثبوت نہیں مل رہا ہمیں۔"

"ہوسکتا ہے اس کے اکاؤنٹ میں نہ بھیجے ہوں بلکہ اس کو کیش دیا ہو۔"

"بے شک کیش دیا ہو لیکن کیش بینک سے نکلوایا تو ہوگا نا۔ ایسے کاموں پہ بہت خرچہ آتا ہے۔ اتنا کیش کوئی بھی گھر میں نہیں رکھتا۔ اور عصرہ نے ان دنوں میں کوئی بھاری رقم نہیں نکلوائی۔ اب سچویشن یہ ہے کہ نہ ہم اس شخص کا کوئی سراغ حاصل کر سکے ہیں' نہ اس کو دی جانے والی اجرت کا۔ اب ہم آپ کی بے گناہی کیسے ثابت کریں گے' چے تالیہ؟" وہ فکر مند تھا۔ "اوپر سے آپ نے وصیت کے نوادرات کو بیچ کے خود کو مزید مشکوک کر دیا ہے۔ عدالت یہی

سمجھے گی کہ آپ اسی لیے چھ سال بعد آئی تھیں۔"

"میں عدالت کے خوف سے آزاد ہو چکی ہوں' ایڈم۔ میں اپنی بے گناہی ضرور ثابت کروں گی۔"

"آزاد یعنی؟" اس نے غور سے تالیہ کا چہرہ دیکھا۔ وہ اس کے عقب میں روشن کھڑکی کو دیکھتے ہوئے سوچ سوچ کے بولنے لگی۔

"آزاد یعنی..... مجھے مستقبل کی فکر نہیں ہے۔ میرے پاس اپنے لیے کوئی پلان بھی نہیں ہے۔ مستقبل کا۔ اپنی زندگی کا۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ فاتح کی زندگی میں میری جگہ اب کیسے بنے گی۔ ایڈم..... مجھے کچھ نہیں پتا۔ صرف ایک بات معلوم ہے۔ میں اپنی زندگی کے ہر فیز میں یا غم زدہ رہی ہوں یا خوف زدہ۔ ماضی کا غم اور مستقبل کا خوف۔ مجھے ہمیشہ خوشی کی تلاش رہی ہے۔"

وہ بول رہی تھی اور ایڈم اس کی آنکھوں کو دھوپ سے سنہری پڑتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ وہ پرانی تالیہ لگ رہی تھی۔ اور وہ نہیں بدلی تھی۔ یہی تو مسئلہ تھا کہ اسے تھوڑا بہت بدلنا چاہیے تھا۔

"میں ایک گول سیٹ کرتی تھی اور سوچتی تھی کہ جب یہ ہو جائے گا تو میں خوش ہو جاؤں گی۔ جب مجھے خزانہ ملے گا' جب مجھے محل ملے گا' جب مجھے فاتح ملے گا' جب میں فاتح کی زندگی میں اہم ہو جاؤں گی۔ میں یہاں تھی۔" اس نے اپنے کافی کپ کی طرف اشارہ کیا جو میز پہ رکھا تھا۔ "اور مجھے یہاں جانا تھا۔" اس نے ڈیڑھ فٹ دور رکھے ایڈم کے کپ کی طرف انگلی گھمائی۔

"اور یہ درمیان کا راستہ....." اس نے انگلی سے میز پہ نادیدہ لکیر کھینچی.... "یہ راستہ ہمیشہ بے چینی سے گزرتا تھا۔ خوف' اضطراب' پریشانی... یہ تینوں میرے اس راستے کے ساتھی تھے۔ لیکن اب میں سوچتی ہوں کہ منزل اہم نہیں ہوتی۔ سفر اہم ہوتا ہے۔ جو سفر میں قانع اور خوش نہیں ہوتا' اسے منزل خوش نہیں کر سکتی۔ اس لیے اب میں منزل ملنے یا نہ ملنے کے خوف سے آزاد ہو چکی ہوں۔ اور اپنا سفر....."

"یعنی اپنا خزانہ...."

"یعنی اپنا خزانہ خوب انجوائے کر رہی ہوں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" مسکرا کے شانے اچکائے۔ پھر آگے کو ہوئی اور جتانے والے انداز میں یاد کرایا۔

"ہمیں نہ صرف میری بے گناہی ثابت کرنی ہے بلکہ ییشا تاج کا پردہ بھی فاش کرنا ہے۔ میرے پاس اپنے لیے پلان نہیں ہے لیکن فاتح کو ییشا سے بچانے کے لیے پلان ہے۔"

"اور وان فاتح اور تالیہ کا کیا؟" ایڈم نے بغور اسے دیکھا۔

اس سوال پہ تالیہ کافی دیر تک خاموش رہی۔

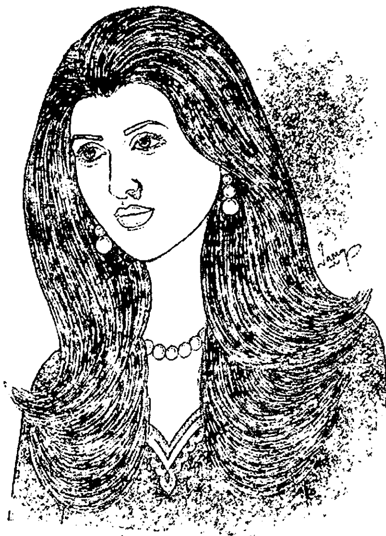
"ان کی زندگی میں میری جگہ نہیں ہے اب۔"

"یہ آپ خود سے فرض کر رہی ہیں۔"

"میں نے کہا نا' اس دفعہ میرے پاس کوئی پلان نہیں ہے اور میں سفر کی بے چینی سے خود کو آزاد کر چکی ہوں۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ فی الحال....." اس نے فائلز کی طرف اشارہ کیا۔

"عصرہ کے فنانشلز دوبارہ دیکھو۔ بغیر پیسوں کے کوئی اتنا بڑا کام نہیں کروا سکتا۔ فاتح کے فنانشلز بھی چیک کرو۔ شاید عصرہ نے ان کے اکاؤنٹ سے پیسے نکلوائے ہوں۔ اشعر سے وہ ایسے کام کے لیے اتنا بڑا کیش نہیں لے سکتیں۔ اشعر مشکوک ہو جاتا اور وہ کسی کا شک افورڈ نہیں کر سکتی تھیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ سنہری چین والا پرس کندھے پہ ڈالا اور ہیٹ سر پہ۔ ایڈم نے چونک کے اسے دیکھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



محبت بے نیازی ہے

ریاضی کے اصولوں میں
بلا کے آپ ماہر ہو
کہاں پر کیا گھٹانا ہے
کہاں کیا کچھ بڑھانا ہے
کہاں اعداد کے ذمرے میں کیا تقسیم کرنا ہے
کہاں تفریق کرنا ہے
کہاں پہ ضرب آتی ہے
تمہیں یہ خوب آتا ہے
مگر یہ جو محبت ہے
یہاں یہ فن نہیں چلتا
ضرب، تقسیم یا تفریق چاہت میں نہیں ہوتی
یہ دو کے قاعدے پہ بس سدا آباد رہتی ہے
اور دو کے قاعدے میں تیسرے کو شرک کہتے ہیں
جو دو سے اک نکل جائے تو پیچھے کچھ نہیں بچتا
یہی ہے قاعدہ اس کا
یہی اس کی ریاضی ہے
محبت بے نیازی ہے

ن م

انہیں پھر منتظر آنکھیں دکھائیں
جنہیں پتھر کا اندازہ نہیں تھا

تمہارے ہاتھ میں بھی تھا نمک کم
ہمارا زخم بھی تازہ نہیں تھا

یہ عالم تھا خیالِ حسن روشن
کسی خواہش کا خمیازہ نہیں تھا

ہماری خاک اشکوں میں گندھی تھی
ہنسی کیا شے ہے، اندازہ نہیں تھا

بڑھائی جس نے ان گالوں کی شوبھا
حیا کی سرخی تھی، غازہ نہیں تھا

احمد حماد

شگفتہ جاہ



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ جو سنے اسے (بغیر تحقیق کیے) بیان کر دے۔"
(مسلم)

فائدہ:۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر سنی ہوئی بات کو اس کی تحقیق کیے بغیر آگے بیان کرنا یا اسے صحیح سمجھ لینا درست نہیں۔ عین ممکن ہے کہ وہ جھوٹی ہو، اور یہ بھی اسے بیان کر کے اپنے آپ کو جھوٹوں میں شامل کر لیں۔ اس لیے پہلے ہر بات کی تحقیق ضروری ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمان مبارک

- نعمت کا غلط جگہ استعمال کرنا نعمت کی ناشکری ہے۔
- حقیر سے حقیر پیشہ ہاتھ پھیلانے سے بدرجہا بہتر ہے۔
- خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔
- سخاوت پھل ہے مال کا، اعمال پھل ہے علم کا، خوشنودیٔ خدا کا پھل ہے اخلاص۔

زرینہ خانم لغاری۔ مظفر گڑھ

معافی،

- بدلہ لینے سے بہتر معاف کرنا ہے۔
- اللہ انسان کو معاف کر دیتا ہے تو انسان، انسان کو کیوں نہیں۔؟
- گناہ دوسروں کا معاف کرو خود کا نہیں۔ خود کو معاف کرنے سے ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔
- معاف نہ کرنا کمینگی کی نشانی ہے۔

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں،

- کیا یہ حقیقت نہیں کہ تم نے اس چیز کو سمجھنے اور اس کے دل میں اتر جانے کی کبھی جدوجہد نہیں کی جسے تم بدصورتی کہتے ہو۔
(نیوٹن)
- کسی کو بدصورت نہ کہو سوائے ان بھیانک یادوں کے جن سے تمہاری روح خوف محسوس کرے۔
(سقراط)
- بدصورت چہرہ بدصورت دماغ سے بہتر ہے۔
(ونچل)
- دنیا کا کوئی آئینہ انسان کو اتنا بدصورت نہیں دکھا سکتا، جتنا زندہ ضمیر تمہارے گناہ دکھاتا ہے۔
(جلال السیدی)
- کسی انسان کو بدصورت مت کہو۔
(ارسطو)
- بدتر وہ ہے جس کی سیرت بدصورت ہے۔
(ہٹلر)

کمال کے دو نکاح،

کہتے ہیں کہ ایک بیوہ نے شادی کی عمر کو پہنچی ہوئی اپنی حسین و جمیل بیٹی کے لیے حق مہر کا مطالبہ مبلغ پانچ لاکھ ریال کر رکھا تھا۔ کئی خواہش مند اتنا حق مہر سن کر ویسے ہی دستبردار ہو چکے تھے۔ اپنی ضد کا پکا ایک لڑکا بمشکل تین لاکھ ریال اکٹھے کر پایا۔ پیسے لے کر مزید کی مدد مانگنے کے لیے سیدھا اپنے

باپ کے پاس پہنچا اور کہا۔
"اباجی! میرا کچھ کریں، میں اس کاکی پر فدا ہوگیا ہوں مگر اس کی ماں ہے کہ پانچ لاکھ ریال حق مہر سے ایک فلس کم پر بھی بات کرنے کو تیار نہیں۔ اب آپ ہی کچھ کیجیے۔"
باپ نے بیٹے کی سنجیدگی کو دیکھا اور کہا۔
"ٹھیک ہے پتر، چل لا پیسے۔ کچھ کرتے ہیں تیرا بھی۔"
دونوں باپ بیٹا پیسے لے کر بیوہ کے گھر پہنچے۔
سلام و دعا کے بعد باپ نے خاتون سے کہا۔
"میں آپ سے بات کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ جب تک میں اپنی بات مکمل نہ کرلوں، آپ میری بات نہ کاٹیں۔"
خاتون نے کہا۔ "جی بسم اللہ، کہیے۔"
لڑکے کے باپ نے کہا۔ "میرا بیٹا آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور یہ ایک لاکھ ریال نقد حق مہر ساتھ لایا ہے۔"
خاتون نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "مگر مجھے اپنی بیٹی کے حق مہر میں پانچ لاکھ ریال سے ایک فلس کم بھی قبول نہیں ہے۔"
لڑکے کے باپ نے کہا۔ "محترمہ! آپ سے گزارش کی تھی کہ آپ مجھے بات پوری کرنے دیجیے گا۔"
خاتون نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "جی پوری کیجیے اپنی بات۔"
لڑکے کے باپ نے کہا۔ "آپ بذات خود ایک انتہائی خوبصورت اور جوان جہان عورت ہیں۔ میں آپ کو بھی ایک لاکھ ریال حق مہر ادا کرنا چاہتا ہوں۔ آپ میرے حق شرعی میں آجائیے۔"
خاتون کی خوشی سے باچھیں کھل کر کانوں کو جالگیں۔ بمشکل اپنے جذبات کو دباتے ہوئے کہا۔
"اللہ آپ کا آنا مبارک کرے۔ مجھے آپ کی دونوں شرطیں قبول ہیں۔"
باپ بیٹا خوشی خوشی باہر نکلے تو لڑکے نے ہلکا سا گلا صاف کرتے ہوئے باپ سے کہا۔
"اباجی! وہ ایک لاکھ ریال جو بچ گئے ہیں، پھر وہ تو مجھے واپس دے دیجیے۔"
باپ نے کہا۔ "ناں پتر اوئے، ابھی ایک بڑا اور اہم مرحلہ تو باقی پڑا ہوا ہے۔ یہ ایک لاکھ ریال جا کر تیری ماں کو دینا پڑے گا تاکہ وہ بھی تو راضی ہو۔"

عائشہ، تحریم۔ گوجرہ

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی،

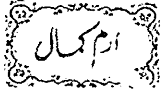
- ایک ایسا عظیم شخص جس نے 1994ء میں کنگ فیصل ایوارڈ کو یہ کہتے ہوئے ٹھکرایا کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے لکھا ہے لہٰذا۔۔۔ میرے دین کو خراب نہ کریں۔
- ایک ایسا عظیم شخص جس نے فرانس کی نیشنلٹی کو یہ کہتے ہوئے ٹھکرادی کہ مجھے اپنی مٹی اور اپنے وطن سے محبت ہے۔
- ایک ایسا عظیم شخص جس کے ہاتھ پر چالیس ہزار غیر مسلموں نے کلمہ طیبہ پڑھا۔
- ایک ایسا عظیم شخص جو بائیس زبانوں کا ماہر تھا اور جو اسی سال کی عمر میں آخری زبان تھائی سیکھ لی تھی۔
- ایک ایسا عظیم شخص جس نے مختلف زبانوں میں 450 کتابیں اور 937 علمی مقالے لکھے۔
- ایک ایسا عظیم شخص جو اس قدر علمی مقام رکھنے کے باوجود اپنے برتن اور کپڑے خود دھوتے تھے۔
- آپ نے 1952 سے 1978ء تک ترکی کی مختلف جامعات میں پڑھایا۔
- 1980ء میں جامعہ بہاولپور میں طلبہ کو خطبات دیے جنہیں بعد از اں خطبات بہاولپور کے نام سے شائع کیا گیا۔
- یہ عظیم علمی اور فکری شخصیت سترہ دسمبر 2002ء کو امریکی ریاست فلوریڈا میں انتقال کر گئی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کہنے کو ایک فرد تنہا تھے لیکن کام کئی جماعتوں سے زیادہ کر گئے، اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے۔



امت الصبور





کی ڈائری سے

وہ لوگ جو ہمارے قریب رہتے ہوئے بھی ہمارے دل سے کوسوں دور ہوں۔ ان کی قربت کبھی کبھی بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ یہ غزل نذر قارئین۔

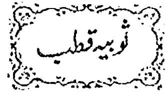
کتنا مشکل ہے اذیت یہ گوارا کرنا
دل سے اترے ہوئے لوگوں میں گزارا کرنا

زندگی ہم پہ یہ آسان بھی ہو سکتی تھی
سیکھ لیتے جو کبھی درد کا چارہ کرنا

کہاں جاتے ہو ابھی ساتھ گزارو کچھ دن
ہم پہ مشکل کوئی آئے تو کنارہ کرنا

کتنا مشکل ہے جلانا کسی رستے میں چراغ
کتنا آسان ہے ہواؤں کو اشارہ کرنا

زندگی ہم تو چلو مان گئے سہہ بھی گئے
ایسا برتاؤ کسی سے نہ دوبارہ کرنا



کی ڈائری سے

کچھ باتیں ہمیں ناممکن لگتی ہیں۔ اس غزل میں شاعر نے ان ہی ناممکنات کا ذکر کیا ہے۔ شاعر کی نکتہ آفرینی دیکھیں۔ اس نے کتنی خوبصورت باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تم گزرو اور وقت نہ ٹھہرے ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے
یاد آؤ اور درد نہ بھڑکے، ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے

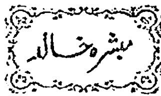
صبر کیا ہے، شکر کیا ہے، راضی ہو کر دیکھ لیا ہے
لیکن دل کو چین آ جائے، ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے

ترک محبت کر لینے سے ترک محبت ہو بھی جائے
کوئی اسے جا کر سمجھائے، ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے

جب تم نے سب راز کی باتیں، گوشِ موج ہوا سے کہہ دیں
شاخ و شجر تک بات نہ پہنچے، ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے

گزرا لمحہ گزر گیا ہے، اس پر اشک بہانا کیسا
مٹھی میں پانی آ جائے، ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے

پہلے جیسا نہیں ہے کچھ بھی، اس پہ تعجب کرنا کیسا
دھوپ ڈھلے اور رنگ نہ بدلے، ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے



کی ڈائری سے

شاعری صرف لفاظی کا نام نہیں بلکہ شاعری میں احساسات، جذبات بیان ہوتے ہیں۔ درد، تکالیف، تجربات کو چند لفظوں میں یوں سمویا جاتا ہے جسے پڑھ کر قاری پر دنیا کی بڑی سے بڑی حقیقت آشکار ہو جائے اور وہ برجستہ کہہ اٹھے کہ ہاں ایسا تو ہے ایسا ہی ہوتا ہے۔ کشور ناہید جدید شاعری کی ترجمان ہیں اور ایک خاتون شاعرہ ہونے کے ناتے اپنی شاعری میں عورت کو اپنا وجود تسلیم کروانے پر آمادہ کرتی ہیں اور ان کی شاعری پڑھ کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ عورت کو باغی نہیں بنا رہیں بلکہ احساس دلا رہی ہیں کہ وہ انسان ہے۔ کشور ناہید کی ایک نظم قارئین کی نذر۔

جاروب کش

دوسروں کی سیوا
پتھروں کی سیوا کے برابر ہے
بہن، بیوی اور ماں کے رشتوں
کی خاطر جینے والی
تم اپنے لیے بھی تو جیو!

دیکھو کنول کا پھول کیسے عالم
اور کیسے ماحول میں اپنی انا
اور اپنے وجود کا اعلان کرتا ہے
تم کیوں آٹھ سال چھوٹے بھائی
کے غصے بھرے تحکم کو مان کر
کھڑکی سے جھانک کر مسکراتے چہرے
کی تلاش سے آنکھیں چرا لیتی ہو

تم کیوں پینتیس برس کی ہو کر
خود کو سنوارنا بند کر دیتی ہو
کہ تمہیں اپنے شوہر کے زیر لب بجھے
فقروں سے طلاق کی بو آتی ہے
تم ماں ہونے کے ناتے
اپنے اندر کے بچے کو
گوشت پوست کے بچوں کی بھینٹ چڑھا کر
مامتا کا نام دیتی ہو!
جیسے کچے رنگوں کے دھل گئے
پانی کے ایک ہی قطرے سے
رنگ چھوڑ دیتے ہیں
یہ سب رشتے
کچے رنگوں کے دھل گئے ہیں
سب بکھر گئے ہیں
ان کے اوپر چلو تو بھی لہولہان
ان کو سہو، تو بھی لہولہان
پر اپنے لیے جینا کیوں ممکن نہیں
میری بانو!
سورج مکھی کی طرح
گھر کے حاکم کی رضا پہ
گردن گھماتے گھماتے
میری ریڑھ کی ہڈی، چٹخ گئی ہے
جسم کا سارا بوجھ سہنے والی ہڈی
چٹخ گئی ہے

سمیرا اقبال کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ خوبصورت غزل آپ سب کی نذر۔

کچھ وصال آخر تک معتبر نہیں ہوتے
ساتھ چلنے والے بھی ہمسفر نہیں ہوتے

تو ہماری قربت سے کتنا ہی گریزاں ہو
ہم تیرے ٹھکانے سے بے خبر نہیں ہوتے

کچھ کہے بنا اکثر، بولتی ہیں آنکھیں بھی
گفتگو کے سب لمحے حرف گر نہیں ہوتے

کتنا خوف ہوتا ہے شام کے اندھیرے میں
پوچھ ان پرندوں سے جن کے گھر نہیں ہوتے

عمر بھر نہیں ملتا واپسی کا دروازہ
آگہی کے زنداں میں بام و در نہیں ہوتے

ثمینہ اکرم کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر رحمان فارس کی یہ غزل آپ کی نذر۔

یوں کاروبار شوق پہ پردہ نہ ڈالیے
کیا بیچا؟ کیا خریدا؟ رسیدیں نکالیے

پھل بیچ ڈالے آپ نے سایہ بھی پھول بھی
اب، پیڑ کے سوالوں کو ہنس کر نہ ٹالیے

آئین تو یہی ہے کہ جو بھی کرے سوال
اس بدتمیز شخص کی پگڑی اچھالیے

خاموشیوں کے دور میں اچھا نہیں سخن
فارس زیادہ بات نہیں، منہ سنبھالیے

خالدہ جیلانی



ارم کمال ــــــــــ فیصل آباد

حال پر میرے توجہ، میری ہر بات پر جی
اب جو ہے مجھ پہ عنایت، کبھی ایسی تو نہ تھی

آسیہ جاوید ــــــــــ علی پور چٹھہ

زخم دینے کا انداز کچھ ایسا ہے
زخم دے کر پوچھتے ہیں اب حال کیسا ہے
کسی ایک سے گلہ کیا کرنا اے دوست
ساری دُنیا کا مزاج ایک جیسا ہے

نمرہ، اقرا ــــــــــ کراچی

تھی میری تباہی میں کچھ درختوں کی بھی سازش
ورنہ یہ اجڑنے کا موسم تو نہیں تھا

نوال افضل گھمن ــــــــــ گجرات

کیسا دلکش و شاندار ہوتا ہے یہ معصوم بچپن
چلا جاتا ہے چپکے سے اپنی معصوم یادیں چھوڑ کر

فاکہہ سہیل ــــــــــ کراچی

جو لگ چکی ہے دل میں گرہ کھل نہیں سکتی
تُو لاکھ ملتا رہے ہم سے دوستوں کی طرح

ثوبیہ قطب ــــــــــ کراچی

میسر نہ ملنے کو بچھڑتا ہوں تجھ سے لیکن
مڑ کے دیکھوں تو پلٹنے کی دُعا دیتا

عروج فاطمہ ــــــــــ خیرپور میرس

درخت کاٹ کے سایہ فروخت کرتے ہیں
اور اس کے بعد کڑی دھوپ سے گزرتے ہیں
ہمیں خود اپنے مسائل پہ غور کرنا ہے
کہ رو در رو تو صحیفے نہیں اُترتے ہیں

نور نظر ــــــــــ یکھی والا

وہی محفوظ رکھے گا زمانے کی بلاؤں سے
جو بارش میں شجر سے گھونسلے گرنے نہیں دیتا

نادیہ یاسر ــــــــــ گوجر خان

نیا موسم میری بینائی کو تسلیم نہیں
میری آنکھوں کو وہی خواب پرانے لا دے
جس کی آنکھیں مجھے اندر سے بھی پڑھ سکتی ہوں
کوئی چہرہ تو میرے شہر میں ایسا لا دے

بشریٰ رحمٰن ــــــــــ کراچی

ہنستے ہوئے لوگوں کو رُلایا نہیں کرتے
ہم زخم جگر اپنا دکھایا نہیں کرتے
اک بار جسے اپنی نگاہوں سے گرا دیں
اس شخص کو پھر دل میں بسایا نہیں کرتے

فضہ بلال ــــــــــ ڈیفنس گارڈن

بے حس ہیں یہاں لوگ بھلا سوچ کر کرنا
اس دور میں لوگوں سے وفا سوچ کے کرنا
اک بار جو روٹھے تو منا تم نہ سکو گے
ہم جیسے وفاداروں کو خفا سوچ کے کرنا

نخبہ اکرم ــــــــــ گاؤں گولیکی

کوئی موجِ گل سے کہہ دے نہ چلے مچل مچل کے
وہ نظر بدل گئی ہے، میری زندگی بدل کے
شب ماہ مختصر تھی، مجھے ہائے کیا خبر تھی
کہ طلوع پھر نہ ہوگا میرا ماہتاب پھر سے

عائشہ ــــــــــ گوجرہ

بہت ہیں خواب مگر خواب ہی سے کیا ہوگا
ہمارے بیچ جو حائل ہے، وہ حقیقت ہے
سمجھ رہے تھے مسافر قیام کو منزل
خبر نہیں تھی کہ آگے بھی ایک ہجرت ہے

ثمینہ تاج ــــــــــ لاہور

وہی منصف، وہی قاتل، عدالت اس کی وہ شاہد
بہت سے فیصلوں میں اب طرف داری بھی ہوتی ہے

مسکان نور...... لاڑکانہ

خواتین ڈائجسٹ میرا شہزادہ چھوٹا بھائی پیدل جا کر میرے لیے لایا۔ میں تو اسے دعائیں دیتی نہیں تھکتی۔ ٹائٹل حسین تھا۔ "تتلی جیسا پیار" کی آخری قسط زبردست تھی۔ "کرن کرن روشنی" پسند آئی لیکن "وہ میرے خواب" فرح بھٹو میری فیورٹ ہیں۔ فرح آپی ہمیشہ خوش رہیں۔ "ایک انوکھا، ایک البیلی" مسکرانے پر مجبور کر گئی تھی۔ ویری گڈ۔ "ستاروں والا جوڑا" زبردست لگی۔ "ہم خیال" بہت اچھی لگی۔ "ہنر بے مول" سب سے پہلے فریحہ اشتیاق آپ کو بہت مبارک باد۔ کہانی سچ میں بہت پسند آئی۔ فائزہ بھٹی آپ کو بھی کہانی شائع ہونے پر مبارک ہو۔ "بند مٹھی میں ریت" بہت بہت پسند آئی۔ "خواب سراب" بھی اچھی لگی۔ "خلش" پسند آئی۔ "ہمارے نام" گڑیا راجپوت کو جو آپ نے جواب دیا تھا نا آپی! مجھے ایسا لگا جیسے آپ نے مجھے یہ جواب دیا ہے۔ یقین کریں آپی جان میں آپ سب سے کبھی بدگمان نہیں ہوئی۔ میں آپ کی مجبوری سمجھتی ہوں۔ زینب نور! آپ کے افسانے کا انتظار ہے مجھے اور ہاں، ہر ماہ آتی رہیے۔ کیونکہ آپ مجھے بہت عزیز ہیں سچ میں۔ ریحانہ آپی، ام انعام آپی۔ بھی بہت اپنی اپنی لگتی ہیں۔

☆ پیاری مسکان! بہنوں کے ہاتھ تو ہمیشہ ہی بھائیوں کے لیے دعا کے لیے اٹھے رہتے ہیں۔ بھائی ذرا سا خیال کر لیں تو بہنیں اسی طرح خوش ہو جاتی ہیں۔ جیسے آپ بھائی کے پرچا لانے پر اسے دعائیں دیتے نہیں تھکتیں۔ خط اور تبصرہ بہت اچھا ہے۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کا انتظار ختم ہوا، اس ماہ زینب نور کا افسانہ شامل ہے۔

ندا رفیق...... چک جھمرہ سٹی

ٹائٹل بہت ہی خوب صورت تھا۔ سب سے پہلے تو "کرن کرن روشنی" پڑھ کر بہت ہی اچھا لگا۔ انشاء جی نے "کوئی دن گریہ گرانی" اور بہت ہی خوب صورت انداز میں لکھا۔ مجھے بہت پسند آیا۔ سید عارض الدین 1972ء احمد اور علینہ فاروق شیخ سے ملاقات اچھی لگی۔ "تتلی جیسا پیار" راحت جبیں نے بہت اچھا لکھا۔ میرے ایم اے



نادرہ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ' 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: Info@khawateendigest.com

اردو کے پیپرز ہو رہے ہیں، تیاری کم کی، ناول زیادہ پڑھا۔ عندلیب زہرا نے "خواب سراب" نہایت ہی خوب صورت انداز میں لکھا۔ سعدیہ رئیس نے "ہم خیال" بہت اچھا لکھا۔ فریحہ اشتیاق نے "ہنر بے مول" پہ بہت اچھی روشنی ڈالی۔ میری بہن نے بھی پارلر کا کورس کیا ہوا ہے، وہ بھی مفت میں ہی مہندی، تھریڈنگ وغیرہ کر دیتی ہے۔ قانتہ رابعہ ہمیشہ میرے لیے ہی لکھتی ہیں۔ میں نے بھی مفت میں بہت ٹیوشن پڑھائی حالانکہ آپ نے بھی مارچ 2019ء کے خواتین ڈائجسٹ میں میرے خط کے جواب میں مجھے ٹیوشن پڑھانے کا مشورہ دیا تھا۔ تب میں دس سال سے پڑھائی آ رہی تھی، جب میں چھٹی جماعت میں تھی۔ یہاں گاؤں میں ہنر کے پیسے نہیں دیے جاتے، اگر کوئی لڑکی اپنا حق مانگ لے تو وہ لوگوں کی نظر میں بہت بری بن جاتی ہے۔ "ہنر بے مول" افسانہ کا یہ ڈائیلاگ "ہائے یہ انوکھی دنیا اور اس کے نرالے لوگ" پڑھ کر بہت

ہی دل کو سکون ملا۔ ناولٹ میں سے نعیمہ ناز اور شبانہ شوکت نے بہت ہی اچھا لکھا۔ مجھے سب سے زیادہ جو ناول پسند آیا، وہ فرح بھٹو کا ''لیکن وہ میرے خواب'' ہے۔ باقی ''رقص شرر' فائزہ ثمرین نے بہت اچھا لکھا۔ ''باورچی خانہ، موسم کے پکوان' نفسیاتی الجھنیں'' اور ''بیوٹی بکس'' کے مشورے پڑھ کر بہت مزا آیا۔

☆ پیاری ندا! گاؤں کے مسائل شہروں سے بہت مختلف ہیں۔ ہمارے کسان معاشی طور پر شدید مشکلات کا شکار ہیں۔ مہنگی کھاد، مہنگی بجلی اور پانی کی کمی نے ان کی کمر توڑ رکھی ہے۔ یہ وہ وجوہات ہیں جن کی بنا پر شدید محنت کے باوجود انہیں دو وقت کی روٹی نہیں ملتی۔ ان حالات میں وہ ٹیوشن فیس وغیرہ کیسے دے سکتے ہیں جبکہ شہروں میں ایسا نہیں ہے۔ یہاں ٹیوشن پڑھانے کے اچھے پیسے مل جاتے ہیں۔

پیپرز کی تیاری کے دوران آپ نے خواتین پڑھا اور وقت نکال کر ہمیں خط بھی لکھا، یہ خواتین کے لیے آپ کی محبت کا ثبوت ہے۔

ماہ نور انجم......کراچی

واہ واہ! ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ ایک وقت تھا کہ ڈائجسٹ صرف انٹرویو پڑھنے کے لیے اٹھاتے تھے اور اب اس ایک سلسلے کے علاوہ پورا رسالہ پڑھ لیتے ہیں۔ وجہ ہے کئی نئے چہرے، چونکہ اب ٹی وی ڈرامے دیکھنا تقریباً ترک ہی کر دیا ہے۔ اس لیے نئے چہروں سے واقفیت ہے، نہ انہیں جاننے میں دلچسپی۔

ہاں تو بھئی ''تتلی جیسا پیار'' اختتام پذیر ہوا۔ بہت ہی خوب صورت ناول تھا۔ ''رقص شرر'' سنسنی خیز آغاز ہے، امید ہے کہ آگے بھی کہانی جان دار ہوگی۔ ''ایک انوکھا ایک البیلی'' ہلکی پھلکی مزے دار تحریر تھی۔ جبکہ فرح بھٹو نے انتہائی فلمی اور کئی بار شائع ہو چکی کہانی لکھی۔ بہت ہی پرانا انداز اور سچویشنز تک، وہی کی وہی...... پڑھ کر بہت مایوسی ہوئی۔ افسانوں میں کس کی تعریف کریں، سارے کے سارے عمدہ، بہترین۔ مگر عندلیب زہرا اور قانتہ رابعہ کا جواب نہیں، بہت خوب۔

''خبریں وبریں'' اور ''آپ کا باورچی خانہ'' بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔

☆ پیاری ماہ نور! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کا باورچی خانہ کے سلسلے میں آپ کے جوابات فائل میں محفوظ ہوں گے۔ دراصل ہر ماہ صرف ایک ہی بہن کے جوابات شائع کر سکتے ہیں، اس لیے باری آنے میں تاخیر ہو جاتی ہے۔

انٹرویو کے سلسلے میں ہم آپ سے متفق ہیں، اب اداکاروں سے دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے۔ اتنے چینلز، اتنے ڈرامے ہیں کہ اس میں کام کرنے والوں کے چہرے یاد ہی نہیں رہتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ پہلے ڈرامے کے اینڈ ٹائٹل پر اداکاروں کے نام کرداروں کے نام کے ساتھ لکھے آتے تھے جو کافی جلی حروف میں ہوتے تھے۔ اب ایسا نہیں ہوتا۔ خفی حروف میں صرف اداکاروں کے نام آتے ہیں، کرداروں کے نہیں۔ جو بہت تیزی سے گزر جاتے ہیں اس لیے کسی کی شناخت نہیں بن پاتی۔

عائشہ قیوم......گوجر خان

پچھلے دس سال سے خواتین ڈائجسٹ، شعاع اور کرن کی خاموش قاری رہی ہوں۔ لاتعداد کہانیوں نے دل کو چھوا۔ سوچ کو بدلا۔ زندگی جینا سکھایا لیکن جس کہانی نے خط لکھنے پر مجبور کیا اور کئی دن تک رلایا ہے وہ ''قوام'' ہے۔ کیوں؟ کیونکہ یہ میری زندگی سے ہو بہو ملتی جلتی ہے۔

شادی سے پہلے میں بھی اسی طرح اسکول کی نوکری کرتی تھی تو اس طرح کے مسائل ہوتے اور یہ سخت ذہنی اذیت تھی۔ پھر مجھے بھی اسی طرح اسکول کا ایک اسٹوڈنٹ چھوڑنے جانے لگا کیونکہ میرے بھائی نے بھی چھوڑنے لینے کی ذمہ داری اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے بھی بہت نظریں اور باتیں سہی ہیں۔ بہت روئی ہوں لیکن شادی کے بعد شوہر نے سارے دکھ چن لیے۔ ''قوام'' میں نزہت کی کہانی مجھے اپنی کہانی لگی، جیسے وہ میں ہوں۔

میمونہ صدف آپ نے ایسا ناولٹ لکھ کر یقین جانیے، میرا دل موہ لیا۔ میری درخواست ہے کہ ایمل رضا اور میمونہ صدف سے شعاع اور خواتین ڈائجسٹ کے لیے بھی لکھوائیں۔ یہ کرن تک کیوں محدود ہو گئی ہیں۔

شکر ہے تنزیلہ ریاض بھی ''نور القلوب'' کی صورت واپس آئیں۔ پہلی قسط بہت اچھی لگی۔ تنزیلہ ہمیشہ اچھوتے ٹاپک کے ساتھ آتی ہیں۔

☆ پیاری عائشہ! آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ ہم آپ کو خواتین کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔

ایمل رضا اور میمونہ صدف کی تحریریں شعاع اور خواتین میں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ایمل کا قسط وار ناول کرن میں چل رہا تھا، اس لیے وہ شعاع میں نہیں لکھا۔

پیاری بہن! بھائیوں کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ تعلیم یا نوکری یا اپنا چھوٹا موٹا کاروبار اگر وہ اس طرح بہنوں کو لانے، لے جانے کی ڈیوٹی انجام دینے لگیں تو اپنا کام کیسے کریں گے۔ لڑکیوں کو خود بہادر اور مضبوط ہونا چاہیے۔ ویسے بھی اگر دو تین بہنیں ہوں تو ہر بہن کے آنے جانے کے اوقات مختلف ہوں گے۔ بھائی کس کس کی ڈیوٹی انجام دیں گے۔

حمیرا گل......ملتان

پیاری آپی آج کل زور وشور سے ایم اے کی تیاری میں لگی ہوئی ہوں۔ اس بار بھائی کی مصروفیات کی وجہ سے مجھے آج ہی شعاع اور خواتین ڈائجسٹ ملے ہیں۔ شازیہ جمال طارق کا ''ستاروں والا جوڑا'' بہت ہی اچھے موضوع پر لکھا گیا افسانہ تھا۔ ہماری فیملی میں بھی پہلے یہ رواج تھا لیکن اب ہم نے نندوں کے لیے الگ سے سوٹ رکھنے شروع کر دیے ہیں کہ خواہ مخواہ دلہن کا دل برا نہ ہو۔ عندلیب زہرا ''خواب سراب'' لے کر آئیں۔ سعدیہ رئیس کی ''ہم خیال'' پڑھ کر ہنسی بھی آئی اور زیام بے چارے پر بہت ترس بھی آیا۔ فریحہ اشتیاق کی ''ہنر بے مول'' پڑھ کر بہت ساری حرا اور بہت ساری نادیہ ذہن میں گھوم گئیں۔ ہم لوگوں کو بھیک دے کر فخر محسوس کرتے ہیں لیکن کسی کا حق دیتے ہوئے نہ جانے کیوں ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ اس موضوع پر لکھا جانا چاہیے تھا۔ قانتہ رابعہ کی ''بند مٹھی میں ریت'' ویری ویل ڈن جی۔ بہت خوب لکھا۔ آج کل لوگ جو دل میں آئے، اسٹیٹس پر لکھ کر ساری دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔ سچ ہے نیکی کرنا آسان لیکن نیکی کے غرور سے بچنا بہت مشکل کام ہے۔ شاعری میں امجد اسلام امجد کی نظم بے حد پسند آئی۔

☆ پیاری حمیرا! امتحان میں آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔ آپ نے پڑھائی کی مصروفیات میں سے وقت نکال کر ہمیں خط لکھا، اس محبت کے لیے تہ دل سے ممنون ہیں۔ تبصرہ بھی بہت اچھا ہے۔

ممتاز بنت حسن......کراچی

اپنا تو حال یہ ہے کہ اب پینتالیس سال کی عمر میں جوڑوں کے درد، آرتھرائٹس، آنکھوں کا موتیا اور بال گرنے کی، شکایت کیا کہ بالکل ہی گر گئے۔ آدھے سر کا درد زندگی بہت مشکل ہو گئی ہے۔

نومبر کا شمارہ ہاتھ میں ہے، خوب ہے بھئی۔ آپ لوگوں کی محنت نظر آتی ہے۔ ''کرن کرن روشنی'' میں قصاص کے موضوع پر اچھی معلومات ملی۔ احادیث کی آسان لفظوں میں تشریح کر دینے سے اچھی طرح سمجھ میں آ جاتا ہے۔ ویسے میں دینی احکامات سیرت النبی ﷺ و صحابہ کرام و دیگر اسلامی موضوعات پر کتابیں رکھتی ہوں، پڑھتی ہوں۔

شازیہ جمال طارق کا ''ستاروں والا جوڑا'' اچھا لکھا انہوں نے لیکن ہمارے ہاں شہروں میں تو ایسا نہیں ہوتا۔ الگ سے جوڑے رکھے جاتے ہیں۔ گاؤں میں ایسا ہوتا ہوگا۔ باقی تحریر اچھی تھی۔ مبارک باد کی مستحق ہیں وہ۔ عندلیب زہرا کے ''خواب سراب'' میں عروسہ کی قسمت اچھی تھی۔ بھٹکنے سے بچ گئی۔

نعیمہ ناز کی ''ایک انوکھا، ایک البیلی'' بہت اچھی تحریر تھی۔ شروع میں خوب ہنسایا۔ نعیمہ ناز ویل ڈن۔ شبانہ شوکت بھئی آپ نے تو خوب نئے نام دیے۔ فریحہ اشتیاق نے ''ہنر بے مول'' میں جس طرف توجہ دلائی، اچھا کیا۔

فرح بھٹو کا ''لیکن وہ میرے خواب'' بہت اچھی تحریر تھی۔ باقی تمام تحریریں ملا اچھی تھیں۔ عدنان بھائی کا ''نفسیاتی الجھنیں'' اور ان کی الجھنیں ہر ماہ ہی سوچ وفکر کے نئے زاویے کھولتا ہے۔ یہ سلسلہ بہت اچھا ہے۔ رنگا

بعد ہی طلاق یافتہ ہوگئیں۔ بڑی آپا کی بھی ایک بیٹی ہے اور چھوٹی آپا کی بھی آٹھ سال کی ایک بیٹی ہے جو کہ ان کے پہلے شوہر سے ہے۔ آہ......! کیا قسمت پائی میری اماں کی بیٹیوں نے۔ ایک دم پورے گھر میں سناٹا۔ ہر فرد کچھ لمحوں میں ساکت ہوگیا۔ جیسے اس گھر میں کچھ نہ بچا ہو اور نہ ہی کوئی ذی روح رہتا ہو۔ اماں کے ہاتھ سے طلاق نامہ چھوٹ کر فرش پر آ گرا اور ایسے ہی آپا بھی زمین بوس ہوگئیں۔ اماں کی ہچکیاں، اتنا درد ہی درد...... میری آنکھوں سے گرم گرم سیال بہہ کر گالوں کر جلا گیا اور میری روح بھسم ہوگئی۔ دونوں آپا اور اماں اپنے نصیبوں پر ماتم کناں۔ درو دیوار ہل کر رہ گئے۔ شاید ہی اس رات ہمارے گھر میں کسی نے کھانا کھایا ہو۔ اماں کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں زمین پر تنکے سے لائنیں لگاتے، آنسوؤں کا طوفان لیے، مٹی کی طرح وجود بکھرا، میرا اجاڑ حلیہ میں بیٹھنا اماں غش کھا کر گر پڑیں۔ رات ہسپتال میں ایڈمٹ رہیں۔ دوسرے دن بھائی صائم گھر لے آئے۔

آپا کے کاندھے پر سر رکھے پتا نہیں کتنا ٹائم گزر گیا۔ بڑے تینوں بھائی تھوڑی دیر پرسا دینے آئے اور پھر اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔ کوئی نہ کوئی عذر ظاہر کرکے۔ چھوٹا بھائی صائم حسرت سے دیکھتا رہ گیا۔ اب وہ بے چارہ ہی ہمارا واحد سہارا ہے۔ والد صاحب تو بچپن میں ہی چل بسے۔ بڑے بھائیوں کی جیسے جیسے شادیاں ہوئیں۔ الگ الگ گھروں میں جا بسے۔ ہمارا رب وارث۔ محلے کی عورتیں اور رشتہ دار پرسا دینے ابھی بھی آرہے ہیں لیکن شاید ابھی آزمائشیں ہیں۔

محلے کی ایک بزرگ عورت کو اماں سے باتیں کرتے سنا تو یقین نہ آیا۔

''اے بہن! سائرہ! تمہاری جٹھانی (ہماری تائی اماں) جو کہہ گئیں اور کر گئیں، وہی ہوا۔ دونوں بڑی اجڑ کر دوبارہ اسی گھر میں آ گئیں۔ اب چھوٹی کو کون پوچھے گا؟''

دراصل تائی اماں کو رشتوں کی چاہت تھی لیکن ان کی اولاد اور ہم میں کافی فرق تھا۔ اس لیے اماں نے ان کو نہ رشتہ دیا نہ لیا۔ اس حسد میں وہ ہمارا بیڑہ غرق کر گئیں۔ وہ کالا جادو پہلے کسی سے کرواتی تھیں پھر وقت کے ساتھ انہوں نے کالا جادو خود سیکھ لیا۔ پورے خاندان کا ناک میں دم کیا ہوا تھا۔ اماں سیدھی سادی عورت۔ اس کے وار میں آ گئیں۔

انہوں نے اماں کو چیلنج کر کے کہا تھا کہ ''اپنی لڑکیوں کی شادی نہ کرنا، ان کے گھر نہیں بنیں گے۔''

اماں نے ان کی بات کا نوٹس نہ لیا اور وقت گزرتا رہا۔ بڑی آپا کا پھوپھو کے ہاں رشتہ ہوا، وہاں بھی آپا کا گھر اجاڑنے میں تائی اماں کا ہاتھ تھا۔ بائیس سال سے بڑی آپا میکے میں ہیں۔ اللہ بخشے چھوٹی بہنوئی اچھے اوصاف کے مالک تھے۔ آپا کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن وہ تین سال میں کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے چل بسے اور چھوٹی آپا بیوہ ہو کر میکے آ گئیں۔ تائی اماں بہت خوش ہوئیں۔

اب ہمارے حالات جس اسٹیج پر ہیں، قاری بہنیں اندازہ لگا سکتی ہیں۔ اماں بالکل بستر سے لگ گئی ہیں۔ ہم نے کافی روحانی علاج کروایا ہے لیکن تائی اماں کے کالے جادو کا توڑ نہیں ہوسکا ہے۔ ہماری زندگیاں کیا ہیں، بس سانس لے رہے ہیں۔ سب قاری بہنوں سے گزارش ہے کہ وہ ہمارے گھر کے لیے دعا کریں۔ ہم نے تو کبھی کسی کا برا نہیں چاہا پھر ہمارے ساتھ یہ سب کیوں ہوا؟

☆ آپ کا خط پڑھ کر جتنا دکھ ہوا ہے، اس کو لفظوں میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ دل ہل کر رہ گیا ہے آپ کی دونوں بہنوں کے اور آپ کی اماں کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے لیکن پیاری بہن! آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ دنیا میں غم اور دکھ کی کتنی بھیانک شکلیں ہیں۔ یہاں کیا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے، سہنا پڑتا ہے آپ کی بہنوں کے ساتھ یہ آسانی ہے کہ ان کے بچے ان کے پاس ہیں، ان کی مامتا ٹھنڈی ہے۔ ہمارے پاس جو خط آتے ہیں ان میں بہت سی بہنیں لکھتی ہیں۔ شوہر نشہ کر کے مار پیٹ کرتے ہیں، خود کماتی ہیں تو پیسے چھین لیتے ہیں اور پیچھا بھی نہیں چھوڑتے۔ وہ طلاق کے لیے عدالتوں میں دھکے کھاتی ہیں۔ بہت سے مرد بچے چھین لیتے ہیں اور بچوں کو ماؤں سے بدظن کر دیتے ہیں۔

یہ خیال دل سے نکال دیں کہ تائی نے جادو کیا ہے۔

جب تک آپ کے ذہن میں یہ سوچ ہے، آپ زندگی میں آگے نہیں بڑھ سکیں گی۔ اپنی بہنوں اور اماں کو بھی سمجھائیں۔ جس دن آپ یہ خیال دل سے نکال دیں گی، اس دن سے آپ کے حالات تبدیل ہونا شروع ہو جائیں گے، ان شاء اللہ۔

ہم نے دل سے آپ کے لیے دعا کی ہے۔ قارئین بہنوں سے بھی درخواست ہے کہ وہ گوشی کے لیے دعا کریں۔

رقص شرر کی مزید ایک یا دو اقساط ہوں گی، یہ چھ، سات ماہ نہیں چلے گا۔

صبا راجپوت......گاؤں سندھو جا سندھ

ہمارا گاؤں تحصیل مورو ضلع نوشہرو فیروز کے درمیان ہے۔ جس کا نام سندھو جا، یا سدوجہ دونوں طرح لکھتے ہیں۔ دو لفظوں کا مجموعہ ''سادھو'' جو ہندو مذہب میں ہوتے ہیں اور ''جا'' سندھی میں جگہ کو بولتے ہیں تو ہمارے گاؤں کے بزرگوں کا بتانا ہے کہ آزادی سے قبل یہاں ہندو رہتے تھے۔ اس لیے اس کا نام کسی سادھو کے نام پر ہے جس کا مطلب ہے ''سادھو کی جگہ''۔

سب کو یہ ہی ہسٹری پتا ہے اور گاؤں میں بہت سے حویلیوں جیسے گھر بھی تھے، جیسے ''آنگن'' ناول میں پرانی طرز کی حویلی میں نے دیکھی تھی۔ وہ تو پھر آہستہ آہستہ توڑ دی گئی، اب بس ایک بچی ہے جو آدھی گرادی گئی ہے۔ تو جیسا نام ہے ویسا کچھ نظر نہیں آئے گا۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی کیلے، امردو، گریپ فروٹ، فالسے، لیموں، گنا اور موسم کی ہر چیز ملے گی۔ بس کہیں سادھو نہیں ملے گا۔

تو اگست میں ایسے بارشیں ہوئیں کہ بیمار کر کے ہی ختم ہوئیں۔ وہ ایسے کہ ہم باہر سوتے ہیں تو اوپر پلاسٹک لگایا، مجھے اس جگہ سلا دیا جہاں ساری بارش مجھ پر، سارا بستر گیلا، دوسرے کپڑے بھی نہیں ملے۔ پھر بیمار، گاؤں کا ڈاکٹر ایسا ہے جو مریض پر تجربے کرتا ہے۔ چار ڈسپرین ایک ساتھ کھلا دیں، دوا اور ٹیبلٹ بھی دیں، الٹیاں جو نہیں تھیں وہ بھی ہر دس پندرہ منٹ بعد ہونے لگیں۔

پھر دوسرے ڈاکٹر نے دوا دی تب جا کر طبیعت بہتر ہوئی۔ الحمدللہ طبیعت ٹھیک ہوتے ہی ڈائجسٹ کا پتا کیا۔ دو دن بعد بھائی مسکراتے ہوئے آئے (خوشی دیکھنے لائق تھی) کہا ''بک اسٹال والے نے رسالے لانے بند کر دیے ہیں'' میں نے کہا ''کہیں اور پتا کریں، کسی دوسری دکان پر ہوں گے۔'' پھر دماغ چلایا۔ آپ کا نمبر نکالا، بھائی کو بتایا۔

''ایسے کیسے آئیں گے؟'' (وہ شاک میں تھے)۔

میں نے کہا ''ڈائجسٹ بھجوا دیں اور پیسے۔''

تو میری بہن بولی۔ ''پاگل پہلے ڈائجسٹ آنے دو پھر پیسے دینے ہوں گے۔''

چار دن انتظار کے بعد بھی نہیں ملے تو پتا کیا تو بہن پر بہت غصہ آیا۔ پھر پیسے بھیجے، مزید تین دن انتظار کے بعد آخر کار مل گئے، شکریہ۔

اور ہاں میرے بھائی کا نام سجاد علی ہے۔ آپ پوسٹ پر ساجد علی لکھتے ہیں۔ پوسٹ والے بھائی کو فون کرتے ہیں، پوسٹ کے لیے پچھلی بار بھائی نے کہا۔ ''میں ہی لے آؤں گا۔ روز روز تمہاری پوسٹ آتی ہے۔''

اب آتے ہیں تبصرے کی طرف تو......ٹائٹل ٹھیک تھا۔ ''کرن کرن روشنی'' ہمیشہ ہی معلوماتی ہوتا ہے۔ گڈ۔

اب آتے ہیں اس کی طرف جس نے اینڈ تک کنفیوژ رکھا۔ میں نے پہلی بار راحت آنٹی کو پڑھا، بہت اچھا لکھتی ہیں۔ ایک سوال ہے جب اینڈ میں سب اچھا ہونا ہوتا ہے تو اتنا سب کیوں ہوتا ہے؟ غلطی کہاں ہوتی ہے، ہم سے؟''

لاسٹ لائن نے سچ کیا کہ برا عمل وہ ہے جسے پانے کے خاطر بے صبری میں ہم بہت سی محبتوں کو روندتے جاتے ہیں۔ گریٹ۔

''رنگ ریز میرے'' اس بار بھی نہیں ہے، اتنی غیر حاضری۔ کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں، بند ہی کر دیجیے۔ گل مردان کی ''کھوپرے کا حلوہ'' کی ریسپی ٹرائی کی تھی، سب کو بہت پسند آیا۔ فائزہ بھٹی منگنی کی مبارک ہو، ہمیشہ خوش رہیں۔

☆ پیاری صبا! بہت خوشی ہوئی آپ کا خط پڑھ کر۔ آپ کو پرچے مل گئے۔ اب ہر ماہ باقاعدگی سے ہمیں خط لکھیے گا۔

تبصرہ آپ کا بہت اچھا ہے، یہ بہت اچھی بات ہے کہ آپ کہانیاں صرف وقت گزاری کے لیے نہیں پڑھتیں

بلکہ ان سے سبق بھی لیتی ہیں۔

آپ کا سوال بہت دلچسپ ہے کہ جب اینڈ میں سب اچھا ہونا ہوتا ہے تو اتنا سب کیوں ہوتا ہے۔ہم سے غلطی کہاں ہوتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم سے کہیں غلطی ہو، یہ ضروری نہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے، وہ آدم کی پیدائش سے بھی پہلے ہمارے مقدروں میں لکھ دیا ہے۔

"جب سب اچھا ہونا ہوتا ہے تو اتنا سب کیوں ہوتا ہے؟" تو اس کا جواب یہ ہے زندگی ایسی ہی ہوتی ہے۔آپ کسی کی بھی زندگی اٹھا کر دیکھ لیں، زندگی ان ہی خامیوں، کجیوں اور خوشیوں اور غموں سے مل کر بنتی ہے۔

مہوش اور عقیلہ......ساہیوال

یہ خواتین ڈائجسٹ میں ہمارا پہلا اور آخری خط ہے۔ہم یہ خط بہت مشکلوں سے پوسٹ کروا رہے ہیں۔شاید آئندہ نہ لکھ سکیں۔خواتین ڈائجسٹ شروع سے ہی ایک معیاری پرچا رہا ہے، اس لیے کسی بھی ایک سلسلے کی تعریف کرنا زیادتی ہی ہوگی۔میری کزن کی طرف سے فرمائش ہے کہ عثمان خالد بٹ اداکار (عہد وفا) والے۔ان کا انٹرویو شائع کردیجیے گا۔میری کزن سمیرا حمید کو بہت شوق سے پڑھتی ہے۔نبیلہ عزیز اور ام مریم سے کوئی ناول تو لکھوائیں۔پلیز ان کے پڑھے ہوئے ناولز بہت یاد آتے ہیں۔

☆ مہوش اور عقیلہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔اور یہ کیا بات ہوئی کہ یہ آخری خط ہے، کیوں بھلا؟ آپ ہمیں ہر ماہ خط لکھیں اور اپنی رائے کا اظہار کریں۔ہمیں خوشی ہوگی۔

آپ کی کزن کی فرمائش نوٹ کرلی ہے۔پوری کوشش کریں گے کہ جلد پورا کرسکیں۔نبیلہ عزیز پتا نہیں کیوں لکھنا بھول گئی ہیں۔ہم آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔نبیلہ بہت آرام کرلیا، قارئین آپ کو یاد کررہے ہیں۔جلدی سے کوئی ناول یا ناولٹ لکھیں۔

صدف ناز انصاری، مقدس ناز انصاری......ملتان

خواتین ڈائجسٹ ہمیں باقی تمام رسالوں میں ایسے پسند ہے جیسے کھانے میں بریانی یا پھلوں میں آم!یہ ہماری تفریح، مخلص دوست، تنہائی کا ساتھی اور بہترین رہنما ہے۔چند مشوروں اور سوالات کے ہمراہ حاضر ہوئے ہیں، امید ہے خیر مقدم کیا جائے گا۔

سب سے پہلے یہ کہ جتنا لطف خواتین وشعاع کے خطوط وجوابات پڑھ کر آتا ہے، کسی اور ڈائجسٹ میں اتنا مزہ نہیں ملتا۔لہٰذا جن بہنوں کے خطوط دیر سے موصول ہوں یا صفحات کی کمی کے سبب شامل نہ ہو پائیں تو ان کے صرف نام اور مقام ہی خطوں کے آخر میں شائع کردیے جائیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ناقابل اشاعت کہانیوں کے صرف عنوان شائع کردیئے جائیں لکھاری کے نام کے بغیر۔قسط وار ناولوں کی دو اقساط لازمی اکٹھی کرلیا کریں تاکہ رائٹر محترمہ کسی مہینے نہ لکھ پائیں تو آپ کے پاس ایڈوانس قسط موجود ہو۔تینوں رسالوں میں ایک کہانی کم کرکے پرانے مستقل سلسلوں کو بحال کریں یا موجودہ کے صفحات میں اضافہ کیا جائے۔خواتین ڈائجسٹ کے اولین شمارے کے سرورق پر کس شخصیت کو شامل کیا گیا تھا کیونکہ ہمیں ایک مرتبہ ستر کی دہائی کا رسالہ دیکھنا نصیب ہوا تو اس کے ٹائٹل پر تو ہاتھ سے بنائی گئی تصویر شائع کی گئی تھی۔آپ سے ایڈوانس فرمائش کر رہے ہیں خواتین ڈائجسٹ کے 50 سال مکمل ہونے پر پہلے کی طرح 324 صفحات کا خصوصی گولڈن جوبلی نمبر نکالنا ہے۔بھلے اس ایک شمارے کی قیمت معمول سے بڑھا لیجیے گا، امید ہے بہنیں ایک ماہ کا اضافی بوجھ برداشت کرلیں گی۔کسی سالگرہ نمبر یا سال نو نمبر میں پورے اسٹاف کا تصاویر سمیت تعارف اور پرچے کی تیاری کے مراحل کا احوال سنائیں۔آپ اپنے بارے میں بھی کچھ بتادیں چاہے چند سطریں لکھ دیں۔

آپی! ایک آخری سوال کہ پہلے آپ وقتاً فوقتاً ناولٹ، ناول نمبر وغیرہ جیسے خاص نمبر شائع کرتے تھے، اب کیوں نہیں اور سالگرہ نمبر 2 بھی نہیں چھپتا؟ ضرور بتانا اور خواتین کی پرانی ماڈلز بنیتا ڈیوڈ، لائبہ مغل، ثناء ریاض وغیرہ کو ایک دفعہ دوبارہ سرورق پر جگہ دیں۔ہمیں تمام ڈائجسٹ اور میگزین وغیرہ ہمارے بھائی شاہ بہرام

انصاری لا کر دیتے ہیں اور وہ بچوں کے لیے مختلف اخبارات و رسائل میں لکھتے بھی ہیں۔

ج: صدف اور مقدس! خواتین ڈائجسٹ کے لیے آپ کی تجاویز کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ آپ کی اس محبت کے لیے ممنون ہیں کہ آپ خواتین ڈائجسٹ کو اپنا پرچا سمجھتی ہیں اور ہمیں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ آپ کے بھائی شاہ بہرام انصاری کا بھی شکریہ جو آپ کو رسالے لا کر دیتے ہیں۔

کہانیوں کے بارے میں اگر ہم نے ناقابل اشاعت کی فہرست شائع کی تو اگلے ماہ ہمیں آنسوؤں میں ڈوبے اتنے دردناک خط موصول ہوں گے کہ جو ہمارے صبر کا امتحان ہوں گے۔

ایڈوانس قسطیں لکھوانے کا مشورہ بہت صائب ہے اور ہم اس پر عمل بھی کر چکے ہیں۔ لیکن ناول شروع ہونے کے بعد جب تک ایڈوانس قسطیں ختم نہیں ہوگئیں۔ مصنفہ نے ہمیں اگلی قسط نہیں دی۔ پھر وہی سلسلہ، کبھی تاخیر وجہ بنی کبھی حالات اور روزمرہ زندگی کے مسائل جن کا عام طور پر ہم سب کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کے پہلے شمارے پر آرٹسٹ کی بنائی ہوئی تصویر تھی۔

خاص نمبر کے زیادہ صفحات دینے اور پرچے کی قیمت بڑھانے والی تجویز کا تعلق قارئین سے ہے موجودہ حالات اور مہنگائی میں بہت سی قارئین کے لیے قیمت میں اضافہ برداشت کرنا مشکل ہوگا۔ ہاں اگر قارئین نے آپ کی تجویز کی تائید کی تو ہم ضرور غور کریں گے۔

اسٹاف کے تعارف اور ٹائٹل کے متعلق آپ کی تجاویز نوٹ کر لی ہیں، کوشش کریں گے جلد پوری کر سکیں۔

بشریٰ یامین ملک...... دریا خان ضلع بھکر

مجھے قلم اٹھانے پر میری سسٹر عاصمہ کے آنسوؤں نے مجبور کیا ہے وہ اس لیے کیونکہ اس کا لیٹر شائع تو ہوا لیکن بہت شارٹ...... وہ اتنی روئی ہے کہ میں پریشان ہو گئی۔ جیسے ہی اس نے سنا کہ اس کا لیٹر شائع ہوا ہے تو اس کی چیخ نکل گئی پھر ہاتھوں سے ٹرے پھسلی اور چائے سے بھرے میرے اور عاصمہ کے ٹی مگ زمین بوس ہو گئے بقول امی جان "یہ جو مگ ٹوٹے ہیں ناں تو میں نئے لا کر نہیں دوں گی اب چائے گلاس میں پینا یا پھر ساس پین کو منہ لگا کر ہاہاہا (ٹی مگ ہم کثرت سے توڑتے ہیں اس لیے) خط لکھنے کو تو وہ بے چین ہے۔ ہاہاہا میں اس کے چہرے سے پہچان جاتی ہوں۔

"نامے میرے نام" میں کوثر خالد کی آمد بالکل سردیوں میں آئس کریم کی سی لگی۔ گوشی جمال کا تفصیلی املی کی چٹنی کی طرح کا مزے دار خط پڑھا۔ بہت اچھا تھا بقول عاصمہ، گوشی کا محبت نامہ نہیں بھابھی نامہ تھا جو پورا شائع کیا اور میرا......؟ ڈونٹ مائنڈ ابھی اس کے زخم ہیں ہرے ہرے۔

پھر میری نانی امی نے انڈیا کے گاؤں گوندد سے ہجرت کی تھی ان کے حافظے کا اندازہ آپ نے بالکل ٹھیک لگایا، ایک بار میں نے کہا "نانی اگر آپ کے سامنے گوندد گاؤں کی کوئی خاتون جو آپ کی پڑوسن رہی ہو لائی جائے تو کیا آپ اسے پہچان لیں گی۔" وہ فوراً بولیں "بالکل، کیسے نہیں پہچانوں گی" کیا میں اپنی نانی کی ڈائری میں لکھے بیوٹی بکس یا خوب صورت بننے کے لیے ٹپس بھیج سکتی ہوں یا نہیں؟ چلتے چلتے یاد آیا اس سال فروری کے خواتین میں موجود ناول "چلی پیا کی حویلی" تمام قارئین کو بہت پسند آیا مجھ سمیت۔ اس ناول میں ایک جگہ تھوڑی سی گڑبڑ ہو گئی تھی سحرش خان بھٹو سے، وہ یہ کہ جب ماسی سردار بانو سدحان کو کہتی ہے کہ جنت بی کو نجانے کیا ہو گیا ہے ان کی سانس اکھڑ رہی ہے یہ سچویشن گھبرا جانے والی ہے یقیناً اور سدحان اس کے باوجود بھی کافی کا مگ ساتھ لیے جاتا ہے اور پھر نوڈی اور ڈوگی کے برتن میں ڈال دیتا ہے اب یہ بتائیے کہ جو سچویشن پیج نمبر ون نائنٹی پہ دکھائی گئی ہے سدحان کو کافی کا ہوش رہنا تھا یا نہیں۔

ج: پیاری بشریٰ! سب سے پہلے تو عاصمہ تک ہماری معذرت پہنچا دیں۔ اس کے آنسو ہم نے اپنے دل پہ محسوس کیے ہیں۔ خط ایڈیٹ کرنا ہماری مجبوری ہے۔ آپ کو کیا پتا گوشی جمال نے کتنا طویل خط لکھا تھا اور جو خط شائع ہوا ہے۔ اسے کتنا ایڈیٹ کیا گیا ہے۔

آپ گگ کثرت سے توڑتی ہیں تو پریشان نہ ہوں۔ ان کی عمر ہی کم ہوتی ہے۔ آپ کا بھلا کیا قصور، ویسے بھی ٹوٹنے والی چیزیں ٹوٹتی رہتی ہیں ان کا کیا غم کرنا احتیاط دلوں کے معاملے میں کرنا چاہیے۔ فروری کے ناول کی بات دسمبر میں کیا بتائیں۔ ہمیں دوبارہ پڑھنا پڑے گا۔ آپ کا خط بہت تاخیر سے ملا ہے۔ اپنے کزن صاحب سے کہیں کہ لیٹر جلدی پوسٹ کردیا کریں۔

صائمہ گل......مردان

خلاف معمول اس دفعہ رسالہ بروقت مل گیا۔ شکریہ نوازش پچھلے ماہ سے جو شادیوں کا سیزن اسٹارٹ ہوا ہے تا حال جاری ہے پوری گن کر ماشاءاللہ سے گیارہ شادیاں بخیروخوبی انجام پذیر ہوئیں۔

آج بھی بے بے اور احمد صاحب ایک شادی اٹینڈ کر کے آئے ہیں۔ کل سے مسلسل بارش ہو رہی ہے۔ بچوں کے ساتھ شادی میں جانا میرے لیے مشکل تھا سو یہ فریضہ بے بے نے بخوشی ادا کیا۔ ''شکریہ بے بے''۔

ویسے اس شادیوں کے ''ہجوم'' نے بجٹ کو اچھا خاصا ہلا کر رکھ دیا ہے۔ موسم کی مناسبت سے بچوں کے کپڑے، جوتے، اپنے لیے شاپنگ الگ اور تو اور تحائف کی فکر الگ۔ لیکن خیر جی۔ یہ سب تو چلتا ہے۔

اب آتے ہیں شمارے کی طرف......

کبھی سنی اور کرن کرن روشنی ہمیشہ کی طرح زبردست ''تتلی جیسا پیار'' اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس دفعہ راحت جی کی تحریر نے رنگ نہیں جمایا۔ آپ کا شاہکار ناول ''زرد موسم'' بھولنے والا نہیں۔ ''رقص شرر'' نام جتنا چونکا دینے والا تھا تحریر بالکل بھی متاثر نہ کرسکی ہوسکتا ہے اگلی قسط دلچسپ ہو۔ فرح بھٹو ''میرے خواب'' لے کر آئیں۔ انشراح کو والدین کے پاس جانا چاہیے تھا جبکہ وہ بالکل بے قصور تھی۔ بریرہ کی اصلیت دکھانی چاہیے تھی۔

''حالم'' یار نمرہ! اب بور ہو رہے ہیں۔ پھر سے وہی پارلیمان، وہی سیاست۔ واللہ، ہمیں سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بس جلدی جلدی کہانی کو سمیٹو جنت کے پتے اور قراقرم کا تاج محل جیسا کوئی زبردست ناول لے کر آؤ۔ ناولٹ دونوں ہی زبردست تھے۔ نعیمہ جی ایسے ہی ہلکے پھلکے اور ہنستے مسکراتے ناول لے کر آیا کریں۔ ''خلش'' ایک حساس موضوع پر زبردست تحریر تھی۔ قاری کو ساتھ لے کر چلی۔ افسانوں میں شازیہ جمال ٹاپ پر رہیں۔ ''ستاروں والا جوڑا'' ایک بہترین میسج دیا۔

سرورق میں باورچی خانہ پر پھر سے ہمارا نام تھا۔ ویسے میرے فیملی ممبرز اور جو جو میرے خط اور دیگر سلسلے پڑھتے ہیں جاننے والے سب کو میرے ادھورے نام پر اعتراض ہے۔ اس لیے سب کی فرمائش پر اپنا پورا نام لکھا کروں گی۔

ہمارے نام میں ''چتوکی'' سے ابھی کافی بہنیں شرکت کرتی ہیں۔ سب کو موسٹ ویلکم۔ اور ''صدف نام'' آپ نے اپنی گل کہہ کر ہمارا دل جیت لیا۔ خوش رہے آباد رہیں۔ پھلے پھولیں۔ آپ کے الفاظ میرے لیے انمول ہیں۔ شکریہ بہت بہت۔ خاتون کی ڈائری تو ہوتی ہی زبردست ہے۔ لیکن سمیرا استار کی پسند لاجواب تھی۔

ج: پیاری گل! شادی ایک لڑکے اور لڑکی کی زندگی کا سب سے اہم اور یادگار موقع ہوتا ہے۔ عام آدمی کو تو زندگی میں عموماً ایک بار ہی اپنی شادی کے موقع پر مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ دوسری طرف دور کے رشتہ دار جن کے گھروں میں ہم خاص طور پر نہیں جا پاتے۔ شادیوں میں ان سے بھی ملاقات ہوجاتی ہے۔ سب ایک دوسرے سے مل لیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس سے بجٹ بہت متاثر ہوتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنوں سے مل کر جو خوشی ہوتی ہے۔ وہ انمول ہوتی ہے۔

تبصرہ آپ کا بہت جامع اور اچھا ہے۔ ہر ماہ باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔



خبریں وبریں

واصفہ سہیل



چوکنا

دنیا بھر میں لوگ پورے ٹیکس دیتے ہیں، کیوں کہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ اسٹیٹ ان کے ٹیکس کو ان کے ہی کام لائے گی۔ ہمارے یہاں صورت حال بالکل مختلف ہے۔

جب سے میڈیا پر یہ خبر آئی ہے کہ ایف بی آر نے اداکار فواد خان کے گرد گھیرا تنگ کر دیا ہے، تب سے فنکار چوکنا ہو گئے ہیں۔

ایف بی آر نے فواد خان کی بیرون ملک ہونے والی آمدنی پر ٹیکس معاملات کی چھان بین شروع کر دی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایف آئی اے کو فواد خان کے غیر ملکی دوروں کی تفصیلات کے لیے خط لکھا ہے۔

ایف بی آر کی اس کارروائی کے بعد بہت سے فنکار اور فنکارائیں بھی الرٹ ہو گئی ہیں کیوں کہ مزید فنکار بھی ایف بی آر کی لسٹ میں شامل ہیں۔

پسند

سینئر اداکارہ زارا شیخ نے اپنے پروڈکشن ہاؤس کا باقاعدہ آغاز کر دیا ہے۔ ان کی پروڈکشن میں وڈیوز اور شارٹ فلمیں بنائی جا رہی ہیں۔

زارا شیخ کا کہنا ہے کہ ”شوبز میں میں نے اب تک جتنا کام کیا ہے، سب کے سامنے ہے۔ شوبز میں لوگوں نے میری معصومیت (آہم) اور شرافت کا کافی فائدہ اٹھایا ہے (اور آپ نے؟)۔ اب ایسا بالکل نہیں ہوگا (کیسا؟)

ٹی وی ڈرامہ کے متعلق زارا شیخ کا خیال ہے کہ ٹی وی ڈرامہ کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ میں نے شوبز کو کبھی بھی چھوڑا نہیں ہے (وہ خود ہی چھوڑ دیتا ہے)۔ میں ایسا کردار کرنا چاہتی ہوں جو بہت پرجوش ہو اور مجھے اپنی بہترین صلاحیت دکھانے کا موقع ملے، مجھے بہت آفرز آتی رہیں ڈراموں کی لیکن میں، ان سے مطمئن نہیں تھی۔ اگر کوئی اسکرپٹ اچھا لگا تو ضرور کروں گی (اور اگر اسکرپٹ کو آپ اچھی نہ لگیں تو؟)۔ ویسے زارا شیخ ہاشم ندیم کے لکھے ڈرامہ ”رقص بسمل“ میں کام کر رہی ہیں۔



وخواہشات کہانی کا مرکز ہیں۔

پاکستانی ڈراموں میں ان ہی کہانیوں کو دکھایا جاتا ہے جو معاشرے میں موجود ہوتی ہیں اور اسے برداشت کرنا ہمارے لیے مشکل ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود معاشرے میں ہونے والی خرابی کو دکھایا بھی نہیں جاسکتا۔ منال خان کا کہنا ہے کہ تنقید کرنے والوں نے ڈرامے کو مکمل دیکھے بغیر تنقید کی، اکثر آنٹیاں تو ڈرامے میں منفی کردار کی وجہ سے مجھے دیکھتے ہی لڑنا شروع کردیتی ہیں۔ لیکن پھر بھی خواتین کہتی ہیں کہ مجھے ایسے کردار نہیں کرنا چاہئیں۔"

کچھ ادھر اُدھر سے

☆ معروف اداکارہ بشریٰ انصاری کی بیٹی میرا انصاری نے شادی کرلی۔ ان کی شادی نیویارک میں انجام پائی، جس میں ان کے قریبی دوستوں اور خاندان والوں نے شرکت کی۔ میرا انصاری کی یہ دوسری شادی ہے (اور شوہر کی؟)۔ پہلے شوہر سے ان کے دو بچے، ایک بیٹا اور بیٹی ہیں۔

(روزن دیوار سے......عطاالحق قاسمی)



چہرے

اریبنا خان آج کل ڈرامہ سیریل "محبتیں چاہتیں" میں دکھائی دے رہی ہیں۔ جس کی کاسٹ میں حرا مانی، جنید خان، سیف حسن اور ٹیپو شریف بھی شامل ہیں۔ ڈرامہ میں اریبنا خان منفی کردار میں نظر آرہی ہیں۔ اچھائی اور برائی کے متعلق اریبنا خان کا خیال ہے کہ "اچھائی انسان کے چہرے سے ظاہر ہوتی ہے (پر کچھ معصوم چہرے بڑے بڑے کام کرجاتے ہیں)۔ جس انسان کی نیت اور سوچ اچھی ہوتی ہے تو اچھائی اس کے چہرے سے عیاں ہوجاتی ہے اور وہ ہمیشہ دوسروں کی نظر میں معتبر او قابل احترام رہتا ہے۔

جھگڑا

منال خان ان دنوں ٹی وی ڈرامہ دیکھنے والی خواتین کے لیے گفتگو کا اہم موضوع بن چکی ہیں۔ اس کی وجہ منال خان کا ڈرامے میں مفاد پرست کا کردار ہے جو اپنے ہی بہنوئی سے متاثر ہوکر بہن کا گھر برباد کردیتی ہے۔ منال خان کا کہنا ہے کہ ڈرامہ میں کہانی سالی بہنوئی کے عشق کے گرد نہیں گھومتی بلکہ آج کی لڑکی کی ضروریات



آپ کا باورچی خانہ

فرحانہ مہناز......اسلام آباد

مصنوعی کھاد ملی سبزیاں، اناج اور چاول ذائقہ دار کم ہی ہوتے ہیں۔ چاہے بنانے والے سب ہی لوازمات ڈال دیں۔ اس لیے میں خیال رکھتی ہوں کہ موسمی سبزیاں پکاؤں، بغیر موسمی کھانے ذائقہ میں کم ہی لذیذ ہوتے ہیں۔

س: کھانا پکاتے وقت کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

ج: روزمرہ کھانا بناتے وقت بچوں کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ بچوں کے بابا تو ایک ماہ بعد مہمانوں کی طرح آتے ہیں۔ ان دنوں میں پھر میاں صاحب کی پسند کے کھانے بنتے ہیں۔ جن میں غذائیت کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اسپائسی کھانے ان کو پسند نہیں۔ زیادہ تر سبزیاں پسند کرتے ہیں۔

س: کچن کی صفائی کے لیے خصوصی اہتمام؟

ج: میرے خیال میں کچن کی صفائی خصوصی توجہ مانگتی ہے، جہاں دن کا زیادہ حصہ گزرتا ہے۔ میری دیورانی کا اور میرا کچن جوائنٹ ہے۔ اس لیے کھانا بناتے وقت اشیاء ڈالنے کے ساتھ ہی واپس ان کی جگہ پر رکھتی ہوں ساتھ ہی برتن دھو کر رکھتی ہوں۔ گیلا کپڑا مار کر شیلف صاف کیا اور کھانا بناتے وقت چولہے پر کپڑا مارتے جانا (یہ عادت میں نے اپنی دیورانی سے لی ہے) اسٹین لیس کا چولہا ساتھ ہی چمک جاتا ہے۔

ابھی پچھلے دنوں میری بہن ہمارے گھر آئی، کچن میں جاتے ہی کہا واؤ۔ اتنے صاف چولہے لگتا ہی نہیں کام ہوا ہے۔

س: اچانک مہمان آجائیں تو......؟

ج: آج سے پندرہ سولہ سال، میری شادی سے بھی پہلے اچانک مہمان آتے تھے۔

جب موبائل ان نہیں تھا۔ اب تو یہ حال ہے کہ مہمان شہر میں انٹر ہوئے نہیں اور پتا چل جاتا ہے کہ کس بھائی کے گھر پہلے آئے ہیں اور ہمارے گھر آمد کب تک متوقع ہے۔

پھر بھی دوپہر کو آئیں تو قورمہ اور بریانی بناتی ہوں اور رات میں آئیں تو قورمے کے ساتھ کسٹرڈ بنتا ہے۔

(قورمہ کی ترکیب جو میں بناتی ہوں)

پیاز براؤن کی اور اخبار پر بچھادی، بچے ہوئے گھی میں مرغی ڈالی۔ تھوڑا سا بھونا اور لہسن ادرک ڈال کر مزید بھون لیں۔ ساتھ ہی دہی میں سب مسالا جات ڈالے اور کڑاہی میں ڈال دیں۔ اب گھی اوپر آنے تک بھونیں۔ اب ڈراک براؤن پسی ہوئی پیاز اور دھنیا ڈال کر دم دیں۔ آدھے گھنٹے میں قورمہ تیار۔

اب مہمان خصوصی اتنا یار جن تو دیں گے نا۔

س: ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟

ج: بچے اسکول جاتے ہیں تو ناشتا بھی جلدی سے تیار کرنا ہوتا ہے۔ چائے چولہے پر رکھی۔ ایک باؤل میں دو انڈے، تھوڑی چینی (لیکن اگر بریڈ اپنے شہر کی بیکری کی ہے تو چینی نہیں ڈالنی۔ میرے خیال

میں گوجرہ شہر والیوں کو پتا چل گیا ہوگا) اور دودھ ڈال کر بلینڈ کیا۔

اب توے پر آئل ڈالا اور بریڈ کے دونوں طرف یہ آمیزہ لگایا، توے پر سینک لیا۔ یہ ہے زیادہ کیلوریز والا ناشتا۔ ترکیب کے ساتھ جس سے مجھے تو کم از کم ایک بجے تک بھوک نہیں لگتی کیونکہ میں اپنی بریڈ پر دیسی گھی لگاتی ہوں لیکن بچوں کو آئل میں بنا کر دیتی ہوں اور گرمیوں میں ملک شیک کا ناشتا کرتے ہیں۔

س: مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟

ج: پہلے جب میاں صاحب اسلام آباد سے آتے تو ایک ماہ بعد کھانا کھانے جاتے۔ لیکن اب کافی عرصہ ہوا، نہیں گئے کیونکہ اب ہر چیز گھر پر تیار کرنے میں ہی بہتری ہے۔ بازار کے کھانے من کو نہیں بھاتے۔

س: خصوصی ٹپ۔

ٹپ اور نصیحت وہی دینی چاہیے جس پر خود عمل کریں۔

کھانا بنانے والا برتن اگر گرم گرم ہی دھولیں تو سنک نہیں خراب ہوتا ہے اور برتن بھی جلدی چمک جاتا ہے۔

اگر سالن تھوڑا سا لگ جائے تو اس میں دو چائے کے چمچے دودھ ڈال دیں۔

کھانا جتنا بھونیں گی اتنا ہی مزے دار بنے گا اور پلیز کھانا بناتے وقت سر پر دوپٹا لیں (اب تو فوڈ کیٹر والوں نے بھی بازار میں کھانا بنانے والوں کو ٹوپیاں پہنادی ہیں، ہاہاہا)۔

اور آخر میں اپنی سویٹ بہنوں سے یہ کہنا چاہوں گی کہ آپ نے دیکھا ہوگا جو کھانا مہمانوں کے لیے بنتا ہے، وہ زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔

کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی۔ زیادہ برکت اور رحمت شامل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کے نعمت خانے کو اپنی خاص برکت سے نوازے۔

☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

مچھلی جلترنگ

اجزاء:۔

سرمئی یا رہو مچھلی	آدھا کلو
پیاز	دو عدد
کڑی پتہ	چند پتے
ثابت لال مرچ	چار عدد
پسا دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچ	چار عدد
پسی لال مرچ	آدھا کھانے کا چمچہ
کٹی کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پسا لہسن ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	آدھی پیالی
ٹماٹر	چار عدد
املی کا رس	آدھی پیالی
لیموں	دو عدد
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
رائی ثابت	ایک چائے کا چمچہ
میتھی دانہ	چھ دانے
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب:۔

سب سے پہلے مچھلی کو بغیر دھوئے ایک کھانے کا چمچہ سفید سرکہ لگا کر رکھ دیں۔ پندرہ منٹ بعد ٹھنڈے پانی سے اچھی طرح دھو کر چھلنی میں رکھ دیں۔ ایک دیگچی میں تیل ڈال کر رائی ڈال دیں۔ جب خوشبو آنے لگے تو پیاز میں ثابت لال مرچ، میتھی دانہ ڈال کر ہلکا سنہری کریں۔ جب سنہری ہو جائے تو پسی ہوئی مرچ، زیرہ، ادرک لہسن، ہلدی، دھنیا، نمک ڈال کر ہلکا ہلکا بھون لیں۔ پھر ٹماٹر، ہری مرچ ڈال دیں۔ اب ایک برتن میں تھوڑا سا تیل گرم کریں۔ مچھلی کے ٹکڑے سنہرے تل کر مسالے میں پھیلا کر ڈال دیں۔ پھر املی کا رس، لیموں، کٹی کالی مرچ ڈال کر ہلکی آنچ پر دم لگا دیں۔ تیل اوپر آ جائے تو مچھلی جلترنگ تیار ہے۔ گرم گرم سادے چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

سوجی کی قتلیاں

اجزاء:۔

سوجی	آدھا کلو
پسا کھوپرا	ایک پیالی
بڑی الائچی	تین عدد
چینی	آدھا کلو
پانی	ایک پیالی
گھی	آدھی پیالی

ترکیب:۔

گھی گرم کر کے سوجی کو ہلکی آنچ پر خوشبو آنے تک بھونیں۔ دوسرے چولہے پر چینی اور پانی کو اچھی طرح ملا کر دس سے بارہ منٹ تک پکائیں یا ایک تار کا شیرہ بنالیں۔ تھوڑی سی آنچ تیز کر کے سوجی کو بھونتے ہوئے اس میں کھوپرا، چینی کا شیرا، الائچی ڈال کر تھوڑی دیر مزید بھونیں پھر چکنی کی ہوئی ٹرے میں پھیلا کر ٹھنڈا کریں اور پھر ڈائمنڈ شیپ کی قتلیاں کاٹ لیں۔



عنبر سان

نفسیاتی ازدواجی گتھیاں

خوداعتمادی ایک ایسا جوہر ہے جو انسان میں ایسی صفات، خوبیاں پیدا کردیتا ہے کہ جن کاموں کو وہ مشکل یا ناممکن سمجھتا ہے، وہ اس کے لیے آسان ہوجاتے ہیں اور وہ انہیں بخوبی سرانجام دے سکتا ہے۔ دے سکنے کی پوزیشن میں ہوجاتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کو دوسروں سے منوالیتا ہے۔

خوداعتمادی ہم سب میں، ہر شخص میں موجود ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا اس کا انحصار آپ پر ہے۔ بس ذرا سی کوشش۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ بچہ جو ایک سال کی عمر کے لگ بھگ چلنے لگتا ہے، آٹھ دس مہینے میں کھڑا ہونا شروع ہوتا ہے۔ وہ کھڑا ہوتا ہے اور گرجاتا ہے۔ وہ پھر کھڑا ہوتا ہے۔ وہ پھر گرتا ہے۔ یہاں تک کہ بار بار گرتا ہے اور پھر وہ گرنے اور اٹھنے میں ایک لذت محسوس کرتا ہے۔ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس میں ایک قوت آگئی ہے جس کی بنا پر وہ کھڑا ہوسکتا ہے۔ ایسی ہی صورت حال اس وقت پیش آتی ہے، جب وہ چلنا شروع کرتا ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان میں خوداعتمادی کا فقدان ہے، وہ اصل میں ذہنی مریض ہوتے ہیں یا ذہنی مریض بنے رہنا چاہتے ہیں۔ اس کی ابتدا عموماً ابتدائی عمر سے ہوتی ہے۔ گھر یا اسکول کا ماحول بھی اس کے اسباب پیدا کرتے ہیں جن کی وجہ سے ان کی زندگی متوازن نہیں رہتی اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں خوداعتمادی کی کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ خوداعتمادی سے محروم لوگ اپنی زندگی کا جائزہ لینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے اور نہ اپنی صلاحیتوں کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں، لہٰذا ان کی صلاحیتیں ضائع ہوجاتی ہیں۔

یہ ضروری ہے کہ ہم خود کو جانیں، اپنی شخصیت کا جائزہ لیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنا تجزیہ خود کریں اور تجزیے کی روشنی میں خود کو پہچاننے کی کوشش کریں۔ ہر شخص کو قدرت نے بے شمار صلاحیتیں دی ہوتی ہیں، ان کو جاننے اور ان سے استفادہ کرنے کی ضرورت البتہ ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں دوسروں کے تجربات اور خیالات کا بھی جائزہ لینا چاہیے اور اس کی روشنی میں اپنی شخصیت کے مختلف پہلو ابھارنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن دوسروں کی تقلید کرتے ہوئے اپنی شخصیت کو مسخ نہیں کرلینا چاہیے۔ تقلید اچھی چیز ہے۔ لیکن اس صورت میں جب اس میں انسان کی اپنی عقل، سمجھ بوجھ بھی شامل ہوجائے۔

منفی خیالات سے بھی خوداعتمادی مجروح ہوتی ہے۔ جس طرح خوش فہمیوں میں رہنے والا شخص نقصان میں رہتا ہے۔ نقصان اٹھاتا ہے۔ اسی طرح انسان خود کو دوسروں سے کمتر سمجھنا شروع کردے، تو خود بخود کم تر ہوجاتا ہے۔ ہر وقت اپنی کمیوں، کمزوریوں کا ذکر نہ کریں۔ (کمزوریاں اور کمیاں کس میں نہیں ہوتیں؟) بلکہ اپنی خوبیوں کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ آپ کی خوبیاں، آپ کی کمزوریوں پر کس طرح قابو پاسکتی ہیں، کس طرح غالب آسکتی ہیں۔

☆☆☆

نادیہ......بھکر

س: میرا مسئلہ وہی ہے جو آج بیشتر گھرانوں کا مسئلہ ہے۔ میری عمر پینتیس سال ہے۔ معمولی شکل وصورت کی مالک ہوں۔ بی اے کیا ہے۔ ہم دو بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ ایک بھائی مجھ سے بڑے ہیں پھر دوسرے بھائی۔ بہن سب سے چھوٹی ہے۔ بہن کی شادی ہوچکی ہے اور مجھ سے چھوٹا بھائی جو کینیڈا گیا تھا۔ شادی کرکے وہاں سیٹل ہوچکا ہے۔ بڑے بھائی کی عمر سینتیس سال ہوچکی ہے۔ ان کے تمام دوست شادی شدہ ہیں اور اپنے بیوی بچوں میں مگن ہیں۔ بھائی کوئی

دوستوں نے شادی کرانے کی پیش کش کی لیکن امی نے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ شادی کے بعد بھائی بدل جائیں گے۔ اس لیے پہلے میری شادی ہوجائے پھر بھائی کی شادی کریں گی۔

امی نے میری شادی کے لیے بہت کوشش کی ہے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ کئی رشتہ والیوں کو بھی لگایا لیکن مجھے دیکھ کر لوگ انکار کر دیتے ہیں۔ سب کو حسن و خوب صورتی کی تلاش ہے۔

بھائی نے امی کے انکار پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔ لیکن وہ بہت خاموش رہنے لگے ہیں۔ آفس سے واپس آکر کمرے میں بند ہوجاتے ہیں۔ گھر کے سناٹے سے مجھے شدید وحشت ہوتی ہے۔ اپنا وجود بوجھ لگتا ہے۔ میں خود کو مجرم محسوس کرتی ہوں۔ آپ بتایئے کیا کروں؟ خودکشی حرام نہ ہوتی تو اب تک کرچکی ہوتی۔

ج: اچھی بہن! خودکشی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔ موت کے بعد بھی ایک زندگی ہے جہاں ہمیں ہر اچھے برے عمل کا جواب دینا ہے۔

آپ کی والدہ کی سوچ درست نہیں ہے۔ شادی ایک فطری تقاضا اور معاشرتی ضرورت ہے۔ زندگی کو آگے بڑھنا ہوتا ہے، اگر کسی وجہ سے آپ کی شادی نہیں ہو پا رہی تو اس میں اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی لیکن بھائی کی شادی نہ کرنا ان کے ساتھ زیادتی ہے۔ آپ بھائی کی شادی کریں۔ ان کی شادی کے بعد گھر میں رونق ہوگی۔ ان کے بچے ہوں گے، زندگی میں تبدیلی آئے گی۔ جب وقت آئے گا تو آپ کی شادی بھی ہوجائے گی ان شاء اللہ۔ آپ کی والدہ کی سوچ نے تو آپ کو دوہری اذیت میں مبتلا کر دیا ہے۔

آپ بی اے پاس ہیں۔ ممکن ہو تو کوئی جاب کرلیں۔ اس سے آپ مصروف بھی رہیں گی اور آمدنی کا ایک ذریعہ ہونے کے بعد بھائی کی محتاج بھی نہیں رہیں گی۔

شیریں......لاہور

بھائی! آپ مجھے خراب لڑکی نہ سمجھیے گا۔ جو بات میں بتانے جا رہی ہوں، مجھے پتا ہے اسے جان کر آپ مجھے غلط لڑکی سمجھیں گے لیکن میں مجبور ہوں۔ بار بار دل کو سمجھاتی ہوں لیکن دل نہیں مانتا۔

میں میٹرک کی طالبہ ہوں۔ میتھس اور انگلش میں کمزور ہوں۔ نویں کلاس میں، میں نے گھر والوں سے کہا کہ مجھے ٹیوشن کی ضرورت ہے۔ انہوں نے مجھے ایک کوچنگ سینٹر میں داخلہ دلا دیا۔ وہاں ایک لڑکا جو میتھس پڑھاتا تھا، مجھے بہت اچھا لگنے لگا۔ میں نے اس کو بتایا تو وہ ہنس کر چپ ہوگیا۔ پھر میرے اصرار پر کہ میں اس کو کیسی لگتی ہوں، اس نے مجھے سختی سے ڈانٹ دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ابھی میری عمر بہت چھوٹی ہے۔ مجھے ان باتوں سے دور رہنا چاہیے۔ مجھے بہت صدمہ ہوا۔ دو دن میں نے کھانا نہیں کھایا۔ پھر میں نے اس لڑکے سے کہا، میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔ اس بات سے وہ ڈر گیا۔ اس نے کہا، خدا کے لیے میری جان چھوڑ دو۔ میری چھوٹی بہنیں ہیں، میں اپنے گھر کے حالات کی وجہ سے دن میں کالج جاتا ہوں اور شام میں اس کوچنگ سنٹر میں پڑھاتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ اس نے وہ کوچنگ سینٹر بھی چھوڑ دیا۔ اب مجھے نہیں پتا کہ وہ کہاں ہے۔ میں نے کوچنگ سینٹر سے بہانا بنا کر اس کا فون نمبر لیا لیکن وہ میرا فون بھی نہیں اٹھاتا۔ آپ مجھے مشورہ دیں، میں کیا کروں۔ اسے بھولنے کے لیے نہیں کہیے گا۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔

ج: آپ نے لکھا ہے کہ آپ کو خراب لڑکی نہ سمجھوں۔ آپ خراب لڑکی نہ ہوں لیکن بے وقوف لڑکی ضرور ہیں۔ حماقت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ آپ نے تو اس حد کو بھی کراس کر لیا۔ شکر ہے کہ وہ لڑکا سمجھ دار تھا ورنہ آپ نے تو اس کی تباہی میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ آپ اپنی عمر دیکھیں۔ ابھی بچپن بھی پوری طرح رخصت نہیں ہوا اور آپ ان باتوں میں پڑ گئیں۔ ہوش کے ناخن لیں۔ یہ محبت نہیں صرف بے وقوفی ہے۔ اپنی پڑھائی پر توجہ دیں۔ تھوڑا وقت گزرے گا تو آپ کو خود یہ باتیں سوچ کر اپنی حماقت پر ہنسی آئے گی۔

☆

بیوٹی بکس

امت الصبور

سیما رضی......راولپنڈی

س: میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے پاؤں کی ایڑیاں پھٹی رہتی ہیں۔ حالانکہ میں پاؤں کی صفائی کا مکمل خیال رکھتی ہوں، اس کے باوجود ہر موسم میں ایڑیوں کی کیفیت ایک جیسی رہتی ہے۔

ج: ایڑی اور تلوؤں کی جلد بہت موٹی ہوتی ہے۔ اس لیے جسم میں قدرتی تیل ان کو چکنا نہیں رکھ پاتا۔ آپ ایک تسلے میں گرم پانی لیں، اس میں تھوڑا سا شیمپو اور آدھا چمچہ بادام یا زیتون کا تیل ملا لیں۔ پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھیں، جب جلد نرم پڑ جائے تو جھانوے سے رگڑ کر اچھی طرح صاف کر لیں۔ پاؤں دھو کر خشک کر لیں۔ پھر پیٹرولیم جیلی لگائیں اور جرابیں پہن لیں۔ صبح پھر جھانویں سے رگڑ کر صاف کریں۔ ہو سکے تو روزانہ...... ورنہ ہفتہ میں دو بار یہ عمل کریں۔

پھٹی ہوئی ایڑیوں کے لیے دس گرام پسی ہوئی ہلدی میں پندرہ گرام سرسوں کا تیل ملا کر گاڑھا پیسٹ بنا لیں۔ رات کو سوتے وقت پاؤں اچھی طرح دھو کر پھر اس لیپ کو لگا کر جرابیں پہن لیں۔ روزانہ اس عمل کو دہرائیں۔

شائستہ......ٹوبہ ٹیک سنگھ

س: میرے چہرے پر سیاہ دھبے ہیں جو سردیوں میں مزید گہرے ہو جاتے ہیں، پلیز آپ کوئی حل بتا دیں؟

ج: ان سیاہ دھبوں سے نجات کے لیے آپ اپنے کچن سے مدد لے سکتی ہیں۔ مندرجہ ذیل ٹوٹکے مفید ثابت ہوتے ہیں۔

(1) ٹماٹر، ہلدی اور دودھ کا پیسٹ بنائیں اور اس پیسٹ کو روزانہ پندرہ منٹ تک لگائیں۔

(2) ایلوویرا میں لیموں کے چند قطرے ملائیں اور ماسک کی طرح لگا لیں۔ کچھ دن میں فرق محسوس کریں گی۔

(3) آلو کے پیسٹ کو سیاہ داغ دار جگہ پر لگائیں اور ایک دو گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ یہ بھی بہت مفید عمل ہے۔

(4) سردیوں کا موسم ہے۔ خوب گاجریں کھائیں۔ اس سے بھی سیاہ دھبے اور حلقوں کو کم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

سلمیٰ......حجرہ شاہ مقیم

س: مجھے آپ سے صرف ایک ہی بات پوچھنی ہے۔ وہ یہ کہ سردیوں میں میرے ہاتھ پاؤں بہت کالے ہو جاتے ہیں۔ بہت کولڈ کریمیں لگائیں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گلاب کے عرق اور گلیسرین کے محلول سے مزید کالے ہو جاتے ہیں۔ آپ کوئی ایسا طریقہ بتائیں جس سے ہاتھ پاؤں سفید ہو جائیں۔

ج: آپ گاؤں میں رہتی ہیں۔ اس لیے پہلی احتیاط تو یہ کریں کہ جب لیموں اور گلیسرین کا محلول لگائیں تو دھوپ سے احتیاط رکھیں۔ بہتر یہ ہے کہ رات سونے سے پہلے یہ لگائیں۔

جو کا آٹا	دو چمچے
لیموں کا رس	دو چمچے
زیتون یا بادام کا تیل	دو چمچے

ان تمام چیزوں کو ملا کر پیسٹ بنا لیں۔ ہاتھ دھو کر پندرہ منٹ تک اس پیسٹ کو ہاتھوں پر لگائے رکھیں۔ پھر اچھی طرح رگڑ کر اتار دیں اور نیم گرم پانی سے دھو لیں۔ اس سے ہاتھ پیروں کی جلد میں خصوصی چمک اور نکھار آ جائے گا۔

☆